تحقیقی اور تخلیقی ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ-7-8

سہ ماہی

عالمی فلک

گوشۂ حسین الحق

مدیر
احمد نثار

معاون مدیر
آفرین فاطمہ

حسین الحق کی زندگی کے چند یادگار لمحات

تحقیقی اور تخلیقی ادب کا ترجمان

سہ ماہی ۔ کتابی سلسلہ ۔۷۔۸

جلد : ۲ شمارہ : ۷۔۸

اپریل تا ستمبر ۲۰۲۲ء

ISBN 9789391105082

مدیر : احمد نثار

معاون مدیر : آفرین فاطمہ

e-mail : aalamifalak@gmail.com
Contact No. : 8409242211

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ :

عالمی فلک، کڈس کیمپس، محمد علی روڈ، سیٹی کالونی، پوسٹ 'بی' پولی ٹیکنک، ضلع دھنباد، جھارکھنڈ-828130 (ہندوستان)
Aalami Falak, Kids Campus, Mohammad Ali Road, City Colony
Post : 'B' Polytechnic, Dhanbad, Jharkhand--828130 (India)

ازراہِ کرم چیک یا بینک ڈرافٹ پر صرف Aalami Falak ہی لکھیں۔
Uco Bank, Branch Code : 000997 (Bhuli Branch)
A/c. No. : 09970210001349
IFSC Code : UCBA0000997 (For Money Transfer within India)
MICR Code : 826028008
SWIFT Code : UCBAINBB (For International Banking)
GooglePay, PhonePe : 8409242211

رقم ٹرانسفر کرنے کے بعد درج ذیل وہاٹس ایپ نمبر پر اپنا مکمل پتہ اور موبائل نمبر ضرور ارسال کریں۔

وہاٹس ایپ نمبر : 8409242211

AALAMI FALAK

Urdu Book Series - **7-8**

April to September - 2022

ISBN 9789391105082

Editor : **Ahmad Nesar** (8409224211)

Sub-Editor : **Aafreen Fatma**

اشاعت : اپریل تا ستمبر ۲۰۲۲ء

		زرتعاون فی شمارہ	چار شمارے (رجسٹر ڈاک سے)
ہندوستان	:	300/- روپئے	1200/- روپئے
امریکہ	:	45ڈالر	180ڈالر
برطانیہ	:	15پونڈ	60پونڈ
سعودی عرب	:	60ریال	240ریال
عرب امارات	:	60درہم	240درہم

خصوصی معاونین/ادارہ جات سے دو ہزار روپئے (سالانہ)

کمپوزنگ : پرنٹ ہٹ، واسع پور، بھولی روڈ، دھنباد، جھارکھنڈ-826001

موبائل : 9852391575

طباعت : مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی۔۲۵

- عالمی فلک کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔
- عالمی فلک سے متعلق تنازعات کی قانونی چارہ جوئی صرف دھنباد کی ہی عدالتوں میں کی جاسکتی ہے۔
- عالمی فلک ایک ادبی اور غیر کاروباری رسالہ ہے۔جس سے منسلک افراد بغیر معاوضہ کے اپنی خدمات انجام دیتے ہیں۔
- ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، نثار احمد نے مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی۔۲۵ سے چھپوا کر محمد علی روڈ، سیٹی کالونی،
- دھنباد-828130 سے شائع کیا۔

مشمولات

عصری مکالمے

گوشۂ حسین الحق

مضامین

فکشن

منظومات

انشائیہ

اور زبانوں کا ادب

سندھی کہانی

تلگو نظمیں

مراٹھی نظمیں

ہندی نظم

تبصرے

مکتوبات

حمد باری تعالیٰ

فضا ابن فیضی

دی جو توفیقِ ہنر، حُسنِ پذیرائی بھی دے
اس زیاں خانے میں، سودِ نکتہ آرائی بھی دے

ان گنت چہروں کی بڑھتی بھیڑ میں کھوجاؤں گا
خال و خط بخشے ،تو اب اپنی سی یکتائی بھی دے

ہوں خود اپنے آپ میں گم ، جیسے جنگل کا گلاب
میں ہوں اک منظر ،تو پھر اس کو تماشائی بھی دے

چُپ رہے کب تک، یہ سینوں میں بھرے قرنوں کی آگ
نُطق ولب کے پاسباں ، پتھر کو گویائی بھی دے

یہ جراحت بے خلش نکلی، تو پھر کیا فائدہ؟
شہرت ایسی دے، کہ جس کی داد رسوائی بھی دے

شوخیِ پائے ہوس پر ، شرم آتی ہے مجھے
آگے بڑھنے کی سکت دی تھی ،تو پسپائی بھی دے

اک سلیقے سے، ذرا مجھ سے یہ نفرت کرسکیں
جو نہ دی مجھ کو ، اب اوروں کو وہ دانائی بھی دے

مدتیں گزریں، نہ اپنے آپ سے ملنا ہوا
مجھ کو یارب ! ان بھرے شہروں میں، تنہائی بھی دے

ہوچکے وحشت میں کامل ، شہر کے سنجیدہ لوگ
اب درو دیوار کو، صحرا کی پنہائی بھی دے

انگلیاں ہیں، کائنات و ذات کے اوراق پر
دی ہے ہاتھوں میں کتاب ایسی ، تو بینائی بھی دے

مصوّر سبزواری

تُو سحر تُو ابَد آفریں روشنی، تو کہاں میں کہاں

میں ازل سے گنہگارِ تیرہ شبی، تو کہاں میں کہاں

آسمانی صحیفوں کی تو اک زباں اک نوشتِ عمل

میں فقط حرفِ بے چارگی اے نبیؐ تو کہاں میں کہاں

تو امیرِ عرب، بادشاہِ عجم، میں گدائے ہوس

گلیوں گلیوں بھٹکتی اک آوارگی، تو کہاں میں کہاں

تو ہے عرش آشیاں، آسماں در قدم، میرا گھر خاک پر

تو بلندی کا ہے آخری آدمی، تو کہاں میں کہاں

تو عطا میں خطا، تو کرم میں ستم، تو بھرم میں رِیا

صدق تُو میں سیہ داستاں کذب کی، تو کہاں میں کہاں

تو سراپا ہے رحمت شجر، رنگتوں خوشبوؤں کا ثمر

میں خزاں، تیری ایک ایک پتی ہری، تو کہاں میں کہاں

اداریہ

'عالمی فلک' کا زیرِ نظر شمارہ ۷-۸ بعض وجوہ کی بناء پر کتابی سلسلے کا مشترکہ شمارہ ہے۔

دراصل کسی شمارے کی بروقت اور پابندی کے ساتھ اشاعت بھی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ گزشتہ دنوں لاک ڈاؤن کے سبب ادارہ عالمی فلک کے لیے پابندی کے ساتھ اپنی اشاعتوں پر گرفت رکھ پانا ممکن نہیں رہ سکا تھا۔ چنانچہ اس بے ضابطگی سے فوری طور پر نجات حاصل کرنے کے لیے ادارے کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ زیرِ نظر شمارے کو مشترکہ شمارے کی صورت میں منظرِ عام پر لایا جائے تاکہ آئندہ بروقت اشاعت کی راہ ہموار ہو سکے۔

ہمیں خوشی ہے کہ 'عالمی فلک' کے دیگر شماروں کی طرح قارئین ادب نے گذشتہ شمارہ-٦ کی بھی کھلے دل سے پذیرائی کی جس کے لیے ادارہ ان کا شکر گزار ہے۔ کسی شمارے کی اشاعت سے لے کر قارئین تک اس کی رسائی کا مرحلہ مشکل اور صبر آزما ہی نہیں کئی فکر و اندیشے سے نبرد آزما بھی ہوتا ہے۔ ہمارے لیے موصول ہونے والے مضامین، افسانوں، نظموں اور غزلوں کے علاوہ دیگر تحریروں سے شمارے کے لیے مشمولات کا انتخاب بھی ایک پیچیدہ مسئلہ ہوا کرتا ہے۔ ہمیں مستند اور معروف ادیبوں اور نقادوں کی تحاریر کے علاوہ نئے لکھنے والوں کی بھی تخلیقات موصول ہوا کرتی ہیں جو اردو کے مستقبل کے لیے ایک مثبت علامت کہی جا سکتی ہے۔ کیونکہ نئی نسل کی فکری و عملی دلچسپی کے بغیر نہ تو قوم و معاشرے کا فروغ ممکن ہے اور نہ شعر و ادب کا۔ لہٰذا ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اس سلسلے میں معروف اور مستند ادیبوں کے علاوہ نئے لکھنے والوں کی تخلیقات بھی شاملِ اشاعت کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ اردو زبان و ادب کی شریانوں کو تازہ لہو ملتا رہے۔ لیکن اس عمل میں نئے لکھنے والوں کی تحریروں میں فنی اصولوں کی باریکیوں اور فکری معیار کا جائزہ لینا بھی ہمارے لیے ضروری ہوتا ہے۔ دراصل معیار کا یہ انتخاب نئے لکھاریوں کی تربیت کا بھی کام کرتا ہے۔ تربیت کے بغیر اچھے اور معیاری ادب کی تخلیق کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم نئے لکھنے والے کی ایک بڑی کمزوری ان کی عجلت پسندی ہے۔ وہ بغیر کسی ردّ و قدح کے 'کاتا اور لے دوڑی' کے مصداق فوری طور پر اپنی ہر تحریر کی اشاعت کے متمنی ہوتے ہیں۔ جب کہ ان کی یہ عجلت پسندی ان کے اچھے اور معیاری ادب کی تخلیق کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ بعض نئے لکھاری تو چند مضامین، افسانے یا نظمیں اور غزلیں لکھ کر خود کو اہم، قابلِ ذکر اور مستند ادیبوں کی قطار میں شمار کرنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے بارے میں نقادوں سے مضامین لکھوانے کی تگ و دو میں لگ جاتے ہیں۔ کچھ تو اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ اپنے ایسے ہی برائے نام سے تحریری سرمائے کی بنیاد پر ریسرچ اسکالروں پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھنے کے لیے ڈورے ڈالنے میں

بھی کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے۔بعض تو ایسے مقالے لکھوانے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔لیکن کیا یہ صورت اردو ادب کے روشن مستقبل کے لیے صحت مند کہی جائے گی؟ کیا ہر شاعر محض ایک دیوان کے سہارے مرزا غالبؔ جیسی شاعرانہ حیثیت کا حامل ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ نئے لکھاریوں کو نہیں بھولنا چاہیے کہ ترقی کا کوئی شارٹ کٹ راستہ نہیں ہوتا۔سچ یہی ہے کہ جو شعراء، ادباء یا نقاد آج شہرت، مقبولیت اور سند کی بلندی پر متمکن ہیں وہ ان کی برسوں کی جگر سوزی اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔بڑا اور معیاری ادب وہ ہوتا ہے جو اپنے بارے میں لکھوانے پر اصرار نہیں کرتا بلکہ اس کی اہمیت و افادیت نقادوں کو از خود اس پر قلم اٹھانے پر مجبور کر دیتی ہے۔اور یہ حیثیت کسی ادیب کو برسوں کے مطالعے، مشاہدے، تجربے اور ریاضت کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔

'عالمی فلک' میں اشاعت کے لیے بھیجی جانے والی تخلیقات سے متعلق ایک شکایت یہ پائی جاتی ہے کہ ان میں اکثر مطبوعہ تخلیقات بھی ہمیں موصول ہو جایا کرتی ہیں۔جب کہ ادارہ کی جانب سے بار بار اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ ادیب حضرات اس نوٹ کے ساتھ کہ 'متعلقہ تخلیق غیر مطبوعہ ہے' اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات ہی ہمیں ارسال کریں۔ہم واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ادارے کے پاس موصول ہونے والی متعلقہ تخلیقات کی تصدیق کا نہ تو کوئی وسیلہ ہوتا ہے اور نہ ہی وقت۔لہٰذا موصول ہونے والے بیان پر یقین کرتے ہوئے بھیجی گئی تخلیقات اشاعت پذیر ہو جاتی ہیں۔لیکن اشاعت کے بعد مختلف حلقوں کے توسط سے از خود حقیقت کھل جاتی ہے جو اچھا تاثر نہیں پیدا کرتی۔لہٰذا ادارے کو اندھیرے میں رکھ کر اپنی تخلیق کو شائع کروانا غیر اخلاقی حرکت ہی تصور کی جائے گی۔یہ عمل نہ صرف جریدے کے اعتبار کو نقصان پہنچاتا ہے بلکہ اس سے متعلقہ ادیب کا وقار بھی مجروح ہوتا ہے۔ہمیں امید ہے کہ آپ اپنی تخلیقات ارسال کرتے وقت اس ہدایت کو ذہن میں رکھیں گے۔

ہمیں اپنے قارئین کو یہ بتاتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ ادارہ 'عالمی فلک' کے اس شمارہ میں معروف فکشن نگار حسین الحق کی زندگی اور ادبی خدمات پر ایک گوشہ شاملِ اشاعت ہے۔اس موضوع پر جن اہلِ قلم حضرات نے اپنا قیمتی مقالہ ہمیں ارسال کیا ہے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام بھی اس گوشے کے مشمولات اور متن کے حوالے سے اپنی گراں قدر رائے سے ہمیں مطلع کر کے ہماری رہنمائی میں معاون ہوں گے۔

اردو زبان و ادب کے معروف نقاد گوپی چند نارنگ کی رحلت انتہائی افسوس ناک واقعہ ہے۔ادارہ عالمی فلک گوپی چند نارنگ کے ارتحال پر ان کے متعلقین کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا کرتا ہے کہ ان کے لواحقین کو خدا صبر جمیل عطا کرے۔

احمد نثار

جھارکھنڈ میں اردو بہ حیثیت دوسری سرکاری زبان

ڈاکٹر سرور حسین

موبائل : 9836833113

اردو صوبۂ بہار کی طرح جھارکھنڈ صوبے کی بھی دوسری سرکاری زبان ہے۔لیکن بہار میں جہاں اسے کسی حد تک سرکاری سرپرستی حاصل ہے جھارکھنڈ میں یہ محض کاغذی خانہ پُری کی حیثیت رکھتی ہے۔ایسا بھی نہیں کہ دوسری سرکاری زبان کا یہ برائے نام درجہ بھی اسے جھارکھنڈ حکومت نے تفویض کیا ہے۔ بلکہ ملک کے آئین کی لازمی شرائط کے مطابق کسی بھی صوبے یا ریاست کی تقسیم کے ساتھ نئے وجود میں آنے والے صوبوں یا ریاستوں کو وہ تمام التزامات اور مراعات یکساں و مساوی طور پر فطری طور پر منتقل ہو جائیں گی جو متعلقہ غیر منقسم صوبے یا ریاست کو حاصل تھیں۔ چنانچہ ۱۵/نومبر ۲۰۰۰ء کو صوبۂ بہار سے الگ ہو کر جھارکھنڈ کا صوبہ جب تشکیل میں آیا تو بہار کی طرح اردو جھارکھنڈ کی بھی دوسری حکومتی زبان بن گئی۔ تاہم قانونی طور پر حکومت کی زبان تسلیم کیے جانے کے باوجود یہ عملی طور پر جھارکھنڈ میں حکومت کے کام کاج کی زبان آج تک نہیں بن سکی ہے۔ جھارکھنڈ کے اس صوبے کو وجود میں آئے آج ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔اس دوران اس صوبے میں بہت سی تبدیلیاں لائیں گئیں۔کئی حکومتیں بنیں۔ بہت سے اصلاحات کیے گئے ،قوانین بنے۔لیکن اردو کو سرکاری کام کاج میں استعمال کے حوالے سے کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ جس کے باعث صوبے میں اردو زبان و ادب کی نہ تو ترویج و اشاعت ہو پا رہی ہے اور نہ ہی اس کی بقا اور فروغ کی ضمانت دے پانا ممکن ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ تقسیمِ بہار سے قبل بہار میں دوسری حکومتی زبان کے بطور اردو کی بقا اور فروغ کے لیے حکومتِ بہار کی طرف سے جو قوانین، محکمات اور تنظیمیں قائم کی گئیں تقسیم کے بعد جھارکھنڈ کی نئی ریاست میں انھیں بھی قائم کیا جانا لازمی تھا۔حکومتِ بہار نے اردو کی ترویج و اشاعت اور فروغ کے لیے کئی تنظیمیں اور محکمے قائم کیے مثلاً بہار اردو اکیڈمی ،اردو ڈائرکٹوریٹ محکمۂ کابینہ بہار، اردو مشاورتی کمیٹی، مدرسہ اکزامینیشن بورڈ، محکمۂ اقلیتی فلاح ،اقلیتی مالیاتی کارپوریشن اور مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسیٹی وغیرہ۔ان محکمات اور کمیٹیوں پر اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور اقلیتی آبادی کی معاشی فلاح کے لیے غور و خوض کرنا اور ضرورت کے مطابق عملی

قدم اٹھانے کی ذمہ داری عائد کی گئی۔ تاہم افسوس یہ ہے کہ ریاستِ جھارکھنڈ کو وجود میں آئے آج ۲۱ سال گزر جانے کے باوجود یہاں قائم ہونے والی کسی بھی حکومت نے ان اداروں کے قیام کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اُٹھایا۔ جب کہ جھارکھنڈ کی اردو آبادی کی طرف سے جھارکھنڈ کے قیام کے بعد سے ہی مسلسل اردو اکیڈمی، اردو ڈائرکٹوریٹ اور اردو مشاورتی بورڈ کے قیام کے لیے حکومت کو میمورنڈم بھیجے جاتے رہے ہیں۔ لیکن جھارکھنڈ میں قائم ہونے والی کسی بھی حکومت نے ان مطالبات کو اہمیت دینا ضروری نہیں سمجھا ہے۔ حکومت کی اس عدم توجہی کے سبب جھارکھنڈ میں اردو کی صورتِ حال دن بہ دن ناگفتہ بہ ہوتی جا رہی ہے۔ جھارکھنڈ میں مدرسہ اکزامینیشن بورڈ نہ ہونے کے باعث یہاں فوقانیہ، مولوی، عالم اور فاضل کے امتحانات کا انعقاد جھارکھنڈ اکاڈمک کونسل کی زیرِ نگرانی عمل میں لایا جاتا ہے۔ لیکن جھارکھنڈ اکاڈمک کونسل کے ذریعہ تفویض کی جانے والی ڈگریوں میں محض فوقانیہ اور مولوی کو ہی حکومت کی منظوری حاصل ہے، عالم اور فاضل کو نہیں۔ واضح رہے کہ بہار میں اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جو عالم و فاضل کے امتحانات کا انعقاد کرتی ہے اور ڈگریاں تفویض کرتی ہے۔ ان ڈگریوں کو دوسری یونیوسیٹیوں کی ڈگریوں کی طرح ہی قبولیت اور منظوری حاصل ہے۔ لیکن جھارکھنڈ میں ایسی کوئی عربی و فارسی یونیورسیٹی کے نہ ہونے کا باعث جھارکھنڈ اکاڈمک کونسل سے جاری کی گئی عالم و فاضل کی ڈگریوں کو بی اے اور ایم اے کی ڈگریوں کے مساوی اہمیت حاصل نہیں۔ نتیجتاً یہاں سے کامیاب ہونے والے طلباء لکچررشپ کی امیدواری کے اہل تسلیم نہیں کیے جاتے۔

یہ قابلِ غور ہے کہ جھارکھنڈ کے قیام کے دنوں میں ہی اترپردیش اور مدھیہ پردیش سے ٹوٹ کر اتراکھنڈ اور چھتیس گڑھ کے صوبے تشکیل پذیر ہوئے تھے اور ان دونوں صوبوں میں اردو اکیڈمی اور دیگر لسانی و اقلیتی ادارے ساتھ ساتھ قائم کر دیے گئے۔ یہاں یہ حقیقت بھی دلچسپ ہے کہ اتراکھنڈ میں اردو کی آبادی محض ۸ فی صد اور چھتیس گڑھ میں ۱۲ فی صد ہے جب کہ جھارکھنڈ میں اردو بولنے والوں کا تناسب ۲۸ فی صد کے قریب ہے۔ حیرتناک امر تو یہ ہے کہ گذشتہ ۲۱ برسوں کے دوران جھارکھنڈ میں جو گورنر بحال ہوئے ان میں سے تین گورنر اقلیتی فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور اردو زبان پر عبور رکھتے تھے۔ تاہم اردو اور اقلیتوں کے مسائل پر توجہ دینے کی ان کے زمانے میں بھی کوئی زحمت نہیں اُٹھائی گئی۔ زبان و ادب کے مسائل کے علاوہ جھارکھنڈ میں اقلیتی مالیاتی کارپوریشن کا قیام نہ ہونے کے سبب آج غریبی، مہنگائی اور بے روزگاری کی مار جھیلنے والی ریاست جھارکھنڈ میں اقلیتی فرقے کے اقتصادی طور پر پسماندہ نوجوان اُن مالیاتی سہولیات کے حصول سے بھی محروم ہیں جو آئینی طور پر

انھیں دستیاب ہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان ایک کثیر قومیتی ملک ہے۔ ہندوستان میں جمہوری نظام کی بقااور فروغ کے لیے یہاں کی ہر قومی اکائی کے تشخص کی ضمانت اور مساوی فروغ ضروری ہے۔قومیتوں کی اکائیوں کی بقااور مساوی فروغ ہی جمہوری نظام میں قوم کی تشکیل کے عمل میں معاون ہوتے ہیں۔تاہم یہ واقعہ ہے کہ ملک کا مقتدر طبقہ قومیتوں کے مساوی فروغ کو اپنے طبقاتی مفادات کے خلاف تصور کرتا ہے۔وہ قومیتوں کی انفرادی شناخت اور مساوی اکائی کی حیثیت کوتسلیم کرنے کی بجائے قوم کوواحد اکائی کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہے۔ اسی حکمتِ عملی پر وہ کاربند بھی ہے تاکہ ملک میں موجود مختلف مذہبی، لسانی، اقتصادی اور ثقافتی تشخص کے امتیاز کو مختلف طریقوں اور تدابیر کے ذریعہ رفتہ رفتہ ختم کر کے انھیں واحد اکائی میں تبدیل کیا جا سکے۔تاہم یہ سراسر غیر جمہوری عمل ہے جوملک کی قومی تکمیل کی راہ میں مانع ہے اور ملک کے سماجی ڈھانچے میں انتشار کی صورت پیدا کرتا ہے۔ملک آج اسی صورتِ حال سے گزر رہا ہے۔

عوامی سطح پر یہ بھی ایک المیہ ہے کہ ہم گزشتہ پونے ایک صدی کے دوران جمہوری تحریکات سے دھیرے دھیرے دور ہوتے چلے گئے ہیں۔سماجی وسیاسی سطح پر غیر فطری طریقے سے ہمارے سامنے آج فکری ونظریاتی خلاء پیدا کرنے کی خطرناک کوشش کی جارہی ہے تاکہ اس خلاء کوایک انتہائی پسماندہ اور فرسودہ قومی تشخص کے نظریے سے پُر کیا جا سکے ۔نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری سیاست کا معیار بھی گزشتہ نصف صدی کے دوران تیزی سے گرتا چلا گیا ہے۔ ہمارے رہنماؤں کا مقصد بھی محض اقتدار کا حصول رہ گیا ہے جس کے ذریعہ وہ عوام کی بجائے محض اپنے ذاتی اور مقتدر طبقے کے مفادات کی تکمیل کے لیے سرگرم ہوا کرتے ہیں۔انتخابات کے وقت وہ اقلیتوں کے کوٹے اور تناسب کے لیے خوب واویلا مچاتے ہیں لیکن ان کوٹوں پر عوام کے ووٹوں سے کامیاب ہوکر جب اقتدار پر متمکن ہوتے ہیں تو ان کے سامنے عام عوان کی بجائے صرف ان کے اپنے اور مقتدر طبقے کے مفادات ہی ہوا کرتے ہیں۔ایسی صورت میں اردو کے حق کے لیے جھارکھنڈ کے تعلیم یافتہ افراد، ادیبوں، شاعروں ،عالموں ،دانشوروں، طلباء اور عام عوام کوحکومت کو متوجہ کرنے کے لیے کارگر حکمتِ عملی کی تلاش کرنی ہوگی اور موثر لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا۔ یہ واضح ہے کہ محض میمورنڈم اور کاغذی مطالبات سے عوام اپنے جائز حقوق حاصل نہیں کر سکتے۔ان مطالبات کے پیچھے عوامی دباؤ کی بھی اشد ضرورت ہے۔

گوشۂ حسین الحق

افسانوں کی سونی محفل

عبدالصمد

موبائل : 7739838768

''ایک بات یاد رکھو صمد، میں نے موت سے ہار نہیں مانی ہے اور نہ مانوں گا۔'' حسین الحق نے یہ بات بڑے اعتماد کے ساتھ کہی۔ میں نے فوراً جواب دیا ۔

''تم نے یہ کہہ کر میرا حوصلہ بڑھا دیا۔ انشاءاللہ تم ضرور صحت یاب ہو جاؤ گے......''

تاریخ تھی ۲۵/نومبر ۲۰۲۱ء اور میں ان کے مکان گیا میں بیٹھا تھا۔

۲۳/دسمبر ۲۰۲۱ کو انہوں نے موت سے نہیں مشیت ایزدی سے ہار مان لی۔

حسین الحق اکثر کہا کرتے تھے، میں مالک دو جہاں سے دعا مانگتا ہوں کہ مجھے ۶۵ سال سے پہلے نہ اٹھانا اور ستر سال سے زیادہ نہ رکھنا۔

حسین الحق کو شاید خود پتہ نہیں تھا کہ ان کی زبان سے کب، کیوں اور کیسے الفاظ نکل رہے ہیں۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ یہ تمام باتیں یوں ہی ادا نہیں ہو رہی تھیں، ان باتوں میں معنی کی وہ دنیائیں پوشیدہ تھیں جو اس وقت ہماری نظروں سے اوجھل تھیں اور آج ساری باتیں اپنے
وقت پر کھل گئی ہیں، اور انہوں نے ہماری آنکھیں بھی کھول دی ہیں۔

ایک بار حسین نے مجھ سے پوچھا کہ تم لوگ اللہ سے کس قسم کا رشتہ رکھتے ہو۔

عجیب سوال تھا، میں نے بھی انہیں کے انداز میں جواب دیا۔

''جیسا کہ اس سے رشتہ رکھنے کا حق ہے۔''

حسب مزاج وہ اکھڑ گئے۔ ''صاف صاف بتاؤ نا......''

میں نے جواب دیا......

''جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے......''

ہنسنے لگے۔ میں ان کا منہ تاکتا رہا، وہ بولے۔

''میرا تو اللہ سے رشتہ محبت والا ہے۔ ڈر اور خوف کا نہیں، میں ہمیشہ اس سے رحمت کی امید رکھتا ہوں۔ میرے ذہن میں تو اس کے قہار و جبار ہونے کا تصور بھی نہیں ہے......''

میں حیرت سے ان کا منہ دیکھتا رہا اور ان کے ایمان کی پختگی پر عش عش کرتا رہا۔

حسین الحق ایک صوفی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور انہیں اپنی وراثت بہت عزیز بھی تھی، مگر ذہن جدید پایا تھا۔ وہ زندگی کے ہر رخ کو بشمول مذہب کچھ ایسا دیکھنا چاہتے تھے جو دوسروں سے بہت مختلف ہو۔ میں اکثر بحث کرتا اور سب تو ٹھیک ہے مگر مذہب کے معاملے میں تمہارا نظریہ صحیح نہیں ہے۔ وہ کہتے کہ مذہب کو لوگوں نے بہت محدود دائرے میں قید کر دیا ہے۔ اس میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری ہے کہ ابھی اس کی تہہ تک اکثر لوگ نہیں پہنچے ہیں، اور نہ پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ باتیں وہ دلائل کے ساتھ کرتے تھے اور ان کی دلیلوں کو کاٹنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ مشکل یہ ہوتی تھی کہ وہ دین کے کما حقہ علم سے بھی خوب واقف تھے، نہ صرف یہ کہ انہوں نے باقاعدہ مدرسوں میں تعلیم حاصل کی تھی بلکہ وہ عالم بھی تھے، پھر ان کے گھر کا ماحول دینی اور صوفیانہ تھا۔ ان کے والد بزرگوار مولانا شہود الحق ایک پائے کے عالم تھے اور ان کی نگاہیں بے حد وسیع تھیں، گھر میں ہر وقت دین کی باتیں ہوتی تھیں، اس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوتی رہتی تھی اور ہم ٹھہرے خاندانی مسلمان، یعنی مسلمان گھر میں پیدا ہو گئے اس لئے مسلمان کہلائے۔ ورنہ دین کا تقریباً سارا علم ہمارا سنا سنایا تھا۔ ایسے میں ان کی بعض باتوں سے اتفاق یا اختلاف کرنا میرے جیسے بندے کے لئے ممکن نہیں تھا۔

حسین الحق کو دیکھ کر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس حلیے اور شکل و شباہت کا بندہ اپنی سوچ اور Approach میں اتنا ماڈرن اور کھلے ذہن کا مالک بھی ہو سکتا ہے۔ وضع قطع ان کی مکمل طور پر مولویانہ تھی، باریش وہ اوائل ہی سے تھے، کرتا پاجامہ، بنڈی مخصوص لباس تھا۔ جاڑوں میں کبھی کبھی پرنس کوٹ بھی زیب تن کر لیتے، پھر وہ اپنی خانقاہ کے صاحب سجادہ بھی تھے اور ان کے مریدوں کا بھی ایک حلقہ تھا۔ مگر ان تمام باتوں کا تعلق وہ مذہب سے نہیں، تہذیب و تمدن سے جوڑتے تھے اور کسی کو بھی ان چیزوں پر عمل کرنے کو نہیں کہتے تھے۔

حسین الحق نے ایک ایسا ذہن پایا تھا کہ وہ آنکھیں بند کر کے کسی چیز کو قبول نہیں کرتا تھا، اس کے مثبت او رمنفی پہلو فوراً ان کے سامنے آ جاتے تھے اور وہ ایک الگ راہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ شاہد احمد شعیب مذاق کے طور پر کہتے تھے کہ حسین کے سامنے کبھی یہ نہ کہنا کہ خدا ایک ہے، ورنہ وہ فوراً کچھ اور ثابت کرنے کی

کوشش کرنے لگیں گے۔ حسین کہتے تھے کہ ہمیں ذہن وعقل اس لئے عطا نہیں ہوئے کہ جو کچھ ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں، انہیں ہم بے چوں چرا، اپنی عقل وفہم کو استعمال کئے بغیر تسلیم کرلیں۔

ایک زمانے میں حسین آگ ہوا کرتے تھے، ذرا ذرا سی بات پر جھگڑ پڑتے، قوت برداشت کی بہت کمی تھی ،لیکن اہم بات یہ تھی کہ پھر وہ فوراً ہی نارمل بھی ہو جاتے تھے۔ ان کی یہی عادت یا ادا انہیں دوستوں میں مقبول بناتی تھی۔ ہم سب جانتے تھے کہ حسین دیر تک اپنے دل میں کچھ رکھنے والے بندہ نہیں تھے، اس لئے ان سے جھگڑا کرنے میں مزا بھی آتا تھا اور ان کی دوستی ہمیں بہت عزیز بھی تھی۔

وہ اپنے لکھنے پڑھنے کو بہت اہمیت دیتے تھے، جو کچھ پڑھتے ، اس کا اظہار دوستوں سے ضرور کرتے اور اس پر بحث کرتے جو کچھ لکھتے اس کا ذکر بھی ہم لوگوں سے ضرور کرتے۔ انہیں اپنے لکھے افسانے سنانے کا بہت شوق تھا، جب بھی ملاقات ہوتی تو وہ کوئی نہ کوئی افسانہ لے کر بیٹھ جاتے، ان کے لکھنے کی رفتار بھی غیر معمولی تھی، وہ فون پر بھی تازہ افسانہ سنانے سے باز نہیں آتے تھے، اگر ہم میں کوئی انکار کردیتا تو وہ برا بھی مان جاتے۔ میرے جیسے کم مائیگی کا شکار بندہ افسانہ سنانے سے بہت بھاگتا تھا اور افسانہ سننا تو اور بھی کوفت کا باعث ہوتا ہے۔ حسین سپاٹ انداز میں افسانے سننے کے بھی قائل نہیں تھے۔ وہ اپنے سنائے ہوئے افسانے پر باقاعدہ گفتگو کرنا چاہتے تھے اور جو رائے ان سے مختلف آتی تو اسے قبول کرنے میں بھی انہیں عار نہیں ہوتا تھا، بشرطیکہ اس کے لئے مضبوط دلیل بھی ہو، اس لئے فون پر ہی بہت دھیان سے ان کا افسانہ سننا بہت ضروری ہوتا تھا۔ ویسے یہ شرف وہ صرف چند مخصوص دوستوں ہی کو بخشتے تھے اور مجھے یہ خوش فہمی ہے اور رہے گی کہ وہ مجھے چند قریبی دوستوں میں شمار کرتے تھے۔

حسین ظاہری شخصیت کے اعتبار سے بہت متاثر کن نہیں تھے، مگر جب زبان کھولتے تھے تو سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا، چاہے وہ ان کے دلائل سے متفق ہو یا نہیں اور جب وہ جذبات کے عالم میں ہوتے تھے تو ان کے بہاؤ کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی تھی۔ ان کے اندر خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور اس سے زیادہ ان کی قوت ارادی۔ وہ جب کسی چیز کا ارادہ کر لیتے تو پھر کوئی رکاوٹ ان کے قدم نہیں روک سکتی تھی۔ اس کا ذاتی تجربہ مجھے اس وقت ہوا جب ہم لوگ ۲۰۱۲ء میں حج بیت اللہ کو گئے۔ میری بیوی افسانہ کے علاوہ ان کی بیگم نشاط بھی ساتھ تھیں۔ نشاط بھابی کو چلنے میں خاصی تکلیف ہوتی تھی اور وہ آسانی سے زیادہ قدم نہیں اٹھا پاتی تھیں، حسین نے ان کے لئے ایک وہیل چیئر کا انتظام کیا، وہ اس پر انہیں روزانہ قیام گاہ سے بیت اللہ شریف کو

لے جاتے۔اس سے زیادہ حیرت ناک اور کبھی نہیں بھولنے والا منظر وہ تھا جب ہم نے منیٰ سے عرفات کئی میل کے سفر کو طے کیا۔ پھر منیٰ سے مکہ شریف کے دس گیارہ کیلومیٹر میں وہ بھابی کی وہیل چیئر کو دھکیلتے ہوئے منزل کو پہنچے۔ ہم لوگ تھک گئے مگر وہ اس دہری محنت سے نہ تھکے، بس رہ رہ کے انہیں پان کی حاجت ہو جاتی تھی جو ایک طرح سے ان کے لئے پٹرول تھا، پان کا ڈبہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا تھا جس کے سہارے وہ بڑا سے بڑا معرکہ طے کرنے کو تیار رہتے تھے۔

ان کی قوت ارادی کا دوسرا مظہر پوری طاقت کے ساتھ اس وقت سامنے آیا جب اس مہلک بیماری نے ان کے جسم میں دستک دی۔ابتدائی جانچ کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ انہیں دلی
لے جایا جائے۔ جاتے وقت مجھے انہوں نے اطلاع دی کہ بیماری کا شک ہے، میں جانچ کے لئے دلی جا رہا ہوں، صرف تم کو مطلع کر رہا ہوں، ابھی اس کو اپنے ہی تک رکھنا۔ دلی کے نام پر میرا دل زور سے دھڑ کا تھا۔ یہ فیصلہ ان کے لائق فائق بیٹے شارع نے کیا تھا، وہ خود ڈاکٹر ہے اور تمام نزاکتوں کو سمجھتا ہے۔کئی روز کے بعد ان کا فون آیا کہ میں میکس میں داخل ہو گیا ہوں اور یہاں ڈاکٹروں نے بھی اسی بیماری کا شک ظاہر کیا ہے، لہٰذا یہاں علاج شروع ہوگا۔ان کی آواز میں ذرا گھبراہٹ یا لڑکھڑاہٹ نہیں تھی جب کہ سننے والے کا کلیجہ حلق میں آ گیا تھا، مجھے یاد آیا کہ وہ پان کے ساتھ زردہ کھانے کے عادی ہیں، مگر یہ تو کوئی وجہ نہیں ہوئی، دنیا میں بہت لوگ پان زردے کے عادی ہوتے ہیں، خود میرے والد بزرگوار اوائل حیات سے سگریٹ اور زردے کے عادی تھے، انہیں یہ بیماری چھو کر نہیں گئی اور دوسرے مرض میں ان کی موت ہوئی۔ بہر کیف، حسین کئی مہینے دلی میں رہے اور وہاں ان کی کامیاب کیمو تھراپی چلتی رہی، وہ مجھے برابر فون سے صورت حال کی خبر دیتے رہے۔ ان کا حوصلہ ہمیشہ بلند رہا۔حالانکہ ڈاکٹروں نے پان زردہ کھانے پر سخت پابندی عائد کر دی تھی اور مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ اتنی سخت پابندی ان پر لاگو ہو سکے گی۔ حج کے موقع پر ان کے ساتھ پونے دو ماہ رہنے کا موقع ملا اور میں نے انہیں حیرت انگیز طور پر اپنی اس عادت پر شدت سے برقرار دیکھا۔ وہاں ان کے جو بھی رشتہ دار، جانکار اور شاگردان سے ملنے آتے، ان سے وہ صرف پان کی فرمائش کرتے، پان وہاں آسانی سے دستیاب نہیں تھا اور زردے کی درجنوں ڈبیہ وہ ساتھ لے کر گئے تھے، پھر پان کے بعد انہیں فوراً چائے کی طلب ہوتی تھی یہ خدمت ان کی بیوی نشاط اور میری بیوی افسانہ بخوشی انجام دیتی تھیں۔ میں نے کئی بار ان سے کہا کہ کم از کم یہاں تو ان عادتوں پر کنٹرول کرنے کوشش کرو، وہ مسکرا کر چپ ہو جاتے، اس بندے کی قوت ارادی اتنی

مضبوط تھی کہ جب اس نے پان زردہ چھوڑ دیا تو پھر کبھی مرتے دم تک ان کا نام بھی نہیں لیا۔ ان کی مضبوط قوت ارادی کے ابھی اور کئی چشم دید واقعات ہیں۔

دلی میں ڈاکٹروں نے انہیں صحت یابی کا مژدہ سنایا اور وہ خوش خوش گیا لوٹ آئے۔ اب یہ میں نہیں جانتا کہ ڈاکٹروں کے سامنے کوئی مصلحت تھی یا وہ سچ کہہ رہے تھے۔ بہر کیف، گیا واپسی کے بعد وہ مہینوں ٹھیک ٹھاک رہے، گاہے گاہے گھر سے باہر بھی نکلتے تھے، اگر چہ اس میں کمی ضرور آ گئی تھی۔ پھر اچانک انہیں کمزوری محسوس ہونے لگی، نارمل کھانا پینا تو تقریباً چھوٹ ہی گیا تھا، رقیق غذائیں چل رہی تھیں اور ان میں بھی مقوی چیزوں کا خاص خیال رکھا جا رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے انہیں نارمل چیک اپ کے لئے تین چار مہینے کے بعد دلی بلایا تھا، وہ گئے اور وہاں سے پھر حوصلہ مند خبر لے کر لوٹے۔ پھر چیک اپ کے لئے پٹنہ بھی آئے۔ جولائی میں ان سے گیا میں ملاقات ہوئی تو سوائے اس کے کہ وہ دبلے دکھائی دیے بظاہر اور کوئی علامت بیماری کی نظر نہیں آئی، البتہ کیمو کے اثرات سے سر اور داڑھی کے بال متاثر ہوئے تھے اور جو ہونٹ ہمیشہ پان سے لال رہتا تھا، وہ ایسا خشک تھا کہ اس سے ان کے چہرے پر ایک تبدیلی نظر آتی تھی۔ خوش مزاجی برقرار تھی، مگر پتہ نہیں کیوں مجھے محسوس ہوا کہ صحت کے اعتبار سے وہ پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔

لکھنا پڑھنا ان کا تقریباً چھوٹ چکا تھا، خاص طور پر لکھنا۔ وہ حسین الحق جو مجھ سے ہمیشہ کہا کرتا کہ لکھنا کبھی مت چھوڑنا، اس سے ذہن اور سوچ ہمیشہ متحرک رہیں گے، وہ کہنے لگا کہ میں کیا لکھوں، ایک سطر بھی کاغذ پر آنے کا روادار نہیں ہے، اور جب پڑھنے بیٹھتا ہوں تو تھوڑی ہی دیر کے بعد ذہن ماؤف ہونے لگتا ہے۔ میں یہ سن کر دہل جاتا۔ میں ہمیشہ کتابوں، رسالوں کے بارے میں ان سے دریافت کرتا، ظاہر ہے ان کے پاس بے شمار کتابیں اور رسالے آتے تھے، وہ ان کے موصول ہونے کی خبر تو دیتے، مگر پڑھنے کی کوئی اطلاع نہیں دیتے تھے، جب کہ پڑھنے کا انہیں ہوکا سا تھا، میں شائع شدہ بعض اہم تحریروں کے بارے میں ان سے باتیں کرنے کی کوشش کرتا تو وہ بس 'ہوں ہاں' کر کے رہ جاتے۔ وہ حسین الحق کہ لکھنا پڑھنا جس کی زندگی تھی، یہ کیسی ستم ظریفی تھی کہ وہ اپنے اسی شوق سے محروم ہو گیا تھا۔ پڑھنے لکھنے کے لئے وہ چھٹپٹا تا رہتا تھا، جہاں تک لکھنے کا سوال ہے، اس نے اپنی زندگی میں اتنا کچھ لکھ لیا تھا کہ ایک گونا تشفی اسے ضرور حاصل تھی، مگر ایک جینوئن لکھنے والا مکمل طور پر اپنے لکھنے سے کبھی مطمئن ہو سکتا ہے کیا؟—

پڑھنے کی بے شمار چیزیں اس کے آس پاس بکھری رہتی تھیں، وہ بڑے شوق سے کتابوں اور رسالوں کو

وصول کرتا، انہیں ایک عقیدت کے ساتھ مناسب جگہوں پر رکھتا، ان پر محبت کے ہاتھ پھیرتا رہتا، ورق ورق الٹ کرانہیں اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرتا، اس مقدس اور بے حد پسندیدہ سفر میں وہ تو بڑے جوش و خروش میں ہوتا، مگراس کا ذہن اس کا ساتھ دینے سے صاف انکار کردیتا۔

وہ کھانے پینے کا بہت شوقین تھا، غذا کی مقدار تو بہت نہیں ہوتی تھی، مگر وہ اپنے شوق کی چیزیں اپنے سامنے دسترخوان پر دیکھ کرمحظوظ بھی ہوتا اور اپنی اشتہا کو چمکارتا بھی رہتا۔مگر
ستم ظریفی اس کا مسلسل پیچھا کرنے سے باز نہیں آئی۔ میں واقف تو تھا،مگر بے دھیانی میں، میں نے پوچھ لیا کہ کھانا تو رغبت سے کھایا جاتا ہے نا......؟

وہ بڑے کرب سے مسکرایا۔

''کھانا......؟ کھانا تو میں نے پچھلے برس کھایا تھا، اب تو بس Liquid ہے......''

میں یہ سن کر اندر سے کانپ گیا اور اپنے آپ پر بہت مشکل سے قابو پا کے اس کو تسلی دی کہ وقتی دور ہے، اور تمہارے لئے ضروری بھی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی صحت یاب ہو جاؤ گے، پھر ہم لوگ تمہارے ہاں ایک شاندار دعوت پر یکجا ہوں گے۔انشاء اللہ۔

وہ بس مسکرا کر رہ گیا۔اس کے مسکرانے کی آہٹ میں نے فون پر سنی۔

حسین الحق کا واسطہ صرف لکھنے پڑھنے سے نہیں تھا بلکہ وہ اپنی سوچ اور بساط بھر عمل کے اعتبار سے ایک دردمند انسان اور ایک محب وطن ہندوستانی بھی تھا۔وہ ملکی، غیرملکی حالات پر جم کر اظہار خیال کرتا جس کے پیچھے اس کی مسلسل سوچ کارفرما ہوتی تھی۔ وہ ہر ہندوستانی کے لئے فکر مند رہتا تھا، یہاں بھی اس کی سوچ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ایک مذہبی خانوادے سے تعلق رکھنے کے باوجود اور ایک عملی مسلمان ہوتے ہوئے بھی وہ ایک پختہ سیکولر ذہنیت کا مالک تھا۔وہ چیزوں کو ایک وسیع تناظر میں دیکھتا تھا، اس کی تحریروں سے بھی یہ بات عیاں ہوتی ہے۔

حسین الحق ایک بھرپور شخصیت کا مالک تھا، وہ جس محفل میں بھی بیٹھتا تو وہاں اسے مرکزیت حاصل ہو جاتی تھی اور اس کے لئے وہ کوئی کوشش نہیں کرتا تھا، بلکہ اس کی علمی فضیلت اور باتوں کو صحیح انداز میں رکھنے کے انداز بلکہ ہنر نے اس کی شخصیت میں جو وقار پیدا کر دیا تھا، اس سے ہم لوگوں کو رشک ہوتا تھا۔ جو چیزیں اس کے مطالعہ میں آ جاتیں، وہ ہمیشہ یاد رہتی تھیں، یہ ذہانت فطری ہوتی ہے اور ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ حسین الحق کو زندگی

کے آخری ایام میں غالب ایوارڈ اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملے اور مجھے اس کا بہت افسوس ہے کہ وہ ان اعزازات سے لطف اندوز نہیں ہو سکا۔ یہ ایوارڈ اس کو بہت پہلے مل جانا چاہئیں تھے، ادب کے میدان میں اس سے کم تر درجے کے لوگوں کو یہ ایوارڈ مل گئے۔ میں اس تنازعہ میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ہر ایوارڈ کے پیچھے کیوں، کیا، کیسے اور کب وغیرہ کے سوالات چھپے رہتے ہیں، خود میرے ایوارڈ مختلف قسم کے غیر ضروری تنازعہ کا شکار ہو چکے ہیں۔ حسین نے ان چیزوں کی کبھی پروانہیں کی، گو اندرونی طور پر اسے نظر انداز کرنے کا غم ضرور تھا جو کبھی کبھی ہم قریبی دوستوں کے سامنے چھلک پڑتا تھا۔ لیکن ان چیزوں کا اس کے لکھنے پڑھنے پر کبھی اثر نہیں پڑا، اس کے لکھنے کی رفتار ہمیشہ تیز رہی، اس میں کوئی کمی نہیں آئی، اور اس نے اپنے بعض ہمعصروں کی طرح ایوارڈ ہی کو اپنی منزل قرار نہیں دیا۔ ادب جیسی نفیس شئے کو ایوارڈ جیسی غیر ضروری چیز سے ملوث کرنا ادب کے ساتھ ایمانداری ہے بھی نہیں۔ اس نے اس نکتے کو زندگی بھر اپنائے رکھا۔ ایوارڈ سے کسی ادیب کا قد ناپا نہیں جا سکتا، اس سے صرف تسلیم کیے جانے کی تشفی ہوتی ہے۔

حسین الحق تم وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا، لیکن یادیں باقی رہ جاتی ہیں کیوں کہ وہ کبھی نہیں جاتیں، ان یادوں کی موجودگی میں ہم تمہیں کبھی بھلا نہیں پائیں گے، ان یادوں سے ہم اپنا پیچھا کبھی چھڑا نہیں سکیں گے۔

تم نے جانا تو طے کر لیا تھا، مگر یہ امید ہرگز نہیں تھی کہ تم اچانک محفل کو یوں سونی کر جاؤ گے، وہ بھی ہمیشہ کے لئے۔

حسین الحق کا ناول ''اماوس میں خواب''

گہرے سماجی اور سیاسی شعور کا ناول

علی احمد فاطمی

موبائل : 9415306239

پریم چند نے ناول نویسی کے گہرے تجربات کے بعد ۱۹۳۱ء میں لکھے ایک مضمون ''ناول کا فن'' میں ایک عجیب سی بات لکھی۔ ''ناول کی کوئی تعریف ایسی نہیں ہوسکتی جس پر سب لوگ متفق ہوں۔'' یہ خیال اتنا ہی عجیب ہے جتنی کہ زندگی، اسی لیے زندگی کہ جامع و مکمل تعریف کر پانا بھی مشکل ہی نہیں ناممکن سا لگتا ہے۔ تبھی تو کسی نغمہ نگار نے کہا تھا..... ''زندگی کے رنگ کئی رے'' اور ہر رنگ کے اندر کئی رنگ ہوتے ہیں جیسے ہر کردار کے اندر کئی کردار نرم گرم رہتے ہیں۔ شاید اسی لئے پریم چند نے اپنے اسی مضمون میں آگے کہا...... ''میں ناول کو انسانی کردار کی مصوری سمجھتا ہوں۔ انسان کے کردار پر روشنی ڈالنا اور اس کے اسرار کھولنا ہی اصل ناول کا مقصد ہے۔'' ناول کی اور بھی تعریفیں ہوسکتی ہیں اس لئے کہ جو صنف سب سے زیادہ زندگی اور سماج کے درمیان ہو کر گزرتی ہے وہ ناول ہی ہے۔ یہاں کردار سے متعلق پریم چند کی تعریف بطور تمہید اس لئے پیش کر دی کہ زیر نظر ناول ''اماوس میں خواب'' جو ممتاز ناول نگار حسین الحق کا تازہ ترین ناول ہے، کا پہلا جملہ کردار ہی سے متعلق ہے۔ دیکھئے ناول کا پہلا جملہ۔ ''اسمٰعیل کو نیند نہیں آرہی تھی''۔ جملہ بے خوابی کا ہے لیکن گفتگو خوابوں سے آگے بڑھتی ہے۔ بند آنکھوں کے خواب میں انسان اکثر معصوم ہوتا ہے اور مظلوم بھی لیکن بے خوابی میں بقول مصنف ''جاگتا ہوا آدمی تو ایک مداری ہے چہرے پر جھوٹا ماسک لگائے ہوئے۔'' اور پھر ایک سوال۔۔ ''قصور کس کا ہے، خواب کا یا بیداری کا'' جواب در جواب، یہ قصہ کی تمہید ہے اس لئے کہ اسمٰعیل کو نیند نہیں آرہی ہے۔ نیند نہ آنے کا جواز بھی تو پیش کرنا ہے بہر حال رات کے خواب اور بے خواب اور بد خواب دن کے زندگی کے پیچ و خم اور سرد و گرم سے ہی جنم لیتے ہیں اس لیے یہ تمہید بے خوابی کی کم ہے بلکہ اس کی زندگی کی زیادہ ہے جہاں عجب عجب طرح کے خواب وجود میں آتے ہیں۔ ٹکراتے ہیں اسی طرح جیسے زندگی میں کردار ٹکراتے ہیں۔ ان کے جذبات و خیالات ٹکراتے ہیں لیکن حقیقت اور خواب کے تعادمات میں فرق ہوا کرتا ہے، وہ فرق ہی سوال بنتا ہے۔ ''وہ کون ہے جس کا خواب پر اختیار چلتا

ہے؟'' ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ جو براہ راست زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ جس میں اب امّاں بھی داخل ہوتی ہیں لیکن یہاں ایک سوال ''یعنی خواب میں بھی خدااور شیطان آدمی کہیں نہیں۔؟''

آدمی کی غیر موجودگی سے اداسی، اسی لئے اماں کی بات بھی جی کو نہیں لگتی، اس لئے کہ زندگی میں خدااور شیطان کے درمیان اور بھی بہت کچھ ہے۔ رومان ہے ہیجان ہے، قہقہوں کا ترنم ہے اور مونالیزا کا حزن آمیز تبسم بھی اور پھر یہ معنی خیر جملہ بھی۔۔'' یہ سارا کچھ خدااور شیطان کی توجہ سے الگ کا کچھ معاملہ تھا جو زندگی بھر سمجھ میں نہ تو آسکا مگر اسی آس میں نیند بھی آجاتی تھی اور اسی کے سہارے دن کا پہاڑ بھی کٹ جاتا تھا۔''

زندگی کی ناسمجھی یا عدم تفہیم اور عدم تکمیل یا مکمل پن کی تلاش میں سرگرداں تھکا دینے والا سفر نیند کی آغوش میں پہنچا دیتا ہے۔ کیا عجیب معاملہ اور غریب فلسفہ ہے لیکن ہے تو فلسفۂ حیات ہی، جہاں اسمٰعیل کا روز ہنسنا اور رونا اور پھر تلاشِ حیات میں نکل پڑنا بھی۔ اس لئے کہ اس کے پاس کچھ خواب تھے خواب سے حقیقت کا عجب رشتہ ہوتا ہے۔ ایک سفر رومان کا ایک سفر حقیقت کا، اس لئے کہ کوری حقیقت اکثر انسان کو قنوطی اور یاسیت زدہ بنا دیتی ہے لہٰذا اس میں تھوڑی سے مثالیت اور تھوڑا سا رومان ضروری ہوتا ہے شاید اسی لئے ناقدین نے تصور اور تخیل کو بھی بہت اہمیت دی ہے۔ زندگی جیسی ہے ویسی پیش کرنا کافی نہیں، تصور میں بسا زندگی کا نقشہ بھی ناول میں آنا چاہئے جس میں دھوکہ یا فریب تو ہوتا ہے لیکن زندگی اور حقیقت کا ایک رنگ یہ بھی ہوتا ہے کہ دریدؔا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

''ہر ادبی تخلیق ادب کے پیمانوں سے دھوکہ کرتی ہے اس لیے کہ حقیقت ایک سی نہیں ہوتی وہ بھی دھوکہ کرتی ہے پس ناول کا روپ بھی ایک جیسا نہیں ہوسکتا۔''

شاید اسی لئے حسین الحق کے اس ناول کا ابتدائی روپ قدرے بدلا ہوا سا لگتا ہے جہاں ابھی اسمٰعیل گم ہے زندگی اور اس کے فریب زدہ جال میں پھنسا ہوا اسمٰعیل، ساتھ ہی اس کا ہمزاد، اچھی بات یہ ہے کہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے باوجود اس کے کچھ خواب ہیں جن کے سہارے وہ اپنے آپ کو مطمئن کر رہا ہے اور اپنے ہمزاد کو بھی، خواب اور حقیقت، اسمٰعیل اور اس کے ہمزاد کے مابین کا تصادم اور فلسفہ، فلسفہ طرازی کو کچھ لوگ غیر ضروری کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ کہا گیا ہے کہ فلسفہ کو قصہ اور کردار کے تخلیقی عمل سے پھوٹنا چاہئے، فلسفہ کو بالائی سطح پر نہیں آنا چاہئے وغیرہ اس سلسلے میں بھی مختلف بحثیں ہیں۔ لارنس نے عمدہ فکشن کو سراسر فلسفہ ہی قرار دیا۔ ورجینا وولف نے کہا کہ جنہیں فنکارانہ امکانات کہتے ہیں اس میں وسعت، گہرائی اور تاثر فلسفہ کی وجہ سے ہی آتا ہے۔ یہ بات سچ ہے لیکن ایک سچ یہ بھی ہے بقول گرہم گرینؔ لکھنے کے لئے بڑے عقائد بھی ناول کے شعور یا لاشعور میں ہوتے ہیں۔

وریدا کی فنکاری والی بات بے حد اہم ہے کہ ناول نویسی پہلے ایک فن ہے بعد میں فلسفہ اگر یہ ایک مقدمہ یا محاکمہ حقیقت پر مبنی ہے تو یہ بحث آگ کا دریا یا کئی خواب تھے وغیرہ کے حوالے سے اٹھائی جاسکتی ہے لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ قرۃ العین حیدر تو بنیادی طور پر فنکار ہیں اور شمس الرحمٰن فاروقی نقاد۔ دونوں کی طرز تحریر اور تخلیقی عمل میں فرق ہے ایک ناول اپنی فلسفہ طرازی کے حوالے سے بعض کمزوریوں کے باوجود کامیاب ناول ہے دوسرا میرے نزدیک کم کامیاب، خیر یہ بحث پھر کبھی۔ حسین الحق کے اس ناول کی ابتدا میں کواب اور حقیقت کے درمیان کا فلسفہ کچھ زیادہ ہے یا سریت یا اسمٰعیل کی زندگی کی اذیت۔ کچھ ہے جس نے خاص طور پر متوجہ کیا، اگر یہ اذیت ہی ہے تو اذیت کا بھی اپنا ایک چکرویوہ ہوتا ہے جس میں شعور اور لاشعور کے تار الجھتے چلے جاتے ہیں۔ پھر ایک دور نمودار ہوتا ہے، کانگریس اور لیگ کا دور، جہاں مہاتما گاندھی اور پنڈت یعنی نہرو اور پھر اس دور کی کشاکش، کھینچ تان کی سیاست اور یہ تخلیقی جملے۔

’’بارشوں کا پانی ڈھلان کی طرف جاتا۔ ہوائیں اوپر سے نیچے آتیں، پھول درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گرتا۔‘‘

زمین کی کشش ایک فطری عمل اور پھر زمین سے بے دخلی اور دوری ایک غیر فطری جذباتی عمل اور پھر ایک سوال ’’کیا کسی چیز میں زمین سے بھی زیادہ کشش ہے؟‘‘ اور فوراً یہ جملہ ’’وہ زمانہ سوالات کا تھا سوال سر اٹھاتا اور جواب نہیں ملتا تھا‘‘ سوالات کا زمانہ کم و بیش ہر دور میں ہوتا ہے بس فرق یہ ہے کہ غور و فکر کے سلسلے کل زیادہ تھے، آج کم ،کل جواب نہیں ملتے تھے، آج سارے جوابات از خود میڈیا میں بازار میں رقص کرتے پھر رہے ہیں، اس لئے سوالات کی گنجائش کم سے کم رہ گئی ہے۔ ہم نے سوچنا چھوڑ دیا اب مشینیں سوچ رہی ہیں۔ یا ملٹی نیشنل کمپنیاں اور ہم خواب خرگوش میں مبتلا ہیں۔ پہلے ہم گھر کے لئے بازار جاتے تھے اب بازار خود چل کر گھر آ گیا ہے۔ سب چیزیں سب سہولیتیں لئے ہوئے، اس لئے اب بازار زیادہ سوچ رہا ہے اور انسان کم۔ انسان کے پاس بس خواہشیں ہیں آرزوئیں ہیں جو آگے بڑھ کر لالچ میں بدل گئی ہیں۔ آج اس جملے کی اہمیت زیادہ ہوگئی ہے۔ ’’ماتا! میرے من کو شانتی دو‘‘ اس شانتی کی تلاش میں بھی عام آدمی بازار چلا جاتا ہے۔ ایک الگ قسم کا بازار جہاں رام اور رحیم دونوں دکانیں سجائے بیٹھے ہیں ہر جگہ بازار ہے۔ اسمٰعیل کے بعد ایک نسوانی کردار رکمنی داخل ہوتا ہے۔ بال دواہ اور بیوگی کے ساتھ۔ اس مقام پر کرداروں کا ارتقاء ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو ناول بھی آگے بڑھتا ہے اگر چہ گفتگو ماضی کی ہوتی ہے دو قدم پیچھے کی، یہ ناول کی اپنی ایک تکنیک ہوا کرتی ہے کہ پیچھے جا کر بھی اپنی ایک ارتقائی

تصویر بناتا ہے۔اس دھندلی تصویر میں ابا بڑے ابا اور محلے کے کئی لوگ نظر آتے ہیں۔ریڈیو پاکستان سنتے ہوئے ،رات اور فسادات اور خوں ریز حادثات۔

لیکن اس میں بھی اسمٰعیل فکری سطح پر متحرک۔''رکمنی مندر کے دروازے پر کیوں کھڑی تھی۔؟''،عشق نہ سیکھے ذات پات، عشق اور سیاست دونوں میں کشاکش جاری ہے مصنف نے دل وار دماغ کی محبت اور سیاست کو ایک ربط دیتے ہوئے پس منظر کو معنی خیز بنانے کی عمدہ کوشش کی ہے، یہ جملہ دیکھئے، رکمنی کہتی ہے۔

''روز دیکھتے ہو تو بات کیوں نہیں کرتے''

''تم ہندو ہو!''

تو؟''

تم نرک میں جاؤ گی!''

''نرک میں تو میں ہوں ہی اب اس سے بڑا نرک کیا ہوگا؟''

نفرت کا محبت کا غلبہ، یہ محبت کا سرور ہے یا مجنونانہ محشر خرامی؟ رکمنی یہ کہنے پر مجبور ہے۔''میرے لئے تو آدمی کا بھی کال ہے۔'' آدمی ہی ان دونوں کو مخالف سمت جانے کے لئے مجبور کر دیتا ہے لیکن عورت کا ایک لمس اسمٰعیل کو بامعنی اور بامقصد بنا دیتا ہے۔یہ جملہ بھی دیکھئے

''پہلی مرتبہ عورت کا لمس حاصل ہوا تھا۔زندگی کا پہلا لمس اسمٰعیل اپنے آپ کو اہم اور بامعنی سمجھنے لگا تھا۔''

یہاں سے ناول تخلیقی سطح پر ایک ہلکا سا موڑ لیتا ہے۔حسین الحق پختہ اور تجربہ کار تخلیق کار ہیں۔انہیں علم ہے کہ محض سیاست، مذہب اور فلسفہ سے ناول کی تخلیق نہیں ہوتی اور قاری کی وابستگی میں جب تک انسانی رشتوں کا سوز و ساز اور لطف و گداز شامل نہ ہو بات نہیں بنتی شاید اسی لیے اسمٰعیل اور رکمنی، راج نرائن اور اندرا گاندھی متوازی طور پر چلتے ہیں۔لیکن ایک فاصلے کے ساتھ۔یہ فاصلہ رکمنی سے بھی بڑھتا گیا اس لئے کہ وہ ہندو تھی بیوہ تھی لیکن پانی تو اپنا راستہ خود بناتا ہے اب رکمنی کی جگہ تمکنت بی بی آگئیں، فاصلے پھر کم ہونے لگے اور بنگلہ دیش اور تمکنت کا فیصلہ ایک انداز میں ہو گیا یعنی مشرقی پاکستان اور تمکنت دونوں ایک ساتھ مر گئے۔سیاست نے گھروں کے ساتھ دلوں کو بھی ویران کر دیا ناول میں یہ ویرانی ایک خاص قسم کی روشنی کے ساتھ آنی چاہئے۔حقیقت کی روشنی قرات کا جمال بن کر ابھرتی ہے۔ایک ناول نگار ہزار پختہ و بالیدہ ہو لیکن قاری بھی اتنا ہی پختہ اور بالیدہ ہو یہ ضروری نہیں

اس لئے ذہین اور ماہر فنکار تخلیق کی ابتدا روانی اور دلکشی سے کرتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ سنجیدگی اور گہرائی اپنی رفتار پکڑتی ہے۔ جس طرح جہاز اپنی رفتار پکڑنے کے لئے دیر تک زمین سے چپک کر دوڑتا رہتا ہے البتہ پانی کا جہاز بہت دیر تک اپنے مدار میں چکر لگاتا ہے تب آگے بڑھ پاتا ہے۔ اس ناول کی ابتدا میں بھی حرکت دائروی زیادہ ہے۔ اسمٰعیل کا کردار و عمل ابتدا میں غیر مربوط ہے، واقعات کے بھنور میں گھرا ہوا۔ واقعات زیادہ ہیں، واقعات کردار تک پہنچیں تو پہنچیں لیکن ابتدا کے دو تین ابواب میں کردار واقعات تک بہت کم پہنچتا دکھائی دیتا ہے۔ اب اس رویہ کو جو چاہے نام دے دیا جائے۔۔۔۔۔ درمیان میں سیاسی گفتگو آتی ہے۔ سیاسی لیڈران کا ذکر بھی بنگلہ دیش کے بعد کا پاکستان، ہندوستان اور خود بنگلہ دیش، تثلیث کی، تقلیب کی اور تقلیدی سیاست، نفرت اور فرقہ داریت بھی، اس لئے اسمٰعیل کو وہم نہیں بے نام خوف ہے۔ اسمٰعیل ایک بڑے متوسط طبقہ کا نمائندہ ہے اسی لیے خوف و وہم کا تعلق انفرادی نہیں اجتماعی ہے۔ جو اس طرح سوچ رہا ہے ؎

''ساری اٹ پٹی صبحوں اور شاموں کے بیچ کوئی نہ کوئی رات ایسی ہو جاتی جب چاہنے اور نہ چاہنے کے باوجود کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے اور کچھ نہیں ہوتا۔''

ایسے میں محبت کی سانس ٹوٹ رہی ہے، مصنف نے محبت اور سیاست کو ایک رشتہ جاں سے جوڑ کر اس میں عمدہ تخلیقیت اور معنویت پیدا کی ہے۔ یہ جملہ دیکھئے ؎

''اور تمکنت؟ جو مر گئی۔ اور پاکستان جو صرف مرا نہیں اس کی لاش کو بیچ سے دو ٹکڑے کر دیا گیا.........
کون کس کی تمثیل ہے؟''

رکمنی بھی تمثیل ہے تمکنت بھی۔ اور ایک سوال۔ ''نظریہ زیادہ اہم ہے یا جان؟'' تمکنت مر گئی، رکمنی اگیات واس میں چلی گئی اور ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی لگ گئی۔ سیاست کی ایمرجنسی اور محبت کی جبریہ پابندی جو سیاست سے بھی زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ غیر فطری، غیر جبلی جو انسان کو پاگل کر دیتی ہے۔ یا انتقام سے پُر کر دیتی ہے اور کبھی کبھی دونوں ہی صورتیں نمودار ہوتی ہیں۔ اسمٰعیل کا کردار اس کے آس پاس ہے۔ ویران سپاٹ اور نئی بوکھلاہٹوں کو لپیٹے ہوئے، حقیقت نے ایک عجیب سی مماثلت کے ساتھ اس کو یوں بھی پیش کیا ہے ؎

''راج نارائن نے اندرا گاندھی کو ہرا دیا تھا۔ کیا میں راج نارائن ہوں؟ میں نے تو اندرا گاندھی یا خواب والی بی بی کیا۔ کسی کو بھی ہرانے کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ محبت میں اسی اقرار سے بات شروع ہوتی ہے۔ کہ عاشق کو ہارنا ہے۔ مگر میرے اندر جو سوچ کی کئی لہریں ایک دوسرے کو کاٹتی گذرتی ہیں۔ ان کا کیا

کروں؟''

اس کیا کروں میں مجاز والی جھنجھلاہٹ (اے غم دل کیا کروں) ضرور ہے لیکن اس سے قدرے الگ یا شاید اس سے آگے کی یا پھر پیچھے کی اس لئے کہ مجاز میں ستارے پتھر سب کچھ نوچ لینے کی ہمت تھی لیکن اسمٰعیل میں بقول مصنف۔۔۔۔''اسمٰعیل کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔'' حالانکہ کچھ نہ کرپانے کی بھی ایک مخصوص تڑپ ہوا کرتی ہے پھر بھی شاعرانہ تڑپ اور حقیقت پسندانہ تڑپ میں فرق تو بہر حال ہوا کرتا ہے۔ناول میں یہ تڑپ اور چھٹپٹاہٹ پھیل کر مزاحمت واحتجاج کا باریک لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ایک وسیع سیاق میں جذب و پیوست ہوتی ہے جو اس ناول میں بھی پھیلتی ہے۔یہ اندازِ دگر ایک وحدت اختیار کرتی ہے۔

براہ راست سیاسی اشاروں واقعوں سے گذرتا ہوا ناول اسمٰعیل کی کشمکش میں اضافہ ہی کرتا ہے ہو تاریخی کشمکش، جغرافیائی کشمکش جیسے فلسفۂ وقت کے بھنور میں پھنس کر ایک عام آدمی کشمکش کا شکار ہوتا ہے۔اس طرح رکمنی کے بدلاؤ کی تلاش تھی جو نظر نہیں آرہی تھی لیکن پھر اچانک باندازِ دگر نظر بھی آجاتی ہے۔بال ودواہ، زنا بالجبر، جوانی میں گیروا لباس اور بھجن کیرتن اس کی کہانی کہے دیتے ہیں اور رکمنی دیکھتے دیکھتے سادھوی رکمنی بن جاتی ہے اس لئے کہ سنگھ والوں کی نظر اس پر پڑ گئی تھی۔اسمٰعیل کی عاشق اب مسلمانوں کے کلاف زہر گھولتی تھی۔جب سادھوی نہیں تھی تو بول وچن میٹھے تھے۔سادھوی بنی تو کڑوی ہوگئی۔اس کے بدلے ہوئے روپ کو مصنف نے اس طرح پیش کیا ہے۔

''شیر کی طرح گرجتی اور بلبل کی طرح من موہ لیتی ہے۔خاص طور پر جب وہ مسلمانوں کے خلاف بولتی ہے تو لگتا ہے کہ اس پر آکاشوانی اتر رہی ہے۔ایسی سرلتا کے ساتھ مسلمانوں کا مذاق اڑاتی۔ان کے دُش کرموں کا بکھان کرتی اور ان کے نیچے پن کو اجاگر کرتی کہ مجمع شردھا بھاؤ اور سنتشٹی سے لت پت ہو جاتا۔''

جبر کس کا قہر کسی پر۔یہ ہے زندگی کا تضاد، لیکن اسمٰعیل کو اب بھی رکمنی کا انتظار ہے۔مگر جب حالات سے واقف ہوتا ہے تو اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ سب اس کے کرچی کرچی خواب کی تشبیہہ ہے اچھی بات ہے کہ جلد ہی مصنف ان انفرادی نوعیت کے واقعات کو قوم و ملک سے جوڑ دیتے ہیں جس سے ناول کا کینوس بڑا ہوتا ہے۔

''لیکن وہی پرانی باتیں، پرانی گھاتیں، پرانا انداز۔'' یہ ایک بلیغ اشارہ بھی ہے کہ انسانی تضادات ہمیشہ سے رہے ہیں۔ازل سے ابد تک رہیں گے۔بس ذرا وقت کے ساتھ ان کی شکلیں بدل جاتی ہیں ورنہ قاتل

اور ظالم کب بے نام ونشان ہیں۔کیا جملے ہیں۔

''جاگ! مجھے پال پوس کر بڑا کرنے والی زمین جاگ.........دیکھ تیری کوکھ پر حملہ کرنے والوں کے صرف رنگ بدلے ہیں۔ڈھنگ وہی ہے۔''

دوسرے باب میں ایک کردار اور نظرت آتا ہے۔'مبشر رجائی' یہ پڑوسی یعنی ایران میں ہونے والے بدلاؤ کا استعارہ ہے خصوصاً اس کی راتیں، تقسیم وتبادلہ کی راتیں جن سے کسی طرح بچ گیا تھا،مبشر رجائی، ناول کا ایک نیا موڑ سامنے آتا ہے لیکن مسائل وہی راتیں بھی وہی اور زندگی بھی وہی بس وقت بدل گیا ہے۔ادھر پنجاب کا میاں میر والا بھی دامن پکڑے ہوئے ہے۔اردو کے ناولوں کی ابتدا میں بھی ماضی جھلکتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اماوس کا خواب میں ماضی قریب زیادہ ہے جو حال سے جڑا ہے۔ایک کمیونسٹ دوست کے ذریعہ مصنف کا یہ معنی خیز جملہ۔''۳۷/برس کے بعد بھی اگر عادتیں نہ بدل سکیں تو تباہی سے کون روک سکتا ہے۔''اب ذرا جواب ملاحظہ کیجیے۔

''ہزار برس کی عادت ۳۷/برس میں کیسے ختم ہو جائے بھائی۔''اس موڑ پر مکالمے جاندار ہیں جو ایک تاریخ بن کر سامنے آتے ہیں، کرداروں کی سوچ بدل دیتے ہیں جیسے رکمنی بدل گئی۔وہ عورت تھی اس پر ہوئے مظالم دوسرے تھے۔اگر چہ روایتی تھے لیکن اقلیت کی سیاست ہندو مسلم کی سیاست اور نفرت میں مذہب داخل ہو جاتا ہے وہ مذہب جو نفرت نہیں سکھاتا اور اسی کے نام پر پورا کھیل ہوتا ہے۔جو میاں میر والے جیسے کرداروں کو بدل دیتا ہے، مجرم مقرر بن گئے.........وہ مذہبی مقرر اسمٰعیل کی یہ سوچ کس قدر طنز بھری ہوئی ہے۔''اگر مجرم وہی بننے لگا جو وہ بن گیا تو پھر کون ہے جو اپنی دنیا چھوڑ سکے۔'' کچھ اس لیے کہ زمین نہیں چھوڑ سکتے تو وقت نے انہیں کیا سے کیا بنا دیا۔آزادی اور تقسیم کے درمیان کا یہ جملہ اپنے آپ میں کتنی کہانیاں چھپائے ہوئے ہے۔

''وہاں سینکڑوں کوس چل کر موت خریدی جاتی ہے۔یہاں گھر بیٹھے موت مل جاتی ہے۔''ان جملوں میں جو اثر ہے وہ ان سوالوں (ص ۴۰) میں نہیں ہے جو مصنف نے اٹھائے ہیں۔تخلیقی بیان اور اظہار کی روانی میں مصنف کی دخل اندازی اور فلسفہ طرازی جتنی کم سے کم ہو اتنا ہی بہتر ہے یہ بات حسین الحق سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ وہ تخلیق کار کے علاوہ ادیب اور ناقد بھی ہیں، مفکر اور دانشور بھی۔اسی دور سے اسمٰعیل بھی گذرا اور مبشر بھی لیکن معصوم وشریف اسمٰعیل صرف سوچ کا شکار رہا اور مبشر جیسے زمانہ شناس لوگ بدلتے بگڑتے حالات میں بھی کچھ بننے کا خواب دیکھتے ہیں۔آگے کے جملے (ص ۴۳) جو مبشر کی زبان سے نکلے ہیں وہ بھی مصنف کے فکری جملے

زیادہ لگتے ہیں ۔کہیں کہیں کچھ داستانوں کا اسلوب بھی درآتا ہے جس میں طلسم کے ساتھ سریت بھی سر اٹھانے لگتی ہے پھر جب جادوٹوٹتا ہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تقسیم کی داستان نے کیسی کیسی بے رحم سچائیاں اُگلی ہیں۔ خون بھری سچائیاں جن کا سلسلہ دور تک پھیلتا چلا جاتا ہے کہ چھ سالہ شاہ عالم اسی دھوئیں بھرے ماحول میں آنکھیں کھولتا ہے فسادات میں اس کا باپ مار ڈالا جاتا ہے یہ جملے دیکھئے۔

''آنگن میں چھتنار درخت گرا، فاختہ کی چیخ بلند ہوئی، بلبل کی ٹانگیں چیر دی گئی چراغ بجھ گئے۔''

یہاں درخت، فاختہ، بلبل، چراغ وغیرہ سب کے سب روشن ہیں لیکن وقت کے جبر کے تحت کبوتر دیکھتے رہے اور دتا رام کی جھونپڑی، عابدہ کا شیاما کا مکان ایک ساتھ جل گئے۔ دتا رام، عابدہ، شیاما یہ سب عام معصوم مظلوم لوگوں کی علامتیں، عام انسان، عام مسافر اور اسمٰعیل مبشر اور میاں میر والا کے مابین مکالمے، حسیت، معنی خیزی، طریقہ کار اور نظریہ بدلنے کی ضرورت لیکن اس کا کیا جائے کہ ''سب راستے بند ہیں۔اور ملاقات کا کوئی امکان نہیں۔'' ملاقات محبت کی صلح وآشتی کی۔ جملوں کی کاٹ اور معنی کی دھار نے مکالموں میں جان پیدا کردی ہے، ایک ایک لفظ میں تاریخ سمٹ آتی ہے ساتھ ہی درد وکرب بھی جو آج کی زندگی اور حالات کے بنیاد گذار ہے جسے ناول نگار نے نئے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے ۔خاص بات یہ ہے کہ پورے ناول میں دردمندی ہے اور سماجی اور تاریخی شعور بھی ناول کا دامن وسیع تر ہے۔ایک کامیاب ناول نگار کہیں نہ کہیں یہ احساس تو رکھتا ہے کہ دھار اور کاٹ کا اثر ضائع نہ ہو۔معنی کی تلوار کند نہ ہونے پائے وغیرہ۔

تیسرے باب میں جنگل، پناہ گاہ یا مقامِ فنا تاریکی کے ساتھ ہی فوجی گاڑیوں کی روشنی بھی یہاں ایک عالمِ تحیر، شورہ پشت آسمان، ضعیف انسان اور وقت جو دونوں کے درمیاں سب سے بڑا ظالم ہے اور منصف بھی اور باب ان جملوں پر ختم ہوتا ہے۔''سارے میں آواز مسلسل گونج رہی تھی اور اسمٰعیل سویا ہوا تھا۔'' مصنف نے اس گونج اور نیند میں بھی معنی پیدا کئے ہیں۔اس لیے کہنا ہوگا کہ حسین الحق کے اس ناول کا اسلوب ان کے سابقہ ناولوں سے مختلف نظر آتا ہے۔ یہ اختلاف ناول کی معنویت میں اضافہ ہے لیکن تخلیقیت اور بیانیہ کیفیت میں اضافہ کرتا ہے یا نہیں یہ باتیں غور طلب ہی اس لئے کہ بعضوں کی نظر میں پریم چند پرانے ہوچکے ہیں اور ان کے خیالات بھی پرانے جن کے خیال سے راقم نے مضمون کی ابتدا کی ہے لیکن ہم بھول جاتے ہیں کہ ظلم وفسادات انسانی سرشت میں شامل ہے جن کی اپنی کچھ بنیادی قدریں ہوتی ہیں اس لیے ان کے جسم تو بدل جاتے ہیں لیکن

روح نہیں بدلتی۔ادب کی بھی کچھ بنیادی قدریں ہوتی ہیں جو نہیں بدلتیں اسی لیے ناول زندگی، انسان اور انسانی معاشرہ سے الگ وجود میں نہیں آتا بلکہ کچھ زیادہ ہی قریب اور گھلا ملا ہے۔امریکی نقاد مثل ضرافہ نے کہا تھا۔''ادب کی وہ صنف جو سماج اور معاشرے کے درمیان سے ہو کر گذرتی ہے بلکہ گذرنا اس کی مجبوری ہے، وہ ناول ہے۔''

تیسرے باب میں اسمٰعیل سویا ہوا تھا، چوتھے باب کی ابتدا اس کی بیداری سے ہوتی ہے لیکن اس کی بیداری مشکوک ہے۔ یہ شک اختیاری نہیں بلکہ اس میں تاریخ وسیاست کا دخل ہے۔آگ کے دریا سے گذر جانے کے بعد اصل مسئلہ یہ تھا کہ اب کیا کیا جائے اور یہ سوالات بھی۔''زمین تیری پیاس کب بجھے گی؟'' ''انسانی زندگی کیا ہے؟'' یہ سوالات قصے کو فلسفہ بناتے ہیں۔اور فکشن کی تلخ حقیقت کے قریب لاتے ہیں۔ یقیناً ناول میں قصہ پن بھی تو ضروری ہوا کرتا ہے۔صرف تشنگی، تاریکی اور خوابیدگی سے زندگی کا سفر اور ناول کا سفر آگے نہیں بڑھتا۔بہر حال زندگی حرکت میں پنہاں ہے۔اسمٰعیل بھی حرکت میں آتا ہے اور پھر سوال جاگتا ہے۔''آدمی اپنے کو پورا کیوں نہیں کر پاتا، آدھا ادھورا کیوں جیتا ہے؟'' لیکن اپنی زندگی پر اعتماد اس کا چونکنا ایک خوشگوار تخلیقی عمل محسوس ہوتا ہے۔اور یہ خوشگواری ہی بھٹکے ہوئے اسمٰعیل کو جنگل میں پہنچاتی ہے وہ بھی فوجیوں کے ذریعہ جن سے وہ بے حد خوف زدہ تھا۔کچھ دیر خانقاہ کے مناظر، بھوک کی شدت پیٹ بھرنے کا سرور، بھرپور نیند اور مصنف کا یہ جملہ۔''جیسے کھویا ہوا بچہ اپنی ماں کے دامن میں آجائے۔'' ایک فضا بنتی ہے دھوپ چھاؤں کا کھیل، مقدس مقامات میں بھی فریب، یہاں کے اپنے مسائل، اسمٰعیل کا یہاں دم گھٹنے لگتا ہے۔ یہ دنیا ہر جگہ دم گھوٹنے والی کیوں ہوگئی۔ یہ قصور دنیا کا ہے یا اسمٰعیل کا یا اس کی فکر و نفسیات کردار میں ڈھل کر ناول میں جاری کشمکش کے جاری رہنے کا سبب بنتی ہے۔

''اس نے سوچا کہ اب پچھلی زندگی میں کیا رکھا ہے؟ اپنے شہر میں نہ کوئی بچا نہ کچھ بچا پھر کسی نئی زندگی کی شروعات کا کیا معنی؟ خیال آیا کہ جب یہاں پیٹ بھر رہا ہے اور سکون مل رہا ہے تو یہاں سے کہیں اور جانے کا کیا حاصل......؟ پھر بعد میں مرید ہونے کی خواہش جاگی تو جی میں آیا کہ اس رحم دل متولی میں کیا برائی ہے؟''

لیکن مشکل یہ تھی کہ اسمٰعیل پیری مریدی کے معاملات پر یقین نہیں رکھتا تھا پھر بھی پناہ وسکون کی ضرورت تو تھی کشمکش بھی تھی، حالات کے جبر نے اسمٰعیل کو ملنگ بنا دیا۔ یہاں بھی آوازوں کی گونج اور ناول پھر صحراؤں، سبزہ زاروں، ویرانوں یہاں تک کے فرعون نمرود تک پہنچتا ہے اور ایک بلیغ جملہ۔''ستم کی رُت میں ستم گر کی یاد۔'' اسمٰعیل سے حضرت اسمٰعیلؑ تک کا سفر اور یہ جملہ۔''ہر عہد میں کسی نہ کسی روپ میں......اسمٰعیل موجود رہتا ہے۔'' زندگی بھی رہتی ہے اس کے بارے میں بھی یہ جملے ملاحظہ کیجئے۔:

''عجیب چیز ہے یہ زندگی بھی دوب کی طرح دب دب کر نکلتی ہے۔ انکرتی ہے ابھرتی ہے، سر اٹھاتی ہے، نکھرتی ہے، زندگی انجمن آرا و نگہبان خود است''

اس لئے اسمٰعیل پورے اعتماد سے کہتا ہے۔ ''نہیں میں زندہ رہوں گا۔'' ناول کا یہ خوشگوار اور روشن پہلو ہے کہ ہزار ہزیمت اور کش مکش کے باوجود زندگی کی فتح ہوتی ہے اور جینے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ گھر بار گاؤں سب یاد آتے ہیں۔ یہ جملے دیکھئے۔

''جینے کی خواہش پہ اسے دنیا کا خیال آیا۔ دنیا یاد آئی تو پھر اپنا گھر یاد آیا گھر یاد آیا تو یہ بھی یاد آیا کہ موجودہ علاقے میں تو صرف چالیس پچاس برسوں سے رہ رہا تھا۔ دادا آئے تھے!''

اور یہ اہم جملہ۔ ''میں تو بہر حال یہیں کی مٹی سے جمنا ہوں۔'' اور یہ جملہ بھی '' آدمی ماضی تب بھولتا ہے جب ماضی حال اور مستقبل سے بہتر ہو۔ یہاں تو حال بے حال تھا اور مستقبل بے نشان۔''

ماضی کا درد اور پھر کرب، سوتیلے چچا کا مکر و فریب، ملنگ اور خانقاہ، مبشیر رجائی، بس ایک فیصلہ، ایک سفر اور۔ ناول دوسرے سفر کی طرف مڑ جاتا ہے جہاں ٹرین اپنی پوری رفتار کے ساتھ بھاگ رہی ہے جیسے زندگی کے واقعات، اسمٰعیل پھر پیچھے کی طرف بھاگتا ہے۔ ماضی در ماضی، خوف اور بے عملی اور اسمٰعیل کی خود کلامی، ماموں اور ممانی۔ ناول میں کچھ اور کردار اور ان کے مکالموں کی چہل پہل ہوتی ہے ناول میں ایک نیا موڑ آتا ہے۔ جب وہ پٹنہ میں ماموں زاد بھائیوں کے پاس آتا ہے پٹنہ یونیورسٹی میں ایم۔ اے میں داخلہ لیتا ہے، مصنف نے لکھا

''زندگی کا بالکل ایک نیا چہرہ اس کے سامنے تھا، کبھی کبھی وہ اپنے آپ سے سوال کرتا۔ ''اسمٰعیل تم کیا کر رہے ہو؟'' اندر اندر دوسرا سوال سر اٹھاتا۔ تم اور کیا کر سکتے ہو؟''

ایک ایسا کردار جس کا فساد میں سب کچھ لٹ چکا ہے۔ ماں باپ بیوی بیٹی سب کے سب زندگی سے رخصت۔ اذیت ہی اذیت۔ اب تھوڑی سی راحت، اپنوں کی جدائی، احساس و اضطراب کی ایک عجیب دنیا اور یہ جملے۔ ''اسے لگتا وہ جڑ سے اکھڑا ہوا درخت ہے۔'' ''گذرا ہوا کل اسے مسلسل پریشان کرتا رہا۔'' اور یہ بھی 'وہ سر جھٹکتا اور آنے والی صبح کے بارے میں سوچتا۔'' اچھی بات یہی ہے کہ حسین الحق شام رات کے بعد صبح کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ اکھڑے ہوئے درخت میں بھی امید آس کے اکھوے ضرور پھوٹتے ہیں یہی زندگی کا سفر ہے اور یہی اس کا مزاج۔ ناول میں زندگی آتی ہے۔ یونیورسٹی آتی ہے، خاندان، گھر رشتے کھلنے لگتے ہیں۔ ناول کا اصل مزاج زندگی کا مزاج ہے اور یہی اس کی شعریات اور جمالیات کہ وہ بہت دیر تک سنگینی اور غم گینی کو سر پر لے کر اور دل

میں رکھ کر آگے نہیں بڑھ سکتا۔؛اسی لیے ایک انگریزی نقاد نے کہا تھا کہ ۔ناول کا مواد الماری کی کتابوں سے نہیں زندگی کے انسانوں سے لینا چاہئے۔کلیم الدین احمد نے اس سے آگے کی بات کہی ہے کہ ناول محض قصہ نگاری نہیں ہے بلکہ تجربوں کے امکانات کا پتہ لگا تا ہے۔شعور کے نہاں خانوں کو ٹٹولتا ہے۔خیالات و جذبات کی پیچیدہ تاریک اور دشوار گزار راہوں کو منور کرتا ہے۔''خیال رہے کہ کلیم الدین احمد جیسے نقاد نے بھی منور کرنے کی بات کہی ہے۔اسی لئے ناول میں ضرورت سے زیادہ تاریکی قرات اور فہم کو بھی تاریک کر دیتی ہے۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ناول ایک روشن کتاب ہے جو زندگی کو روشنی عطا کرتا ہے۔اس ناول میں بھی روشنی آتی ہے کچھ بعد ہی سہی! ناول ایک نیا موڑ لیتا ہے۔اسمٰعیل تاریخ سے ایم۔اے کرنے کے لئے یونیورسٹی میں داخلہ لیتا ہے۔خیال رہے کہ تاریخ یعنی ماضی جسے وہ بھولنا چاہتا ہے، یہی تاریخ اسے یادوں کے جہان میں پھر لے جاسکتی ہے۔

اس کا خطرہ تو بنتا ہی ہے لیکن شہوار یعنی ماموں کی بیٹی طرح طرح سے اسمٰعیل کے بارے میں سوچتی ہے اور تاریکی میں روشنی کی ایک رمق بنتی ہے اور اسمٰعیل کی زندگی اور ناول کی زندگی کا بھی ایک نیا باب شروع ہوتا ہے ان جملوں کے ساتھ۔

''زندگی کی اسی دھوپ کے پیچھے اسمٰعیل آہستہ آہستہ اس نئے منظر نامے سے جہاں پوری طرح جڑنے لگا وہیں تاجرانہ ہوشیاری کی جگہ طالب علمانہ بے چینی نے بھی دھیرے دھیرے اندر سے انکرنا شروع کیا۔ اب منظر پس منظر سب کچھ اس کے یہاں ایک نئے سرے سے مرتب ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔''

یونیورسٹی کے پروفیسران اور شہر کے مقتدرین جن سے پورا بہار روشن تھا۔اسمٰعیل کو یہ روشنی راس آنے لگی انیل شرما سے دوستی، فیضان رسول سے یاری گنگا کا کنارہ،

''جو کچھ تم پر بیتا ہے مجھے لگتا ہے یہ سب میں نے کیا۔میں اپرادھی ہوں، مجھے چھما کر دو۔'' انیک شرما غیر معمولی محبت اور شرافت دیکھ کر اسمٰعیل کو ایک اور دوست اکشے یاد آ گیا۔بولا۔

''جانتے ہو انیل ! میرا سب سے اچھا دوست اکشے تھا۔وہ بھی مارا گیا۔''ہر شریف آدمی مار دیا جاتا ہے'' اتنا کہتے کہتے آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔گنگا پر شام جھک آئی تھی۔''

ناول کے کسی اکسپرٹ نے کہا تھا کہ ناول کرداروں اور مکالموں سے زیادہ آگے بڑھتا ہے۔یہ ایک بڑا سچ ہے کردار کے جملے اور مصنف کے تراشے باہم مدغم ہو کر ناول میں شعریت و تخلیقیت پیدا کرتے ہیں۔گنگا پر شام کا جھکنا ایسا تخلیقی جملہ ہے جو احساس کی پوری کہانی کہے دیتا ہے۔

شام کا ایک اور منظر بھی تھا جو دن دہاڑے ابھر رہا تھا۔ بھومیہار، گوالہ اور مسلمان، طالب علم نوجوانوں میں طبقاتی تقسیم کا احساس جو غیر فطری سا تھا وہ آہستہ آہستہ ان کے دماغوں میں جگہ بنا رہا تھا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ عشق کے معاملات جو فطری تھے وہ بھی دامن کشِ دیدہ و دل تھے۔ اور دونوں میں تصادم بقول مصنف۔ ''یہ ایک نیا منظر نامہ تھا اور اسمٰعیل کو جگہ جگہ اس کا سامنا کرنا پڑا۔'' لیکن اسے یہ بھی احساس تھا کہ وہ اپنا اتنا کچھ کھو چکا ہے کہ اب اس کے پاس کھونے کو کچھ باقی نہیں ہے مصنف اس احساس کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسمٰعیل سوچتا ہے۔

''کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ وہ اس ڈرامے کا کوئی پاتر، کوئی کردار نہیں ہے۔ وہ تو ایک جوکر ہے، ایسے ہی ایک لمحے میں ایک سوال نے سر اٹھایا کہ بہار میں مسلمان کی حیثیت بھی تاش کے ایک جوکر کی ہے کیا؟''

لیکن یہ تناظر محض مسلمانوں تک سمٹتا ہے۔ ساتھ ہی یہ جملہ بھی قلم سے نکلتا ہے۔

''میرے وطن، پیارے وطن ! تجھ پر دل قرباں پر تیرا کسی کو خیال نہیں، سب کو اپنے جتھے کی فکر ہے۔''

اور ناول میں فکر کی ایک نئی لہر دکھائی دیتی ہے وزیر اعلیٰ کباب کے شوقین تھے اسمبلی میں ایک کبابچی اور سات مسلمان منسٹر بھی، خانقاہ، قوالی، عرس سبھی کچھ لیکن اسمٰعیل کی سوچ کچھ اور تھی۔ ان سب سے الگ۔ وہ فرسٹ کلاس میں پاس ضرور ہوا تھا لیکن ٹاپ کیا تھا ایک گوالے نے اس لئے کہ بہار میں ان دنوں اور شاید آج بھی گوالے ہی ٹاپ پر ہیں اس لئے گوالے کو تو ٹاپ کرنا ہی تھا مگر اس کے ماموں زاد بھائی کی سوچ روایتی تھی۔ تعصب میں ڈوبی ہوئی۔ جوابی تعصب، دونوں طرف تعصب، تعصب ہی تعصب، اندر روح کی گہرائی سے ایک سوال پھوٹا۔ ''تو پھر بدلاؤ کیسے آئے گا؟'' ناول اسمٰعیل کی ذصات سے نکل کر ذرا پھیل گیا۔ اس پھیلاؤ میں کرپشن ہے، بے ایمانی ہے پوری ایمانداری کے ساتھ اور عشق کا دامن بھی، ناول میں پہلی بار ایک ایسا جملہ بھی پڑھنے کو ملتا ہے۔ 'بھنور سے ابھرتی آواز مدھم تھی اور ہونٹوں پر برستی تھرتھراہٹ کی بارش سے شرابور'' یہ جملہ ایک لمحے کے لئے قاری کے وجود کو بھگو دیتا ہے۔ ناول میں ایک خوشگوار بلکہ خوشبودار جھونکا آتا ہے لیکن فوراً ہی چلا جاتا ہے۔ ناول میں ایک نئے قسم کی جنگ شروع ہوتی ہے اس موڑ پر بھی ''اس رات اسمٰعیل پھپھک کر رویا اور تڑپ تڑپ کے جاگا۔'' ماں بیوی سب یاد آ گئے۔

محبت کے بعد سیاست، عشق کی کھڑکی کھلی تو ادھر بابری مسجد کا تالا بھی کھل گیا عشق غارت ہوا اور فرقہ واریت بے لگام ہوگئی۔ ساتھ علاقائیت، ذات پات کی عصبیت سب کے سب بے قابو ہو گئے۔ انیل کا کردار شوبھا

کا کردار دونوں میں محبت، محبت کے ساتھ سیاست، سیاست اس لئے کہ شو بھایا دو ہے اور انیل بھومیہار کبھی سنا تھا عشق نہ دیکھے ذات پات لیکن اب ذات پات پہلے دیکھا جاتا ہے، عشق بعد میں کیا جاتا ہے اور اسمٰعیل پریشان کہ ہندوؤں کے یہاں جو ذات پات کا نظام ہے وہ ان دونوں کے لئے مسائل پیدا کرے گا لیکن دونوں نے سب کچھ چھوڑ کر ساری دیواریں توڑ دیں البتہ یہ بھی ہوا کہ منظر سے غائب بھی ہو گئے۔

دیہات کا سفر، مسلمان اور بھومیہا کے رشتے، اہل بہار یا اہل ہندوستان یا بدلتا بگڑتا ہوا ہندوستان، شاید اسی لئے یہ جملہ۔ ''آج وہ سب کچھ موجود ہے جو پہلے غیر موجود تھا۔'' ایک جملہ ایسا بھی ''یہاں چماروں کے جھونپڑوں میں شرفاء نہیں جاتے۔'' اور پھر یہ معنی خیز اور طنز آمیز جملہ۔ ''جناب ! آپ ہندوستان میں ہیں۔'' جہاں پنگھٹ بھی ہے مرگھٹ بھی۔ سنگھ پریوار بھی اور صحیح النسب اشراف بھی۔

ناول فسادات سے متاثر ایک فرد سے شروع ہوتا ہے اور عام انسانی زندگی پر پھیل جاتا ہے اب کردار ہی کردار ہیں، نول میں رونق تو ہے لیکن ویرانی کے ساتھ، ملنساریاں تو ہیں لیکن بدگمانیوں کے ساتھ۔ سچ یہ ہے کہ ناول ایسے ہی تضادات سے آگے بڑھتا ہے۔ حقیقتوں کی ٹکراہٹوں سے ایک نئی حقیقیت کو جنم دیتا ہے جس سے اسمٰعیل بے خبر ہے لیکن ناول نگار باخبر ہے اور اسے بڑے سلیقہ سے ترتیب و تخلیق کے ساتھ پیش کرتا ہے یہ الگ بات ہے کہ کہیں کہیں ترتیب روشن رہتی ہے اور کہیں مدہم۔ یہ کوئی بری بات بھی نہیں کہ حساس موضوعات نزاکتوں کے مہین لباس پہنے ہوتے ہیں جنہیں سنبھال کر پیش کرنا ہوتا ہے ورنہ لباس کے تار تار ہو جانے کا خطرہ بنا رہتا ہے اور حسین الحق ایک سینئر تجربہ کار فنکار ہونے کے سبب یہ جانتے ہوں گے۔ کیونکہ ان کے پاس علم و شعور اور فنکاری کا مسلسل اور بڑا تجربہ ہے۔

ناول میں بدگمانیاں ہیں تو نیکیاں بھی ہیں، خصوصاً عورتوں میں جہاں ممتا اور بہناپا تیزی سے سر اٹھاتا ہے خواہ وہ ممانی ہوں یا دوستوں کی مائیں جو جینے کا سلیقہ سکھاتی ہیں، زندگی کا درس دیتی ہیں۔ ایسے ٹکڑے ناول کو بھی زندگی، جذبہ اور محبت سے جوڑتے ہیں دیکھئے یہ جملے

''ہندو عورت کی ممتا کی بارش میں خود کو پور م پور بھیگتا محسوس کریں؟''

پھر اچانک دروازے کا پردہ ہٹتا ہے اور زندگی کا ایک شعلہ لپکتا ہے۔ گلاب مہک اٹھتا ہے اور آداب، کی آواز سے جل ترنگ بج اٹھتا ہے۔ زندگی کا یہ سب سے دلکش رنگ ہوتا ہے اور زندگی کے یہ مختلف رنگ ناول میں ہیں ورنہ زندگی بھی ٹھہر جاتی اور ناول بھی۔ پریم چند نے ایک مضمون میں لکھا تھا۔

''انسان فطرتاً دیوتاؤں کی طرح ہے۔ زمانے کے دجل وفریب یا حالات سے مجبور ہوکر وہ اپنا تقدس کھو بیٹھتا ہے مگر ادب اسی تقدس کو اپنی جگہ مستحکم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپدیشوں سے نہیں، نصیحت سے نہیں۔ جذبات کو متحرک کر کے دل کے نازک ستار پر چوٹ لگا کر حسن و عشق اور فطرت سے ہم آہنگی پیدا کر کے۔''

دل کے ستار کی یہ چوٹ ہی اصلاً جل ترنگ ہے اور گلاب کا رنگ، ایک شعلہ بھیونڈی میں تھا نفرت کا اور ایک بے نام شعلہ محبت کا۔ دونوں کا تال میل اور تضاد کا کھیل ہی تخلیق کا سرمایہ بنتا ہے، یہ احساس ناول نگار کو بھی ہے، وہ اس کے فکر وفن سے بخوبی واقف ہے اسی لئے اسمٰعیل کا کردار صرف ایک کردار نہیں ہے بلکہ اپنے عہد کا اثر، اظہار اور آزار بنتا ہے، حال اور احوال بنتا ہے۔ مغربی نقاد چسٹرٹن نے کیا دلچسپ بات کہی ہے کہ اچھا ناول اپنے ہیرو کا حال سچائی سے بیان کرتا ہے۔ ناول میں تھوڑی دیر کے لئے رومان اور رومانی وجدان کی فضا تیر جاتی ہے جو خاصی دلچسپ اور دلکش ہے۔ عشق کی مار گولہ بارود سے بڑی ہوتی ہے جو فیضان کو بھی گھائل کرتی ہے جس کا دل اسمٰعیل کی نظر میں صرف خون صاف کرنے کی مشین تھا۔ مگر پھر اچانک مسرت ومحبت کا وہ پل کسی شیشے کی طرح بکھر گیا۔ قتل وخون کا ایک بم گرا اور عشق کا تاج محل چکنا چور ہوگیا۔ اور پھر وہی فضا گرم اور زہر آمیز گلی کوچے میں بھاگم بھاگ لیکن اسمٰعیل کی نظریں ہنوز لڑکی کے چہرے کا تعاقب کر رہی تھیں۔ کیسا حسین تضاد ہے جسے بڑے فطری انداز میں ناول نگار نے پیش کی ہے۔

درمیان میں ایک قتل ہوتا ہے۔ مقتول شیو چرن سنگھ، آپسی لڑائی، سیاسی اشارے، غنڈوں کی سیاست میں شمولیت، براہ راست سیاست پر گفتگو، کمیونزم اور کمیونسٹ پارٹی کے حالات، سوشلسٹ رجحانات، سب کچھ گڈمڈ خواب کی طرح، طرح طرح کے خواب، طرح طرح کے حقائق، بدلتی ہوئی، بگڑتی ہوئی حقیقت، کسی نے سچ کہا ہے حقیقتیں گم ہو رہی ہیں اس کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ ناول زندگی پا رہا ہے تو کچھ کھو بھی رہا ہے۔ ایک طویل خواب میں وہ پھر بھاگنے لگا۔ شاید یہی اماوس کا خواب ہے۔ گھنی اور ڈراؤنی رات کا خواب جس میں تعبیر کی تلاش ہے۔

ملک کی صورت حال اب یہ ہے کہ بقول مصنف۔ ''ہندوستان میں خاص طور پر شمالی ہندوستان میں کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' مسئلہ کٹائی بوائی کا کھڑا ہوتا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو کوئی اور مسئلہ ہوتا۔ اس معاشرے میں تو مسئلے ہی مسئلے ہیں۔ کچھ حالات نے پیدا کر دیے ہیں۔ ناول میں یہ تجسس قصہ بن کر آگے بڑھتا ہے۔ کل یہ سب شہروں میں تھا اب گاؤں میں بھی ہے تو سکون کہاں۔ بھومیہار، ہریجن، گوالہ سبھی تو تھے لیکن ان میں انسان کہاں،

ہندوستان کہاں، شاید یہی ہندوستان ہے۔ اسمٰعیل کی پریشانی یہ بھی تھی۔ جو ایک سوال میں سمٹ آئی۔ ''ہر عہد میں اس عہد میں اس عہد کا لٹیرا بڑا آدمی کیوں بن جاتا ہے؟'' کارل مارکس نے کہا بدلتے ہوئے عہد کے ساتھ ظالم کی تصویر بدل جاتی ہے کبھی ظالم مظلوم ہو جاتا ہے اور مظلوم ظالم۔ تبھی تو یہ جملہ نکلتا ہے۔ ''گجر گیا زمانہ دامودر بھیا۔ اب نہیں ہوگا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے ملے گا۔'' زمانہ کوئی بھی ہو اینٹ کا جواب پتھر ہی دیتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی بنیاد میں پہلی اینٹ کس نے ڈالی جواب پتھر بن گئی ہے۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس باب میں بعض سیاسی باتیں زیادہ ہی نکھر گئی ہیں۔ جس سے ناول کی تخلیقی فضا متاثر ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ سچ ہو اس لئے کہ ناول پہلے ناول ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ناول زندگی سے الگ نہیں ہوسکتا وہ تو زندگی کا ہی رزم نامہ ہوتا ہے اور حقیقت بھی حقیقت ہے۔ سفاک اور بے رحم حقیقت رومانی فضا یا انداز سے نہیں پیش کی جا سکتی، حقیقت کی، صداقت اور جسارت کی بھی اپنی جمالیات ہوا کرتی ہے جو اسمٰعیل جیسے کردار کے ذریعہ بہت سارے سوالوں میں ڈوب کر اپنی سادہ اور سچی شکل میں سامنے آتی ہے۔ سادگی کا اپنا حسن ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بھوک اور افلاس کا بھی اپنا ایک نشہ ہوتا ہے جن کے زور پر انقلاب جنم لیتے ہیں۔

اسمٰعیل ملازم ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے اس کے ذریعہ اب تعلیم اور تعلیمی نظام سامنے آتا ہے۔ مقدس پیشے میں گندگی کا ڈھیر لگتا ہے۔ ناول آگے بڑھتا ہے، ایک تپتے ہوئے ریت کی طرح جس میں اسمٰعیل جیسا شریف وحساس انسان آگ کی لپٹوں میں گھرتا چلا جاتا ہے۔ پھر لالو پرساد یادو، لال کرشن اڈوانی داخل ہوتے ہیں اور ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد شہید کردی جاتی ہے اور بقول مصنف۔ ''اس دن بہت زور کا جھٹکا لگا'' یہ جھٹکا صرف اسمٰعیل کو نہیں صدیوں کی انسانی اور ہندوستانی تہذیب کو لگا اس لئے کہ ''ہندوستان کا عام مزاج ہنسا اور تشدد کا نہیں ہے۔'' مگر تشدد تو ہوگیا۔ تہذیب تو بدل گئی اور ایک نئی تاریخ لکھی گئی۔ اسی تعلیمی تہذیب کے سہارے ناول آگے بڑھتا ہے۔ گفتگو بحث، مجرم، مستقبل سب گڈمڈ۔ ایک خون بھی ایک کردار یہ بھی کہتا ہے۔

''اس سنسار اور اس سنسار کی بات تو ہر دھارمک پستک میں کی گئی ہے مگر دھارمک کتابوں کی آتما کو سمجھنے کی کٹھنائی بھی مول لیجئے تو پتہ چلے کہ بدلے کا قانون ہر جگہ چلتا ہے۔''

اور یہ جملہ بھی۔ ''بابری مسجد گرا دینے سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہاں کے ہندو مسلمانوں کے دوست نہیں ہیں۔'' حالانکل کردار یہ بھی کہتا ہے۔

اس وچار میں کوئی دم نہیں۔ جب تک مرتنجے عادل اور اسمٰعیل دوست ہیں تب تک یہ وچار غلط ہی مانا

جائے گا۔"

اور بات وحدت، انسانیت، سگن نرگن تک جا پہنچتی ہے۔ ساتھ ہی شعروشاعری بھی مذہب میں سیاست یا سیاست میں مذہب، سیاست میں جرائم یا جرائم کی سیاست، سب گڈمڈ۔ تاریخ بھی گڈمڈ لیکن عوام کے تو اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ روٹی روزی کے مسائل، یہ طبقہ ہی سب سے بڑا طبقہ ہوتا ہے۔ جہاں مندر ہے، مسجد ہے، شاہ بانو کیس ہے، گئو رکشا ہے، تین طلاق ہے، بجرنگ دل ہے، جماعت اسلامی ہے۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ آپ ناول نہیں سیاست اور مذہب سے متعلق کوئی دلچسپ کتاب پڑھ رہے ہیں لیکن اسمٰعیل کے کردار درمیان میں لا کر اور سلگتے ہوئے تخلیقی جملوں کے ذریعہ قصہ کی گرمی اور سمت و رفتار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ ایک پہلو یہ بھی ابھرتا ہے کہ ممتاز فکشن رائٹر قرۃ العین حیدر نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "عوامی حادثہ سب سے ناپائیدار شئے ہے۔" لیکن اسی مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ "ہر قومی تہذیب اپنے ملک کی سیاسی طاقت کے بل پر ہمہ گیری حاصل کرتی ہے۔" شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے تقریباً تمام ناول جو اردو کے بہترین ناول قرار دیئے جاتے ہیں۔ اسی سیاسی طاقت، حکومت، اقتدار اور وقت کے بھنور میں پھنسے نظر آتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ یہ بھنور ان کے فلسیانہ اور فنکارانہ جوہروں سے تخلیق کے پیکر بن جاتے ہیں۔ کہیں کم کہیں زیادہ، حسین الحق کا یہ ناول بھی اسی راہ پر چلتا ہے لیکن یہ راہ اس قدر کھردری اور خاردار ہوگئی ہے جو شاید قرۃ العین حیدر کے زمانے میں نہ تھی اس لئے راستی اور تلخی کا شکار ہو جاتی ہے۔ حسین الحق کے بامعنی سوالیہ جملے اسے فکر و فلسفہ سے جوڑتے چلے جاتے ہیں تاہم سوالوں اور الجھنوں میں گھرا ناول کا مرکزی کردار کہیں کہیں معصومیت و شرافت کے تحت تنقیدی سوالوں کے گھیرے میں آنے لگتا ہے کیونکہ ایک اچھے ناول اور عمدہ کردار نگاری کا تقاضا یہ ہوا کرتا ہے کہ کردار سازی کے فن کے ذریعہ مسائل سامنے آئیں تو تخلیق کی شان بڑھ جائے جب کہ حادثات کی کثرت، مسائل کا غلبہ، غم والم کے جذبہ کی شدت اکثر کردار کو کمزور اور ماحول کو غیر تخلیقی بنانے میں دیر نہیں لگاتی اور ناول فن و فکر سے زیادہ واقعات کی کسوٹی بن کر رہ جاتا ہے۔ کئی طرح کے مسائل ایک ہی ناول میں سمونے کی جو لاشعوری وسعت ہوا کرتی ہے وہ بنیادی مسئلہ کو بھی متاثر کرتی ہے۔ کبھی کبھی اس ناول میں یہ طے کرنا مشکل ہوتا ہے کہ فرقہ واریت و نفرت مرکزی مسئلہ ہے کہ کرپشن اور جہالت بڑا مسئلہ ہے کہ غربت، لگتا یہ ہے کہ مصنف نے فرقہ وارانہ فسادات اور اس سے پھوٹنے والے احساس واضطراب کو مرکز میں رکھا ہے باقی سب اس کی شاخیں ہیں۔ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی باہم جذب پیوست، یہ ناول نگار کی مجبوری ہے اس لئے کہ سماج کی تشکیل ہی ان تمام عناصر سے مل کر ہوتی ہے۔

اگلے باب میں تعلیمی اداروں میں چھینا جھپٹ اور سماجی سطح پر نااہلوں کے سر اٹھانے کا مسئلہ ہے یہاں بھی خوف کی لہر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی محسوس ہوتی ہے، لڑائی جھگڑا...... غنڈے کی وجہ سے شریف آدمی کی جان بچتی ہے۔ کچھ عجیب معاملات، اس کے بعد کے باب میں بھی آگ لگی ہوئی ہے۔ اس بار الیکشن کی آگ تعلیم گاہ میں آگ، جہاں کرپشن بھی ہے اور انکروچمنٹ بھی، اسی لئے ایسے جملے بار بار ملتے ہیں۔ ''سر بہت گھپلا ہے!'' دفتری نظام، سرکاری نظام اور سیاسی نظام کی ملی جلی تصویر نظر آتی ہے۔ یہاں بھی اسمٰعیل ہے۔ ایک عام اور شریف کردار کی علامت جس کے پاس عزت ہے، غیرت ہے اس لئے ہر طرف سے پریشان ہے۔ اسی لئے چیخ کر کہتا ہے۔ ''یہ جو بھی ہے میں اس سے انکار کرتا ہوں۔'' ''انکار انکار انکار''۔

یہ ایک اچھا مزاحمتی اشاریہ ہے جو تخلیق کی سرحدوں کو چھو کر احتجاج کے در کھولتا ہے اور سنجیدہ و حساس قاری کو جھنجھوڑتا ہے۔ کردار میں تبدیلی تو رویہ میں بھی تبدیلی لیکن نظریہ ہنوز قائم۔ اگلے باب کے یہ جملے غور طلب ہیں۔

''بھائی لڑو۔ سنگھرش کرو، ہمت کیوں ہارتے ہو؟''

جس لڑائی کی بنیاد کمزور ہو، میں ایسی ہارنے والی لڑائی لڑنے کو تیار نہیں!

بے حد معنی خیز جملے ہیں۔ کیا اسی لئے ترقی پسند جماعتیں کمزور ہوئیں اور کیا اسی لئے شدت پسند جماعتیں مضبوط ہوئیں، بہت سارے حالات اور سوالات۔ اسمٰعیل اب بھی وہی، لیکن اب راہ دوسری، مدرسہ، مسلم غریب بچے، ایک نیا شعبہ جس کے تمام راستے کچے اور گندے تھے۔ تنگ گلیاں، گندی نالیاں، یہاں دوسری طرح کے مسائل، سیاست یہاں بھی کچھ دوسرے قسم کی لیکن اسمٰعیل وہی۔ ایک اور دنیا کا منظر، منظر پس منظر، پیش منظر، نجات کہیں نہیں بس۔ ''خوابوں کا انہدام، ناسٹلجیا کی شکست یوٹوپیا کی گم شدگی، موقف سے پرزندگی کا بکھراؤ نظریہ کی موت۔'' ایک اقتباس اور۔

''پھر یہ بھی ہوا کہ کامریڈوں کی محفلیں اجڑنے لگیں، محفل اگر کبھی سجی بھی تو نئے خواب کے بجائے پرانے خوابوں کی غلط تعبیر کی وجوہات تلاش کرنے کا بہانہ بن گئیں۔ دوسری طرف مذہبی آوازیں زیادہ سنائی دینے لگیں، مذہبی چہرے اردگرد جمع ہونے لگے گفتگو کے موضوعات اور محاورے بدلنے لگے۔''

اور وہ نظام جس کی بنیاد اسلام نہیں ہے باطل ہے اور ایک نئی شدت کے ساتھ نئے محاورے۔

''تاریخ گواہ ہے کہ فرعون اور نمرود سے مارکس اور لینن تک اللہ کے ہر باغی کو بالآخر ایک دن شکست

ہوئی ہے اور یہ اور وہ اور وہ۔''

'اور یہ اور وہ' میں ایک جہان معنی ہے جو فنکار کے قلم سے آباد ہوتا ہے، پھر اسمٰعیل کے جملے جو ناول نگار کے افکار و نظریات کی ترجمانی کرتے ہیں اور پھر۔''اس کو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام۔'' ناول نگار نے بڑی جسارت کے ساتھ نظریات کے معاملات اٹھائے ہیں۔'' جو قدرے سیاسی تو ہیں لیکن آج کے حالات کی ایک بڑی سچائی کا اعلانیہ ہیں۔

ناول تھوڑی دیر کے مسلمان ہو جاتا ہے۔ اس کا مرکزی کردار تو پہلے ہی سے مسلمان تھا لیکن ہندو کرداروں کے تال میل سے ملی جلی صورت حال کو بھی پیش کرتا ہے۔ مدرسہ، مسلمان اور ترقی پسند انسان......غور وفکر اور ذہنی Conflict کی ایک نئی تثلیث، ٹکراؤ تو ہونا تھا لیکن انہیں تصادمات اور ٹکراہٹوں سے ناول کا خاکہ تیار ہوتا ہے۔ کچھ دیر کے لئے صوفی ازم کی راہ پر چلتا ہوا مدرسے میں پناہ لیتا ہے۔ یہ جملہ دیکھئے۔

اسمٰعیل کو خانقاہوں میں چین نظر آیا اور وہ صوفی مزاج حجرات سے زیادہ جڑنے لگا۔''

لیکن مدرسہ کے تعلق سے یہ گہرا جملہ بھی معنی خیز ہے۔

''کراس وینٹلیش کے ذریعہ تازہ ہوا اور تازہ روشنی کے آدان پردان کا کوئی تصور مسلمانوں میں نہ پنپ سکا۔ گھر کے لئے نہ دماغ کے لئے۔

اور یہ جملہ بھی۔

''اسے درخت یاد آئے جو ہر سال اپنی چھال بدلتے ہیں، پرندے یاد آئے جو اپنے پر جھاڑتے ہیں، جاندار جسم یاد آیا جو اندر سے باہر تک لگاتار اپنے کو ادلتا بدلتا رہتا ہے مگر یہ لوگ؟''

مذہبی لوگوں کا معاملہ کیا ہے؟ شتر مرغ؟ مینڈک؟ ریت اور کنواں؟ مذہبی عالم وہی عالم وہی ہے جو کرتا ، پاجامہ، ٹوپی پہنے اور داڑھی رکھے، اسمٰعیل اس طرح کے ہر سوانگ سے محروم تھا اس لئے وہاں اس کا گذر نہ تھا لہٰذا وہ مدرسہ چھوڑ کر ایک اور نئی راہ پر چل پڑا۔

ناول کے مصنف حسین الحق صوفی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے مدرسہ اور مسلمانوں کی دنیا، مزید برآں پیری مریدی کے نظام سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔ان کے قلم سے اسمٰعیل جیسے کردار کی تخلیق غور طلب ہے اور لائق تحسین بھی۔ اسمٰعیل مسلمان تو ضرور ہے لیکن روشن خیال اور عقل پسند بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف نے ان حصوں کو جرأت مندی اور تخلیقی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے جو چشم کشا تو ہے ہی، دل دکھانے والا بھی ہے

مگر قاری کے شعور کو جھنجھوڑتا بھی ہے۔ ناول کا قصہ گوروفکر کی دنیا میں لے جائے اور ایک نئی حقیقت رو برو ہو وہی تخلیق کا معیار و اعجاز ہوا کرتا ہے۔

اب اسمٰعیل کو جنگ کی طرف متوجہ ہے۔ ایک نئی سیاست ہے جس میں گائے بھی شامل ہو چکی ہے بس اتنا ہی نہیں، بہار میں اس سے بھی زیادہ، نوجوانوں کے روزگار کے مسائل، ملک سے باہر جاکر روزی حاصل کرنے کا جبر۔ اس بار اسمٰعیل کے بجائے فیضان کے معاملات، نویش اور روما بھی، زندگی کی رفتار محسوس ہوتی ہے، یہ جملے دیکھئے۔

''زندگی کے رنگ ڈھنگ بھی عجب ہیں ایک موسم گذر جاتا ہے دوسرا آہستہ آہستہ سارے منظر نامے پر حاوی ہو جاتا ہے۔ کیا جانے والا زندگی کے منظر نامے سے کیا غائب ہو جاتا ہے؟ زندگی حرکت کے سہارے قائم ہے۔''

اور یہ جملہ بھی...... ''دنیا تو دھوپ چھاؤں کے رنگوں سے ہی بنی ہے۔''

اپنی اپنی دھوپ، اپنی اپنی چھاؤں، لیکن دھوپ زیادہ ہے۔ زندگی کی دھوپ، دنیا کی گرمی، رشتہ کی نرمی، طاقت اور دولت کی بے رحمی، سیاست کی گندگی، غرض کہ اس زندگی میں کوئی کیا کیا کرے۔ فیضان ایک ہارا ہوا سپاہی تھا۔ اسمٰعیل ہار کر بھی ہارا ہوا نہیں۔ بات رویہ ونظریہ کی تھی اس لئے اس مقام پر گفتگو اور مکالمے پر اثر اور بامعنی ہیں فیضان کی زندگی میں تاریکی تھی لیکن اسمٰعیل کا خیال تھا کہ ''ایک اچھی دھلی ہوئی نکھری ہوئی خوبصورت صبح کی آس کبھی نہیں چھوڑنی چاہئے۔'' ''آدمی جہاں ایک طرف جانور سے بدتر ہے وہیں دوسری طرف فرشتوں سے بہتر ہے۔'' ''جوڈوب گیا سو پار ہوا جو بیٹھ رہا سو ڈوب گیا'' کچھ اور زندگی اور تجربوں سے بھرے ہوئے مکالمے اور ایک مکالمہ یہ بھی ''نکسل ازم کا عروج کمیونسٹوں کی بدعملی اور افلاس کا نتیجہ ہے۔'' اور پھر بہار کے حالات جو ملک کے حالات تک پھیل جاتے ہیں، اس وقت کے حالات جب ملک بھر میں اچھے دنوں کی آس کے چرچے تھے۔ اس جملے میں فلسفہ بھی ہے، سیاست بھی اور حقیقت بھی۔'' بے خبری سے شروع ہونے والا سفر دوبارہ بے خبری تک پہنچ گیا۔'' اسی بے خبری میں ایک بم پھٹتا ہے فیضان اور اسمٰعیل ہلاک ہو جاتے ہیں اور ملک میں نعرے لگ رہے ہیں کہ اچھے دن آنے والے ہیں۔ ناول اس سے قبل ختم ہو سکتا تھا اور ناول اس مقام پر بھی ختم ہو سکتا ہے لیکن زندگی کے سفر کی طرح ناول کا سفر ہنوز جاری ہے۔ وقت بدلا تو اسمٰعیل کا بیٹا جوان ہو گیا جو دہلی میں ہے لیکن اس کا بھی یہی خیال ہے کہ ''ہم جس واتاورن کو جھیل رہے ہیں اس میں مقابلے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں

ہے۔'' قیدار کے بہانے ایک بار پھر تاریخ کے اوراق پھڑ پھڑانے لگتے ہیں۔ اسے تو پھڑ پھڑانا ہی تھا۔ قیمت تو ادا کرنی تھی خواہ وہ بھونڈی ہو، بھاگل پوریا مالے گاؤں، قلعہ معلیٰ پر چیلوں کا منڈرانا بھی خوبصورت اشارہ ہے اس کے بعد تو بہت کچھ پوری بے باکی اور بے شرمی کے ساتھ۔ اچھی بات یہ ہے کہ ڈگمگاتے قیدار کو بنسی دھر اور بھاٹیہ سنبھالتے ہیں ان سے پیار پا کر کہتا ہے۔'' میرا آپ لوگوں کے علاوہ کون ہے؟ ادھر ایک بہن نائلہ بھی ہے جو ایک ہندو لڑکے کے ساتھ ممبئی بھاگ جاتی ہے۔ عجیب احساس، عجیب موڑ، بنسی دھر کا جملہ۔'' دنیا ایسے ہی چلتی ہے۔''

ایک باب میں رمیش اور نائلہ کے ذریعہ ممبئی داخل ہوتی ہے تو اگلے باب میں دہلی۔ جہاں اب قیدار قدم جما رہا ہے۔ گاؤں دیہات چھوٹ چکا ہے۔ ماں باپ کے بعد اب رکھا ہی کیا ہے، وقت کے ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔

دہلی میں کو چنگ ہے تاریخ پڑھنی ہے، ایک دکان سے تقاضا کیا تو جواب ملتا ہے۔'' ہم تاریخ نہیں بیچتے۔ اس وقت مذہب بیچنے میں جتنا فائدہ ہے تاریخ فلسفہ بیچنے میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ اب تو مذہب فلم سے بڑا مارکیٹ ہے۔''

جیسا کہ عرض کیا کہ مصنف خود مذہبی پس منظر سے گہرا تعلق رکھتے ہیں ان کے قلم سے ایسے بے باک جملے ان کی جرأت مندہ کا برملا اظہار تو کرتے ہی ہیں۔ نیز اس نیٹ ورک کو پیش کرنے کے پیچھے جو ایک فراری و استحصالی نظام وابستہ ہے اس کے بھی بلیغ اشارے ملتے ہیں جو حسین الحق ہی پیش کر سکتے ہیں۔

اگلے باب میں نائلہ کا کردار ہے۔ اک سہارے کی تلاش انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے خدا سے بھگوان تک۔ ہندو سے مسلمان تک۔ بہار سے بمبئی تک، کھولی سے اندھیری تک، اس کھولی میں بدبو دار لیٹرین بھی ہے اور خوشبو دار بدن بھی جو ایک بار کھل گیا تو بقول مصنف۔'' کسی کے سامنے کھل گیا تو پھر نجات کہاں؟'' لیکن زندگی کی، بمبئی کی بے رحم حقیقتیں بھی ہیں ساتھ ہی ایک مسئلہ یہ بھی کہ میں اپنا ہندو ہونا چھپا لوں گا مگر مجھے لگا کہ تم مسلمان ہونا نہ چھپا سکو گی۔'' اس لیے کہ۔'' مذہب سانس کی طرح آدمی کے ساتھ چلتا ہے۔'' نائلہ کے احساسات اور ہندو مسلم معاملات کو مصنف نے دلچسپ اور معنی خیر انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ باب ناول کی حیثیت ضرور رکھتا ہے اور ناول کی فضا میں دلکشی اور معنی پیدا کرتا ہے۔ بے حد جرأت سے لکھا ہوا باب ہے۔

قیدار واپس آ گیا۔ حسب سابق پھر تاریخ، مسلمان، سید، شیعہ سنی اور دیو بندی، پہلے بھی اور اب بھی ہے لیکن اب خون خرابے کے ساتھ ہے۔ پہلے خلفشار نہیں تھا اب ہولی دیوالی سے مسلمان اور محرم، شب برات سے

ہندو الگ کیسے ہوگئے۔ دیو بند سے بریلی الگ کیسے ہوگیا۔سوال در سوال، درمیان میں تاریخ، پھر حال، پھر حقیقت پھر خواب اور وہ بھی اماوس میں خواب۔ ناول طویل ہوتا گیا، زندگی کی طرح، بھیونڈی سے اورنگ آباد، اورنگ آباد سے دہلی، پٹنہ یونیورسٹی سے جے۔این۔یو، جامعہ ملیہ، یہ سب اشارے ہیں۔اصل سفر تو سفرِ حیات ہے اور کارزارِ حیات جو نسل در نسل پھیلا ہوا ہے پورے گرد و غبار کے ساتھ آزار و آثار کے ساتھ، بے رحمی و تاریکی کے ساتھ لیکن ایک ہلکی سی روشنی بھی ہے۔ روشنی سہائے لیکن یہاں بھی ہندو مسلم کا مسئلہ ہے مگر عشق۔ جو انصاف کی دیوی کی طرح اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے۔حسب معمول ایک چھوٹی سی فلسفیانہ بحث بھی ہے جو کسی ناول کا حصہ بنتی ہے اور کہیں نہیں بھی بنتی۔لیکن بعض جملے فکر انگیز اور معنی خیز ہیں۔

''یعنی حاصل اور لاحاصل دونوں ساتھ ساتھ۔''

''جو ملے اور جو نہ ملے اور اگر ملے تو بھی بے فائدہ''

''سام ڈنڈ بھید کچھ چھوڑا ہے سالوں نے''

''عام آدمی کے ساتھ ایسا کھلواڑ اس سے پہلے نہیں ہوا''

اور آج کی سیاست پر کھلی گفتگو، آج کے تعلیمی ادارے، آج کے نوجوان طالب علم، آج کی نسل جن کے دامن میں کیا آیا۔ بے روزگاری، ہنگامہ خیزی، ٹکراؤ، اور شام کا اندھیرا۔

پھر نائلہ، پھر قیدار، دونوں کی زندگی میں اندھیرا، درمیان میں روشنی تھی۔ ''یہ زندگی بھی کتنی چیز ہے۔'' اور ناول رفتہ رفتہ روشنی کو لئے محبت کو اپنائے ان موضوعات پر گفتگو کرتا ہے جو اب تک ناول میں بظاہر نہ تھے۔اب یہ نوجوان طلباء جے۔این۔یو میں ہیں اور مسائل کو عالمی واقتصادی پس منظر میں دیکھتے ہیں۔بات کیپیٹل پنشمنٹ (Capital Punishment) کی ہے اور پڑھا لکھا جتھا اس کا مخالف ہے اور یہ سوال بھی۔

''کیا انسانی ادھیکار کو بچانے کی کوشش بھی پاپ ہے؟''

''میڈیا چور ہے بکا ہوا ہے!''

''ٹی وی پر اب نیوز چینل سے زیادہ ویوز چینل دکھائی دیتے ہیں۔''

''یہ صحافت نہیں زور آوری ہے۔''

''افضل گرو تو ایک بہانہ ہے۔ جے۔این۔یو اصل نشانہ ہے۔''

اور یہ حقیقت ہے، جے۔این۔یو کے کردار اور نظریہ پر روشنی اچھی گفتگو کرتی ہے ناول میں موجودہ

حالات کے تئیں ایک دانشورانہ گفتگو بھی سامنے آتی ہے۔ گفتگو کا لب لہجہ ناول نگار کی روشن خیالی کو واضح کرتا ہے یہاں کچھ چیزیں ضرورت سے زیادہ واضح ہوتی محسوس ہوتی ہیں نعرہ بازی کا وہ الزام جو کبھی ترقی پسند فنکاروں پر لگایا جاتا تھا حسین الحق پر بھی لگ سکتا ہے مگر مسئلہ یہ بھی تو ہے کہ

''یہ نعرے نہیں ہیں، یہ آدمی کے اندر دور دور تک اتر جانے والی چیخیں ہیں۔''

اور یہ بھی کہ:

.........آج ان نعرہ لگانے والوں کی وڈمبنا ہے یا مجبوری ہے کہ یہ ان محاوروں اور اڈیمس (Idioms) کا پریوگ کر رہے ہیں جن کا زمانہ لد چکا۔

بہت گمبھیر سمسیا ہے سماج کا پورا چہرہ بدل گیا۔''

اب یہ کیسے سمجھا جائے کہ جب خالی پیٹ کی گہرائیوں اور تاریکیوں سے نعرے بلند ہوتے ہیں تو ان کا تعلق کسی ملک یا نظریہ سے نہیں ہوتا۔ انسان اور انسانیت سے ہوتا ہے۔ آج نعرہ اگر بے معنی ہوا تو وہ بھی عالم کاری اور استحصالی نظام کا عجوبہ ہے۔ کرشمہ ہے یا طلسمی منصوبہ۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ناول بائیں بازو کے خیالات و رجحانات کی کمزوریوں کی طرف توجہ مرکوز کرتا ہے گجرات، احسان جعفری اور ذکیہ جعفری تک پہنچتا ہے۔ ایک کردار نادرہ کا بھی ہے پھر میل محبت کا لیکن پھر گائے، نفرت کا تازہ آلہ کار۔ ''سالا میاں گئو ماتا کا شتر و دیش در وہی، مانس کہاں ہے نکال سالا۔'' جیسے نفرت انگیز جملے اور پھر اخلاق کی موت اور ایک سوال ایمرجنسی کا زمانہ زیادہ خراب تھا یا؟ کچھ مسائل مقامی ضرور ہوا کرتے ہیں لیکن سیاست ہو یا تجارت اب یہ مقامیت سے عالمیت تک پھیل چکی ہے لیکن وہاں اس کو صرف مقامی حوالوں سے دیکھا گیا ہے آج کی برقی اور تیز رفتار دنیا میں مقامی مسائل کو بھی عالمی مسائل سے الگ کر کے دیکھ پانا مشکل ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ دنیا اب عالمی بازار بن چکی ہے۔ محبت اگر چہ بیحد قیمتی شے تھی اور آج بھی ہے لیکن آج میڈیا میں سیاست میں، بازار میں نفرت کا مول بڑھ گیا ہے۔ فلم بجرنگی بھائی جان میں میڈیا کا ایک اہم کردار صاف طور پر کہتا ہے۔ ''نفرت کتنی آسانی سے بک جاتی ہے محبت اور قربانی کو آج کوئی خریدنے کو تیار نہیں۔''

ناول میں نائلہ، رفیدہ یا بمبئی کا ٹکڑا.........ناول نگار نے اسے پیش کر کے ہندو مسلم کے ساتھ ساتھ محبت بھی اور بمبئی کی زندگی کو بھی دکھا کر آج کی تیز رفتار زندگی کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ چھوٹے شہر اورنگ آباد اور بڑے شہر بمبئی کی زندگی الگ الگ ضرور ہے لیکن مسائل سب کے اپنے اپنے ہیں۔ متوسط طبقہ کے مسلم گھرانے کا

احساس، وہ بھی لڑکی کا احساس، جو فطری ہے۔ اسی لئے وہ ''پانچ مہینے سے غلط کاری، بے یقینی اور پچھتاوے کی صلیب پر پڑی جھولتی رہی۔'' تہذیب وتربیت کا یہ شدید احساس مذہب سے بھی زیادہ بڑا ہوا کرتا ہے، جب اس کا رکھوالا ہی کہہ دے۔ ''کرائے کی گھر والی'' تو احساس کرب میں بدل جاتا ہے، موجودہ دور میں بمبئی، دہلی جیسے شہروں میں اب سب کرائے جیسا ہو کر رہ گیا ہے آج کی تیز رفتار اور خود غرض زندگی کا جو انجام ہوتا ہے وہ رمیش کی مصنوعی محبت کی صورت میں ہوتا ہے۔ نائلہ پھر بھی نبھاتی رہی لیکن پھر یہ احساس جاگتا ہے اور بے حد خوبصورت تخلیقی جملہ نکلتا ہے۔ ''وہ موڑ جہاں عورت مرد کے درمیان کی دوری ختم ہوتی ہے وہاں حسنِ سلوک بے معنی ہے۔ شاید بدسلوکی کا بھی کوئی معنی نہیں بنتا۔'' اور اس سے زیادہ بلیغ جملہ۔ ''میں چھاؤں بن پائی نہ چھایا'' اس کے بعد کے جملوں میں بھی گہری معنویت ہے، تخلیقیت ہے اور اس سے زیادہ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی رشتوں بالخصوص مرد عورت کے میل جول، محبت اپنائیت سے متعلق ناول نگار کے جملے جتنے اہم اور بامعنی ہیں اتنے نفرت سے متعلق نہیں جبکہ ناول میں محبت کم نفرت زیادہ ہے۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ محبت میں جذبہ ہوتا ہے اور نفرت میں فلسفہ۔ محبت میں نرمی ہوتی ہے اور فلسفہ میں خشکی۔ اس لئے معاملہ تمکنت کا ہو، شہوار کا روشن کا یا نائلہ کا، یہ چھوٹے چھوٹے اور مختصر وقفہ کے نسوانی کردار جو اگرچہ ناول کے بڑے کردار نہیں ہیں لیکن ان کے مختصر وجود سے ناول میں نرمی، روشنی، چاشنی نظر آتی ہے جو ناول کو متوازی طور پر سنبھالے رکھتی ہے۔ یہ کردار غیر ضروری لگتے ہوئے بھی عمدہ پیش کش سے ضروری بن جاتے ہیں۔ یہ حسن پیش کش جلد ہی ایک مقام پر بوالہوسی میں بدل جاتی ہے اور لمحہ بھر کے لیے ایک کریہہ منظر ابھرتا ہے جو آج کی حقیقت ہے اور ایک حقیقت یہ بھی کہ ایک طرف یہ لڑکیاں اور عورتیں ہیں تو دوسری طرف بمبئی جیسے شہر میں وہ عورت جو شراب پیتی اور اپنی ہی بیٹی کا ماں کے جرائم کی مخالفت کرنے پر اجتمائی زنا کرواتی ہے۔ یہ سفاک حقیقت اس زنا کاری سے زیادہ بے رحم ہے لیکن آج یہ سب کچھ ہو رہا ہے خصوصاً بڑے شہروں میں۔ یہ بھی آج کی زندگی کا مکروہ حصہ ہے جہاں ایک نوجوان رات گئے گھر آتا ہے بلو فلم دیکھتا ہے اور پھر اپنی ہی بیوی کے ساتھ زنا کرتا ہے تب ناول نگار کے قلم سے یہ جملہ نکلتا ہے۔ ''یہ آزادی وطن کے بعد کی سترویں رات تھی۔'' یہاں آزادی اور وطن دونوں ہی بہترین اشارے بن گئے ہیں۔ اس کے فوراً بعد انڈر ورلڈ کا ذکر بھی دلچسپ ہے، گمراہی کا ایک چکرویوہ جہاں لکھا تھا ''Point of No return'' یہ مصرعہ بھی جو ناول نگار لکھتا ہے۔ ''لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی'' لڑکیوں سے متعلق وہ تہذیب چکنا چور ہوگئی جو ایک زمانے کی غالب تہذیب تھی، محبت اور شرافت کی تہذیب، جسے والدین صدیوں تک سینے سے لگائے رہے اور

کہتے رہے۔ ’’میکے سے ڈولی اٹھتی ہے سسرال سے ڈولا اٹھتا ہے۔‘‘ لیکن بمبئی میں ڈولی کے بجائے ٹیکسی ہے اور ڈولا کے بجائے دلال۔ پھر بمبئی کا طولانی تعارف، ظاہر ہے کہ تعارف تو تعارف ہی ہوتا ہے۔

ناسمجھ اور تیز رفتار زندگی کا انجام اکثر موت ہی ہوتا ہے وہی نائلہ کا ہوا۔ ایک باب اور ختم ہوا۔ اب ناول کا آخری باب ہے جس کا تعلق قیدار اور روشنی سے ہے، یہ دونوں ہی نئی نسل کے نمائندے ہیں وہ نئی نسل جو بقول مصنف خودرو پودے کی طرح ہے' یہاں مصنف نے خودرو' لفظ سے جو امیجری پیش کی ہے اس سے ایہک بڑی معنی خیز تصویر ابھرتی ہے۔ ناول میں کبھی کبھی ایک لفظ پورے باب کا کلیدی جملہ بن جاتا ہے۔ بس اس لفظ کی تلاش، تراش اور تخلیقی استعمال کا ہنر آنا چاہئے۔ جو حسین الحق میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسی سلسلے کے ان جملوں کو بھی ملاحظہ کیجئے

’’پتے گر رہے ہیں نئی کونپلوں کے نکلنے کا وقت قریب ہے۔ پتے پہلے پیلے ہوتے ہیں پھر گرتے ہیں۔ منظر پر پیلا رنگ حاوی ہوتا جارہا ہے۔ خزاں کا رنگ‘‘ خزاں بھی عجیب موسم ہے اس موسم میں پتے جھڑتے ہیں مگر نئے پتے نکلتے بھی تو ہیں۔‘‘

کچھ ایسے ہی اور جملے جسے فطرت سے جوڑ کر دیکھا جاسکتا ہے جو زندگی کے آثار اور اظہار پر الگ انداز واسلوب سے ہے اور اختتام پر کچھ مختلف انداز میں مگر خواب ابتدا سے آخر تک اپنی ہی زور آوری دکھاتا محسوس ہوتا ہے۔ پھر بیج، سڑاند اور زمین، ایک عجیب تثلیث اور تکلیف جسے تقلیب کی شکل دینے کی کوشش، پھر کشمکش کیونکہ درمیان میں شریعت آجاتی ہے پھر بھی نئی نسل تو موجود ہے اور جھیل رہی ہے لہذا نئے ذہن میں تو کوندے کو لپکنا ہی قیدار کے ذہن میں کوندا لپکا۔

’’ایجادات وانکشافات سے زندگی آگے بڑھتی ہے اور اخلاقیات سے زندگی میں حسن، تناسب کا حسن پیدا ہوتا ہے مگر نظریہ سے صرف اقتدار حاصل کیا جاسکتا ہے کوئی حاکم بنتا ہے اور کوئی محکوم۔ زندگی کو نہ حاکم کی ضرورت ہے نہ محکوم کی۔ اسے صرف ہم سفر چاہئے۔‘‘

یہ جملے بے حد فکر انگیز ہیں مگر کشمکش میں ڈوبے ہوئے اور فکری اور فنی سطح پر سوال کرتے ہوئے، قیدار یہ بھی سوچتا ہے۔ ’’ہم سب کیا چاہتے تھے اور کیا پایا ہے۔‘‘ اور پھر یہ بھی کہ۔ ’’ایسا کیوں ہوا کہ جو ملا وہ چاہا ہوا نہیں تھا۔‘‘

ظاہر ہے کہ یہ صرف جملے نہیں ہیں ان میں سماجیات اور سیاسیات کی ایک اذیت ناک تاریخ پوشیدہ ہے

اوراس تاریخ کے بننے میں انگریز، ہندو مسلمان سب کے سب برابر کے شریک رہے، معاملہ اٹکتا ہے اس کی پیچیدگی ژولیدگی اور پس پردہ عالم کاری اور فریب کاری پر جس کی گفتگو اس ناول میں کم کی گئی ہے لیکن یہاں ایک جملہ ملتا ہے۔ ''پھر وہ سارے لوگ جو ملک بھر میں بلکہ دنیا بھر میں دہشت پھیلا رہے ہیں ان کے سپنے کیا ہیں؟ کیا یہ لوگ زندگی سے پیار نہیں کرتے۔'' اور دنیا کے کسی موڑ کسی چھور پر اس کا جواب نہ ملے تو دم گھٹے گا ہی لیکن وہی روشنی بھی تو بقول مصنف ''پھر سروں کی بھیڑ میں چھپ سی گئی تھی۔''

''کچھ پرانی باتیں، گھاتیں، تبدیلیاں اور تباہیاں اور۔ پرانے شہر کی لاش پر انگڑائی لے کر کھڑا ہوتا نیا شہر۔'' روشنی پھر آ گئی، وہ قیدار کے ساتھ چل پڑی، صدیوں کا سفر طے کرنے لگی، سوال اور جواب یہ جملے:

''مگو یہاں تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے ہمارے چاروں طرف مکڑ مُتّے کی طرح پھیلا ہوا جو ہمارا ورتمان ہے، یہ کیسا سمجھ میں نہ آنے والا حال ہے۔ Unpridecatable Present دھند، چاروں طرف دھند، کچھ سجھائی نہیں دیتا، ایک اندھیری سرنگ جس میں ہم ڈھکیل دئے گئے ہیں اور داخلے کا راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ ہم آگے بڑھ رہے ہیں مگر راستہ سجھائی نہیں دیتا۔''

تھوڑی دیر کے لئے مایوسی لیکن اس کے باوجود وہ دیکھ رہا ہے کہ دیکھنا انسان کی فطرت ہے، آگے بڑھنا اس کی جبلت، قیدار نے تو یہ بھی طے کر لیا کہ ہمیں آگے کہاں جانا ہے لیکن زندگی اور وقت۔

''وقت ہمیشہ چک پھیریاں دیتا ہے اور ملنے والے بچھڑ جاتے ہیں۔''

''ہم وہاں سے کیوں اٹھ آئے؟ وہ تو ہمارا خواب تھا۔''

پھر نظریے کی باتیں جس میں گرباچوف بھی آتے ہیں۔ گلاسناسٹ اور پروسترویکا بھی لیکن ایک جملہ یہ بھی:

''مگر چوپال بھائی چارہ سب کا بھلا نظریہ نہیں عمل ہے۔''

''اس عمل نے جمہوریت، سیکولرزم اور سماج واد کا لبادہ پہنا تو نعرہ بن گیا اور سیاست دانوں کے کام آنے لگا اور اس کے ساتھ جی کھول کر زنا بالجبر کیا گیا۔''

تاریخی اور فلسفیانہ جملے جو ناول کی اختتام کو با معنی اور با مقصد بناتے ہوئے قلم سے نکلتے ہیں، ناول کا نچوڑ بن جاتے ہیں۔ اگر چہ چاروں طرف جھوٹ اور مکاری کا بازار گرم ہے۔'' اور سپنے مٹی میں مل رہے ہیں۔ لال قلعہ میں عالی جاہ (یعنی طبقۂ امراء) اور نظام الدین میں بنگلے والی مسجد کا اشارہ مسلم فراریت سے گریز کی نشانی ہے

وہیں سلطان جی (یعنی حضرت محبوب الہیٰ) کے اغوا کی بات کہہ کر موجودہ صوفی سسٹم پر ایک بھرپور وار کیا گیا ہے۔ باقی بچے عام لوگ تو وہ بیچارے گرم بازاری کا شکار ہیں اور بے موت مر رہے ہیں۔ زندگی کو اپنا ہم سفر چاہئے جو زندگی کو شاید میسر نہیں۔ ایسی کربناک اور المناک صورت حال میں روشنی اور قیدار جو امید کی، نشاط کی، مستقبل کی اور زندگی کی علامت ہیں۔ ندی پودوں اور درختوں یعنی فطرتِ زمینی اور فطرتِ انسانی کے درمیان ایک دوسرے کے قریب۔ ایک دم قریب، نفرتوں کی دنیا میں محبتوں میں ڈوبے دو بدن جل رہے ہیں۔ اور کوؤں کی دنیا میں ایک فاختہ ان کی محبتوں پر سایہ کرتے ہوئے پرواز کر گئی۔ ناول ان دلکش، پراثر اور بامعنی جملوں پر ختم ہوتا ہے۔

''کہیں کوئی فاختہ اپنی ہونٹوں پہ زیتون کی ایک ننھی سی شاخ لی کر آئی اور ان پر نچھاور کیا، کسی مور نے اپنے رنگ برنگے پر ان پر وارے، کوئی ٹھنڈی ہوا انہیں چھو کر گزری، ترل ترل بہتی ندی کے آگے بڑھتے ہوئے ان کی طرف ذرا سا پلٹ کر دیکھا اور خوشی میں مست ہو کر دو لہریں ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کرنے لگیں۔''

ناول بظاہر ختم ہوتا ہے اور اسے ہونا بھی تھا لیکن زندگی ختم نہیں ہوتی اور جذبہ محبت۔ یہ ایک لمبا سفر ہے۔ بار بار یہ جملے زندگی کے سفر میں یاد آئیں گے۔ ''زندگی کو ایک ہم سفر چاہئے۔'' انسان کو بھی، تاریخ اور تہذیب کو بھی۔ ناول ختم ہوتا ہے لیکن کبھی نہ ختم ہونے والے احساسات جذبات کا آبشار چھوڑ جاتا ہے۔ جس کی ناول سے متعلق مغربی مفکر جان سودرلینڈ نے ایک دلچسپ کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے۔ How to read a Novel یعنی ناول کو کس طرح پڑھا جائے۔ مصنف لکھتا ہے کہ'' ناول پڑھنا کرکٹ میچ دیکھنا اور گھوڑ سواری کرنا نہیں ہے۔ اسے ٹھیک سے پڑھنا سائیکل سواری کرنا جیسا ہے۔'' اس نے یہ بھی کہا'' سچ تو یہ ہے کہ کسی ناول کو ٹھیک سے پڑھنا ناول لکھنے سے زیادہ مشکل ہے۔ پڑھنے میں قاری کا شامل ہونا ضروری ہے۔'' ایک سنجیدہ اور سمجھدار قاری اکثر ایسا ہی کرتا ہے. بس مشکل وہاں کھڑی ہوتی ہے کہ جب ایک قاری ناول کو ناول کے حوالے سے کم اور اپنے حوالے، اپنی عینک یا اپنے نقطۂ نظر سے پڑھتا ہے اور اپنی پسند و ناپسند کو حاوی کرتا ہے اور جب اپنی پسند کی چیزیں نہیں ہوتیں یا کم ہوتیں ہیں تو پھر اس میں نقص نکال کر اسے کمزور ثابت کرتا ہے۔ تاثر یا تنقید کا یہ ایک طرفہ رویہ عموماً تخلیق کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ اس لئے اس کتاب کے اندرون میں انہیں مسائل پر کارآمد اور دلچسپ گفتگو کی ہے۔ جس کو مرکزی نقطہ یہ ہے کہ قاری کے ذہن میں کیا ہے۔ مزید برآں کہ اس سے زیادہ ضروری خیال یہ ہے کہ ناول میں کیا ہے اور اسے کس طرح پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مرکزی خیال، خیال کی وسعت اور کردار کی اذیت و عظمت وغیرہ کا تال میل اور کل ملا کر اس کا کام اور پیغام کیا ہے۔ ناول سے متعلق اس دلچسپ پہلو پر الگ

سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں اس کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ اردو میں تنقید کا چلن کچھ اس طرح روایتی محسوساتی اور ذاتی نوعیت کا ہو گیا ہے جس میں زبان و بیان کی روانی اور کرافٹ کی شیرینی کا عمل دخل زیادہ رہتا ہے۔ جس کی تلاش عموماً شاعری میں زیادہ ہوا کرتی ہے۔ جبکہ ناول کی تفہیم وتنقید شاعری سے مختلف ہوا کرتی ہے۔ ناول کی وسعت، زندگی کا سنگھرش بہت دیر تک اس شاعرانہ روانی و چاشنی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ناول نگار کو ہر طرح کی آزادی ہے۔ یہ بحث پرانی ہو سکتی ہے لیکن ناول کے فکر وفن سے متعلق اس نوع کی بحثیں آج بھی جاری وساری ہیں۔ مثال کے طور پر حسین الحق کے اسی ناول کے بارے میں پہلا اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ ناول اکثر مقامات پر لاؤڈ (Loud) ہو گیا ہے۔ راست طور پر گفتگو کچھ زیادہ ہو گئی جس سے کرافٹ متاثر ہوتا ہے۔ اس میں کئی مقامات پر غیر ضروری بحثیں ہیں جو کم کی جا سکتی تھیں۔ یا یہ بھی اس میں سیاست اور فرقہ واریت کچھ زیادہ ہی ہے اور اس کو پیش کرنے میں مصنف کی مداخلت کچھ زیادہ ہے۔ ان میں سے کسی کا جواب نہیں دوں گا۔ اگر ناول اچھا ہے تو وہ خود ہی جواب ہے۔ عمدہ ناول تنقید کی وکالت کا محتاج نہیں ہوتا۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا گذشتہ اوراق میں کہہ گیا۔ یہاں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ ہر موضوع اپنے مزاج، مذاق اور اسلوب کا متقاضی ہوتا ہے۔ ایک سماجی اور سیاسی زرمیہ میں روانی اسلوب کا عمل دخل کس طرح ممکن ہے۔ رول فاکس نے کہا تھا۔'' ناول میں جیون سنگرام دکھائی دیتا ہے، زندگی کے سنگھرش پر ہی ناول لکھے جاتے ہیں۔ اب سنگرام اور سنگھرش کی زبان تو مختلف ہو گی لیکن ہم ایسے ناولوں میں رومان اور گلاب پن تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اس عمل میں قصور ناول کا کم ہوتا ہے قاری کا زیادہ۔ ہمارا ذہن سٹ ہوتا ہے ہم اس سے نکلنا نہیں چاہتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم خیال آرائی کے عادی زیادہ ہیں تلخ حقیقت نگاری کے کم۔ ہم فریاد کے عادی زیادہ ہیں للکار کے کم۔ ہم سرگوشی کے عادی زیادہ ہیں بلند آہنگی کے کم۔ اس لیے بلند آہنگی کھردری حقیقت نگاری ہمیں موافق نہیں آتی اس لیے ہم پریم چند اور کرشن چندر جیسے عظیم فنکاروں کو آسانی سے قبول نہیں کر سکتے۔ بہر حال بنیادی سوال یہ ہے کہ بقول پیغام آفاقی

'' آپ ناولوں میں کیا ڈھونڈتے ہیں؟ دانشوری کی روشنی یا محض خیالی سنسنی۔ ناول کی عظمت دانشوری میں پنہاں ہوتی ہے نہ کہ محض خیال آفرینی میں، زندگی کی مجموعی صورت حال میں اور تبدیلی کے جائزے میں پنہاں ہوتی ہے نہ کہ محض زندگی اور دنیا میں ہونے والے نئے نئے تجربات کی عکاسی اور پیش کش میں۔''

(پختہ اور نا پختہ ناولوں میں فرق)

آخری جملہ کام کا ہے کہ صرف عکاسی اور پیش کش کافی نہیں اس سے ناول میں تخلیقی فضا ضرور بنتی ہے

لیکن گہرائی نہیں پیدا ہوتی۔ گہرائی اور سنجیدگی لانے کے لئے ناول نگار کو مداخلت کرنی پڑتی ہے جو اکثر ہمیں گراں گزرتی ہے اور ہم اعتراض کرنے لگتے ہیں کہ ناول نگار کو زیادہ دخل نہیں دینا چاہئے۔ کچھ حصوں کو کم کر دینا چاہئے۔ یہ سب کہنے کا حق ہمیں یعنی ناقد کو نہیں ہے پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ، حسین الحق کے اس ناول کے عمدہ ہونے کے سبب اس پر سوالات ہوں گے جس کا جواب ناول خود دے گا۔ نہ کہ کوئی جانبدار ناقد۔ پیغام کے دو ایک جملے اور ملاحظہ کیجیے۔

''جو افراد معاشرے کے سبھی طبقات کے بارے میں حقیقی تجربے نہ ہونے کے باوجود ناول لکھتے ہیں وہ دراصل گمراہ کن خیالی باتوں کو ناول کی شکل میں پیش کرتے ہیں جو دلچسپ تو ہو سکتی ہیں لیکن قابل اعتبار نہیں۔''

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس ناول کے جس خاص موضوع یا رویئے پر سوال کھڑا ہو سکتا ہے وہی اس کا اہم وصف ہے۔ اس میں سچے اور حقیقی واقعات ہیں۔ زندگی کی تلخ سچائیاں ہیں غیر معمولی مشاہدہ و مطالعہ ہے۔ دھڑکتا ہوا بلکہ سلگتا ہوا آج کا ہندوستان اور مسلمان ہے۔ خوبیاں اور بھی ہیں جس کا ذکر میں کر چکا ہوں مجھے کچھ اختلاف بھی ہے اس کا بھی میں نے ذکر کیا ہے۔ کمزوریاں تو ''آگ کا دریا'' اور ''گئودان'' میں بھی ہیں۔'' کئی چاند تھے'' میں تو کچھ زیادہ ہی کمزوریاں ہیں اس کے باوجود اسے بڑا ناول کہا جا رہا ہے۔ بہر حال میں حسین الحق کے ہی ایک مضمون کے ان جملوں پر اپنی گفتگو تمام کرتا ہوں۔

''اردو کے جو اچھے ناول ہیں ان کی نوعیت کا تعین ان ناولوں کے اندر ہی تلاش کرنا ہوگا یہ تخلیق کی اپنی تخلیقی شرائط اور ہنر کاری کے مترادف عمل ہے جس کے اختیار کی تلقین پر ہمارے جید ناقدوں کے چہرے بالعموم بگڑنے لگتے ہیں مگر ناول کی نوعیت کی تلاش کا یہی عمل صائب ہے۔''

(اردو ناول منصب اور صورت حال)

اردو افسانے کے متنوع اسالیب

(ایک اجمالی جائزہ)

حسین الحق

دنیا کا ہر بڑا ادب اپنے مخصوص طرز اظہار کی وجہ سے بڑا اور اہم بنتا ہے۔

برناڈ شا کے ڈرامے ہوں یا کولرج، ایلیٹ اور ایٹس کی شاعری، گورکی کا ناول، ''ماں'' ہو یا پریم چند کا افسانہ ''کفن''، ہر ایک کا بنیادی نقطۂ ساخت اس کا اسلوب ہے۔

حالانکہ گولڈ مین ادب کے وظیفے کو Two fold appeal کہتا ہے اور اس اپیل میں جلوہ ہائے حیات کو اولیت بخشتا ہے۔ اور اس کے piece of art ہونے کی گفتگو تذکرۂ حیات کے بعد کرتا ہے۔ مگر اس سلسلے میں دو خاص باتوں کا پیش نظر رہنا ضروری ہے۔ اوّل تو یہ کہ ادب کا اصل وظیفہ ''کیا'' نہیں ہے بلکہ ''کیسے'' ہے۔ دوسری بات یہ کہ اسلوب کے ذکر میں انیسویں صدی کی آخری چوتھائی تک گولڈ مین کے الفاظ میں Domination of the personality of writer تھا۔ یعنی فن کار کو فن پارے پر ترجیح دی جاتی تھی۔ اور اسی لئے منشائے مصنف کا مسئلہ خاصا اہم تھا۔ مگر بعد میں صورت حال بہت تبدیل ہو گئی۔

روسی ہیئت پسندی کی تحریک (جیسے روس کے سیاسی حالات نے ۱۹۲۹ء کے آس پاس زندہ در گور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی) کے عمائدین کے خیال میں ادب بنیادی طور پر ایک لفظی لسانی وجود ہے۔ اسی خیال کی توسیع کرتے ہوئے وزیر آغا کہتے ہیں کہ ''ادب عام تحریر کو لفظی سطح پر منتخب کر کے انوکھا بنا دیتا ہے۔ اور یہی بات تخلیقی افسانہ نگار غیاث احمد گدی بھی کچھ یوں کہتے ہیں۔

''اپنے مزاج کے مطابق کہانی لکھنے والا ایک نکتے کو چن لیتا ہے، کوئی ایک منظر جو اسے بہت بھاتا ہے، یا کوئی ایک واقعہ جو پوری کہانی میں بظاہر ایک معمولی سنگ ریزے کی طرح پڑا ہوتا ہے۔ جسے نگاہیں اکثر در گزر کر جاتی ہیں۔ وہی واقعہ، وہی سنگ ریزہ لکھنے والے کی نگاہ کو پکڑ لیتا ہے۔ پھر وہ اسے اٹھاتا ہے۔ اس کی گرد صاف کرتا ہے۔ حسب ضرورت اس کو چمکاتا تراشتا ہے۔ بالآخر اس لائق بنا دیتا ہے کہ آپ لامحالہ اس کی جانب متوجہ ہو جائیں۔ (غیاث احمد گدی۔ پڑاؤ کا پیش لفظ) گویا اس نقطہ نظر کے مطابق ادب کا بنیادی جو ہر لفظ ہے، موضوع نہیں۔

البتہ یہ لفظ جب نظم بنتا ہے تو اس کا وظیفہ دوسرا ہوتا ہے۔ اور جب نثر بنتا ہے تو اس کا تفاعل مختلف ہوتا ہے۔ آل احمد سرور کے لفظ میں ''نظم اس چاندنی کی طرح ہے جس میں سائے گہرے اور بلیغ ہوتے ہیں۔ اور نثر اس دھوپ کی طرح ہے جو ہر چیز کو آئینہ کر دیتی ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ نثر کی ہر چیز کو آئینہ کر دینے والی دھوپ بھی لفظ بلکہ اس لفظ کی بنیادی وظیفے کے آڑے نہیں آپاتی جو ادب بن رہا ہے۔

اس نقطہ نظر سے جب میں نے غور کیا تو احساس ہوا کہ اردو کے ابتدائی قصوں سے عہد حاضر تک افسانوی لفظ نے یعنی افسانوی اظہاریئے یا افسانوی اسلوب نے مسلسل اپنا تنوع ثابت کیا ہے۔ پہلی منزل پر تو انشا اللہ خاں انشاء کی کہانی ''رانی کیتکی'' کو ہی پیش نظر رکھنا ہوگا جسے اردو کی پہلی کہانی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ کہانی ۱۸۰۳ء کی ہے۔ یعنی آج سے دو سو برس پہلے کی، اس کہانی کی ابتدا ملاحظہ کیجئے۔

''کسی دیش میں کس راجہ کے گھر ایک بیٹا تھا۔ اسے اس کے ماں باپ اور سب گھر کے لوگ کنور اودے بھان کہہ کر پکارتے تھے۔ سچ مچ اس کی جوبن کی جوت میں سورج کی ایک سوت آن ملی تھی۔ اس کا اچھا پن اور بھلا لگنا کچھ ایسا نہ تھا جو کسی کے لکھنے اور کہنے میں آسکے۔ پندرہ برس بھر کے سولھے میں پاؤں رکھا تھا۔ کچھ یوں ہی سی اس کی مسیں بھیگ چلی تھی۔ اکڑ مکڑ اس میں بہت سی سما رہی تھی۔ کسی کو کچھ نہ سمجھتا تھا۔ پر کسی بات کے سوچ کا گھر گھاٹ نہ پایا تھا۔ اور چاؤ کی ندی کا پاٹ اس نے دیکھا نہ تھا۔ ایک دن ہریالی دیکھنے کو اپنے گھوڑے پر چڑھ کر اٹکھیل پنے اور لڑکپن کے ساتھ دیکھتا بھالتا چلا جاتا تھا۔ اتنے میں ایک ہرنی جو اس کے سامنے آئی تو اس کا جی لوٹ پوٹ ہوا۔ اس ہرنی کے پیچھے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھوڑا اپھینکا۔ بھلا کوئی گھوڑا اس کو پا سکتا تھا؟ جب سورج چھپ گیا اور ہرنی آنکھوں سے اوجھل ہوئی تب تو یہ کنور اودے بھان بھوکا پیاسا اور اداس جمائیاں اور انگڑائیاں لیتا ہوا ہکا بکا ہو کے لگا آسرا ڈھونڈنے۔ اتنے میں کچھ امرئیاں دھیان چڑھیں، ادھر چل نکلا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ چالیس پچاس رنڈیاں ایک سے ایک جوبن میں اگلی جھولا ڈالے ہوئے پڑی جھول رہی ہے۔ اور ساون گاتیاں ہے۔ جو انہوں نے اسکو دیکھا ''تو کون؟'' کی چنگھاڑ سی پڑ گئی۔''

اس بیان کے مقابل اگر داستانوں کی رمزی بیانیہ اور ''گزرا ہوا زمانہ'' کا تمثیلی بیانیہ دیکھیے تو احساس ہوگا کہ رانی کیتکی کی کہانی، گزرا ہوا زمانہ اور کفن ہی نہیں بلکہ سجاد حیدر یلدرم کی کہانی، خارستان و گلستان، سلطان حیدر جوش کی ''طوق آدم'' اور نیاز فتح پوری کی ''کیوپڈ سائکی'' کی صورت میں اردو قصہ شروع ہی سے راست بیانیہ اور استعاراتی یا رمزی دو صفوں میں منقسم رہا ہے۔

راست بیانیہ جب اپنی رفعتوں کو چھوتا ہے تو کفن ''پوس کی رات'' (پریم چند) کلیاں اور کانٹے (اختر اور ینوی) الاؤ (سہیل عظیم آبادی) میلہ گھومنی (علی عباس حسینی) نیند نہیں آتی (سجاد ظہیر) مہاوٹوں کی ایک رات (احمد علی) حرام زادی (حسن عسکری) سوگندھی (منٹو) زندگی کے موڑ پر (کرشن چندر) گرہن (راجندر سنگھ بیدی) پرمیشر سنگھ (احمد ندیم قاسمی) آپا (ممتاز مفتی) آنندی (غلام عباس) آخری کوشش (حیات اللہ انصاری)، گڈریا (اشفاق احمد) جلاوطن (قرۃ العین حیدر) اور ''افعی'' (غیاث احمد گدی) جیسی معرکتہ الآرا کہانیاں اردو ادب کو نصیب ہوتی ہے۔دوسری طرف جب استعاراتی یا رمزی بیانیہ کا فنی سرجوش مائل بہ اظہار ہوتا ہے۔تو خارستان و گلستاں (سجاد حیدر یلدرم) طوق آدم (سلطان حیدر جوش) کیوپڈ و سائیکی (نیاز فتح پوری۔ زریں تاج (عزیز احمد) چھڑی (کرشن چندر) روغنی پتلے (ممتاز مفتی) پھندے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، منٹو معلوظات حاجی بابا گل بیکتاشی (قرۃ العین حیدر) زرد کتا (انتظار حسین) بازگوئی (سریندر پرکاش) پرندہ پکڑنے والی گاڑی (غیاث احمد گدی)۔دو بھیگے ہوئے لوگ (اقبال مجید) طاؤس چمن کی مینا (نیر مسعود)، پرندے (الیاس احمد گدی)، سواری (خالدہ حسین) مطلع (احمد یوسف) کمیں گاہ (شفق) گنبد کا کبوتر (شوکت حیات) سنگھاردان (شموئل احمد) باغ کا دروازہ (طارق چھتاری) اور بادصبا کا انتظار (سید محمد اشرف) جیسی خوبصورت استعاراتی کہانیاں اردو ادب کو نصیب ہوتی ہیں۔

بیان کے ان دو بنیادی رجحانات یعنی راست بیانیہ اور استعاراتی بیانیہ کا بین بین اسلوب و اظہار کے متعدد شیوے اور جلوے آپ کو دکھائی دیں گے۔

افسانوی اسلوب کا ایک رخ بیان کا پُرشکوہ آہنگ ہے۔اس اہنگ کی ساخت بافت میں ترقی پسندانہ انداز وفکر کا بیج دفن ہے۔ بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ نظریاتی انداز کا بیج دفن ہے۔اس آہنگ کی مثال کے لئے ''ہم وحشی ہیں'' اور ''انسان مرگیا'' جیسے افسانوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

پُرشکوہ آہنگ کے علاوہ افسانوی اسلوب کا ایک اور آہنگ احتجاجی اور باغیانہ ہے۔ یہ آہنگ پُرشکوہ آہنگ سے بھی آگے کی چیز ہے۔جس میں چیخ کی کیفیت نمایاں ہے۔اس کی مثال کے لئے انگارے گروپ کے مصنفین کے متعدد افسانے پیش کئے جاسکتے ہیں۔جو آج بھی اتنے ہی کارآمد ہیں ۳۳-۱۹۳۲ء میں تھے۔

اسی طرح سرسید کے ''گزرا ہوا زمانہ'' میں اصلاحی اسلوب کی کروٹیں محسوس کی جاسکتی ہیں۔ حالانکہ اس سلسلے میں دو باتیں خاص طور پر پیش نظر رہنی چاہیے۔اول تو یہ کہ اصلاحی بنیادی پر ایک فکری تفاعل ہے۔مگر فکر

ہمیشہ اپنا اسلوب خود تلاش کرتی ہے۔اس لئے اصلاحی فکر نے پُرشکوہ آہنگ اور باغیانہ آہنگ کے برعکس ایک ایسے مدھم آہنگ کو اپنے لئے کارآمد محسوس کیا جس میں علامت واستعارہ کے مشکل ابلاغ کی جگہ تمثیل کی ممکن تفہیم معاون ہو۔''گزراہوازمانہ'' میں تمثیل کی یہ ممکن تفہیم دامن کش دیدہ ودل ہے۔البتہ اس سلسلے میں اس امر کی جانب اشارہ بھی ضروری ہے۔کہ بعد کے دنوں میں اصلاحی اسلوب نے کہانی وافسانہ سے زیادہ ناولوں کو اپنے لئے کارآمد سمجھا ۔راشدالخیری اورنذیراحمد کے ناول مثال کے لئے پیش کئے جاسکتے ہیں۔مذکورہ اسالیب...............

مگر خاطر نشاں رہے کہ اسلوب کا بنیادی تعلق تو فن سے ہے اور جب ہم فنی نقطہ نظر سے افسانوی اسالیب کے بارے میں سوچتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس لحاظ سے بھی اردو افسانہ غریب نہیں ہے۔تلمیح، تمثیل، تشبیہ، استعارہ، علامت، تجرید، سررئیلائی طرزِ اظہار، فلیش بیک، شعور کی رَو، کولاژ، ایبسرڈ، بیانیہ اور پیچیز، پر مشتمل بیانیہ ایمانداری سے غور کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ اردو افسانہ اسلوبیاتی رنگارنگی کا ایک ہرا بھرا باغ ہے۔

جہاں تک تلمیح کا سوال ہے تلمیح کا استعمال شاعری میں زیادہ ہوتا ہے۔مگر افسانہ جب من حیثِ صنفِ ادب شاعری کا غیر منطقی رویئے سے بھی خوشہ چینی کرنے لگا۔تو افسانے میں بھی ان صنعتوں کا استعمال روا سمجھا جانے لگا۔تلمیح بھی ایسی ہی صنعتوں میں سے ایک ہے۔اس سلسلے میں منظر کاظمی، شفق، انجم عثمانی، اور قمر احسن وغیرہ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔مگران میں بھی شفق کی تخصیص یہ ہے کہ انہوں نے اس صنعت کی توسیع کی اور تلمیح اور تمثیل کے ڈانڈے حقیقت سے ملادئے۔

بظاہر تلمیح وتمثیل میں کوئی منطقی تعلق نہیں ہے۔کیونکہ تلمیح ماضی کے تاریخ اور اسطوری واقعات کو فن کے خام مواد کے طور پر استعمال کرتی ہے۔اور تمثیل وہ فن ہے جس میں پیکروں کا ایک ایسا دستہ تیار کیا جاتا ہے جو حسّی اور غیر حسّی ہر طرح کے پیکروں کو تجسیمیت عطا کرتا ہے۔ماضی میں ''سب رس'' سے نیرنگِ خیال تک تمثیل کو کسی نہ کسی اخلاقی واصلاحی وافادی مقصد براری کے لئے استعمال کیا جاتا رہا۔مگر شفق نے تلمیح کے باطن سے تمثیل کو کچھ اس طرح تلاش کیا کہ کربلا کی تلمیح کو مائی لائی اور العرش کی تمثیل بنادیا۔اس سلسلے میں خاص طور پر ''اندھی رات'' ''آسیب اور پناہ گزیں'' کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔جہاں تلمیح وتمثیل کا خوبصورت آمیزش دستیاب ہے۔

تلمیح وتمثیل کے بعد علمائے بلاغت نے اشارہ اور نشانی پر بھی گفتگو کی ہے۔مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسلوب کی سطح پر یہ دونوں صنعتیں راست بیانیہ کہ خوبصورت فنی نمونوں میں تحلیل ہوگئی ہیں۔اس لئے تشبیہ پر توجہ صائب ہوگی، تشبیہ اشارہ اور نشانی کے بعد تخلیقی وصف کی بڑی خوب صورت اور پائیدار شکل ہے۔تشبیہ کا استعمال

اس وقت ہوتا ہے جب کسی بات کا سمجھنا مقصود ہو۔اس کی تفہیم کی خاطر ایسی مثالیں دی جاتی ہیں۔جس کے ذریعے قاری سامع تک کسی بات کی ترسیل آسانی سے ہو جائے۔اس کے علاوہ اکثر دلی جذبات اور الفاظ کے وجدانی معنی اور صورتِ حال کی جذبیت یا وجدانیت کے اظہار کے لئے بھی تشبیہوں کا استعمال ہوتا ہے۔

ادب میں تشبیہ کا استعمال کا خاص مقصد یہ ہے کہ مجرد احساسات، کیفیات، تہہ در تہہ جذبات اور پیچیدہ تجربات اس طرح ایک مجازی روپ اختیار کر لیں کہ قاری کے سامنے بھی وہ جانی پہچانی صورتِ حال بن جائیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ تشبیہہ دو چیزوں کے درمیان مشابہت پیدا کرتی ہے۔ایک کامیاب تشبیہ وہ ہے۔جس میں مشبہ اور مشبہ بہ ایک دوسرے سے معنوی اور وجدانی طور پر بہت قریب ہوں اور ہم معنی و ہم کیفیت ہوں۔مگر اسی مقام پر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ تشبیہہ میں مشبہ اور مشبہ میں مماثلث تو ضرور ہوتی ہے۔مگر دوئی کا احساس باقی رہتا ہے۔فی الوقت اردو میں تشبیہی اسلوب کے بہتر نمونے طارق چھتاری کے یہاں موجود ہیں قمر جہاں کے بعض افسانوں میں بھی یہ تشبیہی کیفیت دستیاب ہے۔

تشبیہ کے بعد کی منزل استعارہ ہمیں اچانک جذبات واحساسات کی ایک وسیع، روشن اور تر و تازہ دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔جو تشبیہی کائنات کی بہ نسبت زیادہ روشن، ہنگامہ پرور اور جاذب نظر ہے۔استعارہ اور بالخصوص علامتی استعارہ جو نثر و اور شاعری دونوں میں انتہائی اہم تخلیقی ضرورت ہے۔لفظ کی دوہری معنویت عطا کرتا ہے۔ جس سے ایک دلکش قسم کا علامتی ابہام پیدا ہوتا ہے۔اور اسی ابہام کے سبب کبھی کبھی کچھ ایسا فنی التباس پیدا ہو جاتا ہے کہ استعارہ اور خصوصاً علامتی استعارہ اور علامت کے درمیان حد فاضل قائم رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔۔مثلاً سریندر پرکاش کے ساتھ ساتھ غیاث احمد گدی، اقبال مجید، اور انور عظیم کے یہاں بھی علامتی افسانوں کی موجودگی کی بات کی جاتی ہے۔جب کہ تینوں حضرات بنیادی طور پر استعاراتی افسانہ نگار ہیں۔اور کہیں اس کے استعارے زقند بھی بھرتے ہیں۔تو وہ علامتی استعارہ تک پہنچ جاتے ہیں۔استعاراتی افسانوں میں سنگھار دان''یادبسیرے'' باد صبا کا انتظار وغیرہ بھی مثلاً مذکور ہیں۔

اور جہاں تک علامت کا سوال ہے علامت کا ہمارے اظہاریے سے گہرا تعلق ہے اگر انسانی تاریخ کے ابتدائی ماخذ یعنی مذہب کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بنیادی تخلیقی سوتا (غیب) بھی اپنا اظہار نشانیوں (آیات) تمثالوں اور علامتوں کے ذریعہ ہی کرتا ہے۔لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ زندگی ابتدائے آفرینش سے اپنا اظہار علامتوں کے ذریعہ کرتی آئی ہے۔

وزیر آغا جس وصف کی طرف اشارہ کر رہے ہیں یہ وہی تخلیقی بدل ہے جو سریندر پرکاش کے افسانے ''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'' میں ایک تسلسل کے ساتھ لاٹھی ٹیک کر آنے جانے والے اور کبھی ہاتھ نہ آنے والے بوڑھے کو وقت کی علامت بنا دیتا ہے۔اس سلسلے میں قمر احسن کے افسانے اسپ کشت مات'' کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔جس کا بنیادی موضوع خیال کے مادّے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

مذکورہ علامتی اسلوب کے علاوہ علامت نگاری(The movement of symbolism) کا ذکر بھی ضروری ہے۔مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ علامتی اسلوب کے برعکس تحریکِ علامت نگاری اسلوب نہیں، بلکہ رویہ فکر اور تحریک ہے۔ جو فرانس میں قائم ہوئی اور باضابطہ منشور والی تحریک بنی۔اس کی سرّیت اور اس کا غیر عقلی رویہ اردو میں مقبول نہیں ہو سکا۔احمد ہمیش کے افسانے ''مکھی'' اور شوکت حیات کے افسانے ''لا کے نام ایک خط'' پر اس تحریک کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بقول وہاب اشرفی اردو میں علامتی افسانہ لکھے ہی نہیں گئے۔

اس تحریک کا اہم عنصر بغاوت ہے۔رومانوی تحریک کی طرح اس تحریک نے بھی ماضی کے سارے سرمائے سے انحراف کیا، ادب و زندگی کا ایک نیا اور تقریباً ماورائی تصور دیا۔ان ہی معنوں میں اس تحریک کو ترقی پسند تحریک کی ضد کہا جا سکتا ہے۔سچ غالباً یہ ہے کہ اردو میں یہ تحریک مقبول نہ ہو سکی۔

غرض اردو افسانے متنوع اسالیب سے مالا مال ہیں۔اس کی اسلوبیاتی ادا کے شیوے ہزار ہیں۔اس صنف کے اظہار نے عہد بہ عہد نئی کروٹیں لی ہیں۔اور آج بھی اسلوب کے نقطۂ نظر سے اگر غور کیا جائے تو احساس ہوگا کہ زندہ رواں پانی کی طرح اردو افسانے کے دریائے اسلوب میں نئی نئی لہریں آ رہی اور جا رہی ہیں۔ مثلاً ایک طرف محسن خان کا افسانہ ''زہرا'' ہے تو دوسری طرف ذوقی کا ایک واقعہ کی زیرک کاپی'' تیسری طرف قاسم خورشید کا ''پوسٹر'' چوتھی طرح خالد جاوید کے کئی افسانے۔''زہرا'' میں راست بیانیہ ہے۔اس ضمیر الدین احمد کے سوکھے ساون'' کے ساتھ پڑھا جائے تو دو فنکاروں کے درمیان خوبصورتی فنی مماثلت کا جواز مہیا ہوتا نظر آئے گا۔ ''پوسٹر'' میں احتجاجی اور حزنیہ اسلوب کا خوبصورت فنی امتزاج ہے۔خالد جاوید کے افسانوی نظام میں مونولاگ سے ابھرتا ہوا ایسا بیانیہ نظر آئے گا جو راست بیانیہ محسوس ہوتا ہے۔مگر جو اپنی اصل میں استعارے کی سرحدوں میں داخل ہوتا ہوا اور اس کے باوجود داخل نہ ہونے والا Illusive ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ اردو افسانے کی اسلوبیاتی کائنات دھنک رنگ ہے، بلکہ شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہاں

ایک نہیں کئی کہکشائیں ہیں۔اس کے اس کے باوجود بنیادی طور پر مرکز دو ہی ہے۔(۱) راست بیانیہ (۲) رمزی یا استعاراتی بیانیہ۔

آپ چاہیں تو آسانی کے لئے راست بیانیہ کی فوج میں (۱) پرُشکوہ آہنگ (۲) احتجاجی اور باغیانہ اسلوب (۳) اصلاحی اسلوب (۴) مکالماتی اسلوب (۵) تلمیحی بیانیہ اور تشبیہی بیانیہ کو شامل کر سکتے ہیں۔دوسری طرف (۱) استعاراتی بیانیہ (۲) تمثیلی بیانیہ (۳) علامتی بیانیہ (۴) تجریدی بیانیہ (۵) سرریلایی طرز اظہار اور (٦) لایعنی بیانیہ کو استعاری یا رمزی اسلوب کے splinters میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

البتہ پیچز پر مشتمل بیانیہ، فلیش بیک، شعور کی رو اور خود کلامی وغیرہ اظہار وادا کے ایسے ذرائع اور تلنکس ہیں۔جو راست بیانیہ اور استعاری بیانیہ دونوں کے معاون و مددگار نظر آتے ہیں۔

آج جب امتزاجی تنقید کی بات کی جارہی ہے اور امتزاجی انداز فکر و اظہار کے نمونے بھی منظر عام پر آنے لگے ہیں۔ضرورت ہے کہ اس امر پر غور کیا جائے کہ عصر حاضر کی فکری و فنی ضرورتوں کے پیش نظر فن افسانہ کا میاب عصری اسلوب کیا ہوگا؟ یا کیا ہونا چاہیئے ؟ استعاراتی راست بیانیہ؟ یا ایسا استعاراتی بیانیہ جس میں راست بیانی کے عناصر بھی شامل ہوں؟ یا ایسا راست بیانیہ جس میں رمز و استعارہ کے لشکارے بھی فنی بیانیہ کا اگر لازمی نہیں تو کم از کم پسندیدہ عنصر ضرور ہوں۔

تنقید کی باقر خوانی کھانے والے اس سلسلے میں کچھ محنت کریں گے۔یا نئے افسانے کے نئے اسلوب کے سویرے کا ظہور پذیر ہونا بھی تخلیق کاروں ہی کے کھاتے میں جائے گا؟؟

عالمی فلک آپ ہی کا رسالہ ہے۔

آپ کا قلمی تعاون ہماری ہمت افزائی کا موجب ہوگا۔

مشمولات پر آپ کی بے باک رائے معیار کی بلندی میں معاون ہوگی۔

(ادارہ)

کہانی

ناگہانی

حسین الحق

بی بی عزت النساء اپنا کام جلدی جلدی نپٹانے میں مصروف تھیں۔

انھوں نے برتن مانجھتے مانجھتے ذرا دھڑ باہر کر کے دیکھا، شام بھاگی چلی آ رہی تھی اور ڈھیر سارا کام سر پر پڑا تھا۔ دوپہر میں ذرا آنکھ کیا لگ گئی کہ سب اُلٹ پلٹ ہو گیا۔ یاد آیا کہ برتن دھو کر صبح سے کپڑا بھی دھونا ہے اور وہ بھی پیشاب اور گندگی سے اٹا ہوا۔

بچے بڑے ہونے لگے تھے تو امید بندھی تھی کہ اب پوتڑے دھونے سے نجات مل جائے گی مگر قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ شوہر کو فالج مار گیا، چلنے پھرنے سے معذور، بولنے کی کوشش کرتا تو بہ مشکل ''پانی''، ''کھانا'' نکل پاتا۔ عام بیماری میں آدمی چڑ چڑا ہو جاتا ہے۔ عزت النساء کا شوہر جلال الدین تو سخت بیماری میں مبتلا تھا۔ وہ جب تک بھلا چنگا رہا تو اپنے نام کے مصداق ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دی۔ کیا گھر کیا محلہ، مجال کیا کہ کوئی معاملہ اس کی مرضی کے خلاف ہو جائے اور وہ برداشت کر لے، تو تو میں میں سے گالی گلوج پر اتر آتا مگر اپنی بات گرنے نہیں دیتا۔

عزت النساء بیاہ کر سسرال آئیں تو شروع شروع میں بڑی وحشت ہوئی، کس وحشی سے پالا پڑ گیا ہے؟ مگر بہن بھائی سہیلی سب ہی نے سمجھایا کہ زمیندارانہ مزاج ہے بڑے گھر کا بگڑا ہوا نواب، کچھ دنوں برداشت کر لو۔ آہستہ آہستہ اپنی محبت کی زنجیر میں ایسا باندھو کہ سب کس بل ڈھیلا ہو جائے۔ عزت بی بی نے مشوروں کے مطابق اس کی بدسلوکی بلکہ وحشت کے مقابلے پر اپنا حسن سلوک نہیں بلکہ محبت آزمانی شروع کر دی مگر جلال الدین کے اندر تو کوئی ایسا وحشت ناک درندہ چھپا بیٹھا تھا جو عام لمحات کی تو بات الگ رہی بستر پر بھی عزت النساء کے ساتھ صحبت بالجبر ہی کرتا تھا۔ اس کا عام مزاج ایسا تھا کہ جب عزت النساء مائل ہوتیں تو وہ کوئی نہ کوئی ایسا بہانہ تلاش کر لیتا جس کا اختتام عزت بی بی پر لاتوں گھونسوں سے ہی ہوتا اور پھر وہ بے چینی سے کروٹ بدل کر سو جاتا۔ عزت النساء کی کیا مجال کہ ایسے وقت میں اس کو اپنی طرف مائل کر پاتیں۔ پھر جب ان کی ماہواری کے دن آتے تو جلال الدین اس کی طرف رجوع ہوتا۔

ظاہر ہے ان چند دنوں میں وہ نجات کے خواہاں رہتیں مگر وہی چند دن ان کی مصیبت کے دن بھی ہوتے۔ ہر مہینے میں تقریباً ایک ہفتہ جلال الدین وحشی درندوں کی طرح نہیں بلکہ پاگلوں کی طرح اسے نوچتا بھنبھوڑتا۔ عزت النساء بچنا چاہتی مگر بچ نہیں پاتی اور پھر یہ بھی کہ جن دنوں کا ذکر ہے وہی زمانہ تو عزت النساء کے بھی چڑھتے دریا کا زمانہ تھا، لاکھ نوچ کھسوٹ ہو، دو جسموں کا ٹکراؤ تو جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے، سو بالآخر عزت النساء تھکان کے ساتھ ساتھ جذبات سے بھی مغلوب ہو کر آنکھیں بند کرکے پڑ جاتیں۔

ان کے تینوں بچے ان ہی دنوں کے آس پاس کے یادگار تھے۔

یہ سلسلہ شادی کے تقریباً سات آٹھ سال چلا، بڑی بیٹی چھ سال کی تھی جب شوہر پر فالج کا حملہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ بلڈ پریشر ہائی ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا۔ عزت النساء کو حیرت نہیں ہوئی۔ ایسے گرم مزاج آدمی کا بی پی ہائی ہوا تو حیرت کی کیا بات؟ مگر بلڈ پریشر ہائی ہونے کی جو وجہ تھی اس نے صرف جلال الدین کو مفلوج نہیں کیا پورے گھر کو فالج زدہ بنا دیا۔

اب وہی نہیں رہا جس پر میاں کودیں۔ زمینداری کے بل پر صرف جلال الدین کا غضب نہیں چلتا تھا، پورا گھر چلتا تھا، زمینداری گئی تو گھر کے سارے ہالی موالی بھی لیتی گئی اور بے زمینی سے گھبرا کے اس کے بھائی بھی دوسرے شہروں کو سدھار گئے، بعد میں خبر ملی کہ ان ہی شہروں سے پاکستان روانہ ہو گئے۔ بچ گئے جلال الدین کے بوڑھے ماں باپ، وہ وقت کی مار زیادہ نہ سہہ سکے اور بس دو برس میں آگے پیچھے عدم آباد سدھارے۔ خود عزت النساء کے مائیکے والے پہلے پاکستان جا چکے تھے۔ عزت النساء کی کائنات بس تین بچے اور فالج زدہ شوہر!

عزت النساء کے لیے زندگی خارش زدہ کتے کے سر کا زخم بن گئی تھی۔

اسی زمانے میں لالہ ہربیہر پرشاد اس کے گھر آئے۔

لالہ ہربیہر پرشاد جلال الدین کے خاندانی منشی لالہ بنسی دھر پرشاد کے چھوٹے بھائی تھے، بنسی دھر تھے تو جلال الدین کے ہم عمر، مگر جلال الدین کے سامنے بیٹھے نہیں دیکھے گئے، ڈیوڑھی پر جب آتے تو انداز ایسا ہوتا جیسے کتا دم ہلا رہا ہو، سب سے پہلا کام یہ کرتے کہ ڈیوڑھی کے باہر ہی جوتی اتار دیتے۔ دھوتی کھول کے لنگی بنا لیتے اور برآمدے میں پڑی بینچ پر چپ چاپ بیٹھ جاتے۔ اب اگر ایک گھنٹہ اندر سے کوئی باہر نہیں نکلا تو اس سے لالہ بنسی دھر کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کبھی خوش قسمتی سے اگر دس پندرہ منٹ بعد ہی

کوئی باہر آ گیا تو خبر ہو جاتی کہ لالہ آ گئے ہیں۔ مگر خبر ہونے پر بھی یہ کوئی ضروری نہیں تھا کہ میاں (جلال الدین) لالہ سے مل ہی لیں۔

لالہ کا کام تھا کہ آئیں اور بیٹھ جائیں اور جب جلال الدین کہہ دیں یا کہلوا دیں تب ہی لالہ جائیں۔

گھر کی ساری ضرورت، ہینگ ہلدی سے کپڑے زیور تک لالہ ہی پوری کرتے۔ نہ کبھی لالہ نے پیسہ مانگا نہ کسی نے دیا۔ جلال الدین نے بھی لالہ سے کبھی حساب نہیں لیا۔ کتنا کھیت ہے کتنا نقدی پر گیا، کتنے کی لالہ نے خود بوائی کرائی، کتنا رہن رکھا گیا، کتنا بیچا گیا یہ سارا معاملہ بنسی دھر کے ذمہ تھا۔ آخر تو وہ مختار عام تھے!

مگر جب زمینداری چلی گئی تو لالہ بھی کاہے کے مختار.......!

یاد آیا باغ تو بچا ہوگا، مگر عزّت النساء کس سے پوچھتیں، جلال الدین تو کہنے سننے کی منزل سے بہت آگے نکل چکے تھے، زندہ لاش نے کب کس کو کچھ بتایا، سوچا کہ لالہ بنسی سے پوچھا جائے مگر اب لالہ میسر کہاں تھے، ہر دن ڈیوڑھی پر حاضری لگانے والے لالہ کو دیکھے ہوئے پانچ چھ مہینے گزر گئے۔ جلال الدین کے بیمار پڑنے کے بعد مہینے دو مہینے تک وہ پابندی نبھاتے رہے لیکن جب جب تمام ڈاکٹروں سے پوچھ پاچھ کر اطمینان کرلیا کہ یہ فالج اب موت کے ساتھ ہی جائے گا۔ اور میاں اب کسی کو کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں رہ گئے ہیں تو پھر آہستہ آہستہ لالہ کی آمد میں ناغہ پڑنے لگا۔

جب لالہ کو گئے مہینے پر مہینے گزرنے لگے اور گھر کا سامان بکنے کی باری آ گئی تو پہلی مرتبہ عزت النساء نے ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھا۔

برقعہ پہن کر باہری پھاٹک پر پہنچیں تو اتفاق سے اسی وقت خاندانی کہار گھورن سامنے آ گیا۔

''مالکن کہیں جانا ہے کیا؟''

''لالہ بنسی دھر کے یہاں جانے کو سوچ رہی ہوں''

''آپ کاہے جائیں؟ ہم بلائے لاتے ہیں۔''

عزت النساء ہلکے سے ہنسیں۔ ''زمانہ بدل چکا گھورن، مجھے ہی جانا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے مالکن۔ آپ ڈیوڑھی پر ہی رہیں۔ ہم ابھی ڈولی لے کر آئے۔''

''رہنے دو پیدم چلی جاؤں گی۔''

گھورن ڈنڈوت ہو کر گڑگڑانے لگا۔ ''مالکن ایسا مت کیجئے، جب تک ہم جیوت ہیں۔ایسا نہیں ہوگا۔''

عزّت النساء ذرا آواز سے ہنسیں۔ ''اچھا ٹھیک ہے ڈولی لے کر آؤ۔''

لالہ کے گھر عزت النساء پہنچیں تو ایک خاموش ہلچل مچ گئی۔

گھورن نے پہنچتے ہی گہار لگا دی تھی۔ ''مالکن کے یہاں سے سواری آئی ہے۔''

لالہ کی بوڑھی ماں تیز قدموں سے چلتی ہوئی خود باہر آ گئیں۔

''مالکن آپ؟''

''جی ہاں! سوچا کہ ذرا آپ کا گھر بھی دیکھ لوں۔''

عزت النساء نے ہلکے سے مسکرا کر جواب دیا اور گھر پر ایک نگاہ کی۔ ان کی اپنی حویلی سے بڑی تھی ان کے منشی کی حویلی۔ چاروں طرف قدم آدم چہار دیواری، احاطے کے اندر ایک غلام گردش، دوسری طرف طویلہ، تیسری طرف گئو شالہ، ایک کنارے پر چھوٹا سا ایک مندر، مندر سے ذرا ہٹ کے کنواں، بیچوں بیچ لالہ کا مکان، باہری حصہ الگ، اس کے بعد ذرا ہٹ کر اندرونی دونوں حصوں کو جوڑتی ہوئی ایک مختصر سی برساتی۔اسی برساتی کے راستے ماتا جی عزت النساء کو لیے لیے اندر چلی گئیں۔

مکان کے اندرونی حصے میں بڑے چھوٹے سب نظر آئے سوائے بنسی دھر کے!

وہیں پہلی بار نظر آئے.........لالہ ہریہر پرشاد!

سرخی مائل گورا رنگ، تیکھا نقشہ، متناسب قد و قامت، لالہ ہری ہر پرشاد کی خوبصورتی پہلی نظر میں متاثر کرنے والی تھی۔اچانک سرسری طور پر عزت النساء نے سوچا، یہ بنسی دھر سے چھوٹا ہے، مجھ سے برس دو برس بڑا ہوگا۔

جس وقت کا ذکر ہے اس وقت عزّت النساء بتیس برس کی نہیں ہوئی تھیں۔

''لالہ بنسی دھر کہاں ہیں؟'' کچھ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد عزت النساء نفسِ مضمون پر آ ہی گئیں۔

''ان کا حال احوال ہم سے نہ پوچھئے۔اپنی کوکھ کا پیدا ایسا پرایا ہو جائے گا ہم نے سوچا نہیں تھا۔تین ماہ پہلے اپنے بال بچوں کو لیکر دہلی چلے گئے اگر ہریہر نہ ہوتا تو ہمیں کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہوتا۔''

''ان کا پتہ؟''عزّت النساء کواپنی آواز ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''کوئی خبر نہیں بی بی۔بس یہاں سے اتنا کہہ کر نکلے کہ ہمیں اب اس شہر میں نہیں رہنا۔اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے۔''

عزت النساء نے صاف محسوس کر لیا کہ ماتا جی بنسی دھر کے حوالے سے کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتیں۔عزت النساء یہ بھی سمجھ گئیں کہ اس کا مطلب کیا ہے اور یہی بات عزت النساء کا دل بٹھانے والی تھی۔

''اچھا ماتا جی، میں چلتی ہوں۔''

گھر لوٹتے ہوئے وہ ڈولی میں جی بھر روئیں۔اس درمیان انھیں کیا کیا نہ یاد آیا بچپن کے دن، میکے کا آنگن، گھر کے پیچھے باغیچے میں لگے پھل پھول، سکھی سہیلی، بچپنے کے ڈھیر سارے کھیل، رشتے کا ایک بھائی جو اسے دیکھتا تو دیکھتا ہی رہ جاتا اور وہ اس کے باؤلے پن پر کھلکھلا کر ہنستی ہوئی بھاگ جاتی تھیں۔

ڈولی میں بی بی نے کئی دہائیاں بتا ڈالیں۔

گھر پہنچیں تو سب الٹ پلٹ دکھائی دیا،شوہر بستر پر ہی گندگی پھیلا چکا تھا، بچے رو رہے تھے، بڑی بیٹی اپنے جانتے سب کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی مگر باپ تو بہر حال اس کے بس کی چیز نہیں تھا۔ عزت النساء نے پہلے شوہر کی گندگی صاف کی، پھر بچوں کو سنبھالا،تب باورچی خانے کی طرف پلٹ کر تاک سکیں۔باورچی خانے سے فارغ ہوتے ہوتے رات سر پر آن کھڑی ہوئی،سب کو کھلا پلا کر وہ بستر پر گئیں تو دماغ اڑ رہا تھا۔ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں،شوہر کا علاج تو دور کی بات، کھانے کپڑے کا انتظام مشکل ہو گیا تھا۔نزدیک دور نگاہ دوڑائی کوئی بھی تو اس مصیبت کی گھڑی میں کام آنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ایک بھگدڑ ۴۷ میں مچی اور دوسری زمین داری کے خاتمے کے بعد،نزدیک دور جس کے بارے میں سوچتیں تو یاد آتا کہ وہ تو پاکستان چلا گیا۔انھیں لگا کہ اگر جلال الدین مفلوج نہ ہوتا تو وہ بھی پاکستان میں ہی پائی جاتیں۔

گزشتہ چھ مہینوں میں کیا نہیں ہو گیا۔انھوں نے سوچا گھر کا سامان بکا،وہ بی بی جی سے استانی جی بن گئیں۔اس سے بھی کام نہ چلا تو لوگوں کے کپڑے سینے لگیں۔میلاد پڑھانے لگیں۔مگر بات پھر بھی نہیں بن پا رہی تھی۔حکیم صاحب کہتے مفلوج کو کبوتر کے گوشت کا عرق چاہئے،مولوی صاحب کی فیس باقی

تھی، نیا سال شروع ہوگیا۔ نئے درجے کے کتاب کا مسئلہ، ننگی کیا نہائے کیا نچوڑے، عزت النساء ایک دن کا انتظام کرتیں تو دوسرے دن کے لالے پڑ جاتے۔

بی بی عزت النساء کو کبھی کبھی محسوس ہوتا کہ ان کا سر پھٹ جائے گا۔

ایسے ہی حالات تھے جب لالہ ہریہر پرشاد ان کے گھر آئے۔

پوس کا مہینہ جا رہا تھا چاند کی آخری تاریخوں کی رات تھی۔ اندھیرا اُمڈ گھُمڑ کر عزت النساء کے گھر پر برس رہا تھا۔ دور دور تک کہاسہ پھیلا ہوا تھا۔ رات تھوڑی آگے بڑھی تھی۔ دروازہ ابھی بند نہیں ہوا تھا کہ اچانک محسوس ہوا.........دروازہ پر کوئی ہے!

عزت النساء سمجھ نہیں پائیں۔ اس ٹھنڈی اور اندھیری رات میں کون ہوسکتا ہے۔ مگر دروازے پر کسی کے ہونے کا گمان اور یقین زیادہ ہوا۔ انھوں نے لالٹین کی مدھم لو ذرا تیز کی اور بڑی بیٹی رقیہ کو ساتھ لے کر دروازے کی طرف بڑھیں۔

لالٹین کی روشنی میں ہیولا نمایاں ہوا........دروازے پر لالہ ہریہر پرشاد کھڑے تھے۔

''لالہ جی آپ؟''

لالہ ہریہر پرشاد دونوں ہاتھ جوڑے کھڑے رہے۔

کچھ دیر تو وہ صرف دیکھتی رہیں۔ دراصل وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ وہ کیا کریں.....مگر چند ہی لمحوں میں وہ سنبھل گئیں۔ ''لالہ جی رکیے گا......ایک منٹ۔'' کہتی ہوئی پلٹیں۔ جلدی سے باہری بیٹھک کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں، بکنے سے بچی اور گرد میں اٹی دو کرسیوں اور وہیں پڑے ٹیبل کو جلدی جلدی صاف کیا اور دروازے کی طرف لپکیں........

''لالہ جی، آیئے!''

لالہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئے۔ عزّت النساء نے بیٹھنے کا شارہ کیا تو لالہ نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے اور آہستہ سے بولے۔ ''یہ نہیں ہوسکتا پہلے آپ بیٹھیں''

عزّت النساء مسکراتی ہوئی بیٹھ گئیں۔ لالہ کے بیٹھنے کو ''نصف نشست'' یا ''مئودبانہ نشست'' کہا جاسکتا ہے......کچھ دیر دونوں کے درمیان خموشی کا صحرا پھیلا رہا۔ عزت النساء نے محسوس کیا کہ لالہ پہل کرنے میں ہچکچا رہے ہیں۔

''آپ نے کیسے کیسے تکلیف کی؟''

''شرمندہ ہوں۔'' لالہ نے پھر ہاتھ جوڑ لئے۔''پہلے ہی آنا چاہتا تھا، ہمت نہیں کر سکا۔ آج ادھر سے گزر رہا تھا تو طبیعت بہت بے چین ہوگئی۔''

عزّت النساء نے حیرت سے اسے دیکھا اور حیرت سے سنا بھی۔ لالہ کے لہجے میں حزن اور اضطراب دونوں شامل تھے۔ انھیں رشتے کا وہ بھائی یاد آ گیا جو ان کے لیے بولایا بولایا پھرتا تھا۔ شادی کے بعد وہ ایک مرتبہ ملا تھا اور بہت بوجھل لہجے میں پوچھا تھا،''بی بی کیسی ہیں آپ؟'' آپ کو دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔'' بعد کے دنوں میں اس کی آواز پھر گونجی تو انھیں ایسا لگا جیسے مرتا ہوا آدمی خدا حافظ کہہ رہا ہو۔ عزّت النساء اندر سے کانپ گئیں۔''لالہ کی آواز میں پروہ باؤلا کیوں یاد آ گیا؟''

لالہ اس دن تھوڑی دیر بیٹھے۔ ادھر ادھر کی باتیں اور رخصت ہو گئے۔ دو دن چار دن جب ہفتہ گزر گیا تو عزت بی بی جیسے لالہ کا آنا بھول سی گئیں۔ ان کا ہر دن بغیر کسی وجہ اور سبب کے بسر ہوتا رہا۔

ایسے ہی بے سبب اور بے مصرف دنوں میں سے کسی ایک دن ...... لالہ ہری ہر پرشاد دوبارہ آئے۔ بیٹھتے ہی پوچھا۔''بچے کہاں ہیں؟''

''سو گئے۔'' عزت النساء نے آہستہ سے جواب دیا۔

''کیا رقیہ بھی؟''

''نہیں وہ پڑھ رہی ہوگی۔''

''ذرا تکلیف کر لیجئے، اسے بلایئے۔''

عزت النساء رقیہ کو بلا لائیں۔ لالہ نے رقیہ کی ٹھوڑی چھو کر پیار کیا، سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر بغل میں رکھا ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

''بیٹا آپ بھائی بہنوں کے لیے۔''

رقیہ کا ہاتھ بے ساختہ پیکٹ کی طرف بڑھا۔ پھر فوراً ہی اس نے ہاتھ نیچے گرا دیا اور ماں کی طرف دیکھا۔

''لالہ جی اس کی کیا ضرورت تھی۔''

لالہ نے پھر ہاتھ جوڑ لئے۔''بچوں کے لیے ہے۔ راستے میں مٹھائی کی دوکان پر نظر پڑ گئی تو جی چاہ گیا۔''

''لے لو بیٹا تحفہ ٹھکراتے نہیں۔'' کہتے کہتے ان کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ یاد کرنا چاہا کہ بچوں نے مٹھائی کب کھائی تو یادنے ساتھ چھوڑ دیا۔

''چائے لے آؤ۔'' رقیہ جانے لگیں تو عزّت النساء آہستہ سے بولیں۔

''اب رات زیادہ ہوگئی۔ اس وقت تکلیف مت کیجئے۔'' آواز لالہ جی تک پہنچ ہی گئی۔ ان کے ہاتھ پھر جڑ گئے تھے۔

''لالہ اس گھر میں تو اس وقت سے محفل جمنی شروع ہوتی تھی۔'' عزت النساء کے منھ سے ہلکی سی آہ نکل گئی۔

اس موڑ سے عزّت النساء لالہ ہریہر پرشاد کے ساتھ کھلنی شروع ہوئیں۔ لالہ اب ہر دوسرے تیسرے دن آنے لگے اور جب آتے تو بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ لے کر ہی آتے۔

پھر ایک دن: لالہ آئے کچھ دیر بیٹھے اور جلد ہی اٹھ گئے۔ چلنے لگے تو باہری دروازے پر پہنچ کر رکے، پلٹے اور ایک رومال دونوں ہاتھوں کے بیچ رکھ کر عزّت النساء کی طرف بڑھایا۔ انداز نذر پیش کرنے والا تھا اور لہجے میں التجا کا درد اور خوف شامل تھا: ''انکار مت کیجئے گا۔''

عزّت النساء کچھ سمجھ نہیں پائیں۔ اندھیری رات، ہوا کا تیز، برشگال کا شور کروں تو کیسے کروں شمع کی نگہبانی ان آندھیوں کی کفِ دست کا سہارا کیا۔ ان کے کچھ فیصلہ کرنے یا کہنے سے پہلے لالہ نے رومال ان کے ہاتھوں پر رکھ دیا اور تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

عزت النساء نے دروازہ بند کیا اور دروازے ہی سے ٹک کے کھڑی ہوگئیں۔ رومال کھولا، شروع چاند کی رات تھی۔ چاند کی کم کم روشنی میں انھوں نے دیکھا۔ سوسو کے پانچ نوٹ رومال میں باندھے گئے تھے۔ عزت النساء وہیں پر جیسے تھوس کر بیٹھ گئیں اور پھپھک پھپھک کر رونے لگیں۔

لالہ اس کے بعد پندرہ دن نہیں آئے۔ یہ عرصہ عزّت النساء کے لیے بڑی بے چینی اور امتحان کا عرصہ تھا۔ گھر اپنی بدحالی کی انتہا پر تھا اور رومال میں بندھا پانچ سو روپیہ عزت النساء کی صندوقچی کے بالکل نچلے حصے میں پڑا ہاتھوں کے لمس کو ترس رہا تھا اس درمیان کتنی مرتبہ بچے روئے مچلے، بی بی کتنی مرتبہ اندر اندر ٹوٹی، بکھریں۔ ان سے پوچھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ایسی ہی کئی بے پناہ لمحوں میں ان کی نگاہ شوہر کی طرف اٹھی اور انھیں محسوس ہوا کہ وہ غصہ، نفرت، ترس، بیک وقت کئی جذبوں کی قید میں ہیں۔

ایسے بے پناہ لمحوں میں انھیں ایک ہی سوال پریشان کرتا، 'یہ تو اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا ہے،

مگر میں نے اوران بچوں نے کیا قصور کیا ہے؟'

کبھی کبھی عزّت النساء تھک جاتیں، ٹوٹنے لگتیں، سوچتیں'اب ایسا بھی کیا؟ کیا اسے معلوم نہیں کہ لالہ بنسی دھر مختار عام تھے۔ جو کچھ بکا ہوگا کیا اس کی خبر لالہ ہر یہر کو نہ ہوگی؟ ہوسکتا ہے ہری ہر پرشاد نے بنسی دھر کو خبر کی ہو اور بنسی دھر ہی نے یہ پیسہ بھجوایا ہو' یہاں تک پہنچ کر وہ صندوقچی کی طرف دوڑتیں، مگر تالا کھولتے کھولتے خیال آتا' ماتا جی نے صاف کہہ دیا تھا کہ بنسی دھر کی کوئی خبر نہیں۔ چھٹی پتری کے لئے کوئی پتہ نہیں، پھر لالہ ہری ہر نے اس کو خبر کیسے کی ہوگی؟ تب یہ پیسہ؟'عزّت النساء ٹھٹھک جاتیں۔ پلو سے آنکھیں صاف کرتیں اور صندوقچی کے پاس سے ہٹ جاتیں۔ جیون تیرے رنگ ہزار، کبھی بادِ بہاراں، کبھی موجِ صرصر، کبھی اُمس، کبھی کھلی ہوا.........

عزّت النساء کے لیے ان دنوں جینا مدّ و جزر میں گھرے آدمی کا اب چھ کرنا تھا۔ کبھی کبھی عزّت بی بی اپنے آپ سے پوچھتیں:

''اس میں مدّ کہاں ہے عزّت النساء؟''

ایسے ہی بے پناہ لمحوں میں لالہ ہری ہر پرشاد نے ایک شام پھر دستک دی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد عزّت النساء پوچھ ہی بیٹھیں۔''لالہ بنسی دھر کی کوئی چھٹی پتری آئی؟''

''جی نہیں ان کی کوئی خبر نہیں۔''

''اور آپ لوگوں نے کوئی خبر لی بھی نہیں؟''

''میں نے تو ارادہ کیا تھا لیکن ماتا جی آڑے آگئیں۔''

''کیوں ماتا جی کیوں؟''

''اب چھوڑیے۔ جانے دیجئے۔ اس تفصیل میں نہ جایئے۔''

''لالہ میرے لئے یہ تفصیل بہت ضروری ہے۔ کچھ بھی چھپایئے مت۔''

لالہ نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر بدن ڈھیلا چھوڑ دیا اور بہت بوجھل لہجے میں بولے۔

''ماتا جی سے ان کا اختلاف ہوگیا۔ ماتا جی کا کہنا تھا کہ تم جس جائیداد کے مختار عام ہو۔ اس میں جو بھی بچا ہے، وہ اصل مالک کو لوٹا دو۔''

عزّت النساء کے پاس اب پوچھنے کو کیا رہ گیا تھا؟ وہ سمجھ گئی تھیں کہ لالہ کیا چھپانا چاہ رہے تھے

اور لالہ بھی سمجھ گئے تھے کہ بی بی کیا پوچھنا چاہ رہی ہیں۔دونوں کے درمیان ترسیل کی کامیابی کا سانپ پھن کاڑھے کھڑا تھا اور کیچوے کی رفتار سے رینگتی رات دونوں کے گرد اپنا جال بہت آہستگی کے ساتھ مگر بہت مضبوطی سے بنتی جا رہی تھی۔عزت النساء اس جال کو توڑنا چاہتی تھیں مگر وہ محسوس کر رہی تھیں کہ گھر پر فالج کا حملہ ہو چکا ہے۔انھیں لگا وہ عورت کبھی رہی ہوں گی مگر اب وہ ایک مکھی ہیں جسے کسی دیونے دیوار پر چپکا دیا ہے۔انھوں نے غور سے لالہ ہر یہر پرشاد کو دیکھا......کیا وہ دیو یہی ہے؟........لالہ کے چہرے پر فرشتوں کی معصومیت بکھری پڑی تھی۔

اچانک لالہ ہری ہر پرشاد کھڑے ہو گئے۔''میں چلتا ہوں۔''

''لالہ جی ایک منٹ!''

بی بی عزّت النساء کے منھ سے بے ساختہ نکلا اور پھر اچانک وہ بلکہ بے خودسی اٹھیں، تیزی سے اندر گئیں، صندوقچی سے پوٹلی نکالی اور اسی بے خود انداز میں تیز قدموں چلتی، باہر بیٹھک میں آئیں اور پوٹلی لالہ کی طرف بڑھائی۔

''لالہ جی آپ کی امانت!''

لالہ ایک منٹ تک، بس انھیں دیکھتے رہے۔ان کے ہاتھوں میں روپوں کی پوٹلی تھی اور وہ ہاتھ لالہ کی طرف بڑھا ہوا تھا۔لالہ نے آہستہ وہ پاٹلی لی، جھک کر ان کے قدموں میں رکھ دی اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ان کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنی آنکھوں سے لگا کر بغیر آواز کے زار وقطار رونے لگے۔عزّت النساء نے محسوس کیا کہ ان کا ہاتھ لالہ کے آنسوؤں سے تر بتر ہوا جا رہا تھا۔

یہ ایک عجیب وغریب صورت حال تھی۔اَن چاہی اَن جانی، عزّت النساء نے جھپٹ پٹا کر صدیوں پر محیط لمحے کے تیز پُر شور دھارے کے بہاؤ میں بہنے سے خود کو بچانا چاہا مگر انھیں محسوس ہوا کہ عجیب اَن دیکھا سا ایک تیز پُر شور دریا ان کے اندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔اس بھیانک اور قیامت خیر لمحے میں وہ لڑکا انھیں پھر یاد آیا جس سے شادی کے بعد بس ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تھی اور جس کی آواز سمندر کی آخری تہوں سے آتی سنائی دی تھی۔''بی بی آپ کیسی ہیں؟ آپ کو دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔''

لالہ اس حال میں اندازاً دو تین منٹ بے خود سے رہے اور پھر تقریباً دوڑتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے........

اس رات عزت النساء پر رنگوں نے یلغار کی۔ لال، بلو، کاسنی، گلابی، فیروزی، چمپئی، زرد، کتھئی، لاجوردی، کاہی، پستئی، سرمئی، آسمانی، دودھیا، انگوری، کشمشی، بادامی، پیازی، سفید، کالا، ہرا......

رنگوں کی بھر مار تھی اور موسم سرد دھند میں ڈوبا ہوا۔ پھر پرندوں نے ان کے گرد گھیرا ڈالا۔ طوطا، مینا، بلبل، پپیہا، شیاما، کوئل، فاختہ، لعل، گوریا، ٹیٹری، مورباز، ساری رات وہ کسی پر شور دریا میں اب چھچ کرتی رہیں۔ ساری رات تھپیڑے انھیں ایک تنکے کی طرف سات دریاؤں میں اکیلی ناؤ بناتے رہے۔ ساری رات کوئی تھا جو انھیں دریا سے صحرا اور صحرا سے دریا کے درمیان گڑیے کی طرح اچھالتا رہا۔

آنکھ کھلی تو انھوں نے کالا رنگ، باز پرند، دریا کے بے پناہ تھپیڑے اور صحرا کی سلگتی دوپہر یاد رکھی۔

مگر اس دن ایک بات اور بھی ہوگئی۔ وہ نہا کر آئینے کے سامنے بال سنوارنے بیٹھیں تو اچانک اپنے آپ کو نظر آگئیں۔ اور انھیں حیرت ہوئی، وقت کے تھپیڑے ان کا آپا سراپا نہیں چھو پائے تھے۔ لمبے بال، سرخی مائل دودھیا رنگ خوبصورت نقش و نگار...... بی بی عزت النساء کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ کھلتی نظر آئی جس میں اپنے آپ سے شرمائے کا انداز نمایاں تھا۔

''بی بی یہ بندے پہن لیجئے، بہت اچھی لگیں گی آپ۔'' اچانک آئینے کے جسم پر برسوں پرانا، بھولا بسرا، وہ باؤلا رشتہ دار چھا گیا۔

''پاگل.........وہ کھلکھلا کر ہنسی تھیں''

''آپ کو پتہ ہے؟ آپ ہنستے ہوئے، سر کو جھٹک کر آگے کے بالوں کو جو پیچھے پھینکتی ہیں تو کائنات کی سانس رک جاتی ہے۔''

''اے بھاگو۔'' عزت النساء کو یاد آیا، انھوں نے اس باؤلے کی پیٹھ پر دو تھپڑ مارتے ہوئے اسے دوڑایا تھا:

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

پتہ نہیں کب کا سنا شعر ان کے ذہن میں رینگ گیا اور جیسے ہی ذہنی رو دوسرے مصرعے پر پہنچی تو آئینے کے جسم پر لالہ ہر یہر پرشاد جھلملانے لگے۔

''لاحول ولاقوۃ!'' عزت النساء ہڑبڑا کر آئینے کے سامنے سے ہٹ گئیں، مگر ایک بات ضرور

ہوئی اس دن پوٹلی میں سے انھوں نے ایک سو کا نوٹ نکالا اور برقعہ پہن کر بازار روانہ ہوگئیں.........

دوسری بات یہ بھی عجیب ہوئی کہ انھیں لالہ ہر پہر پر شاد یاد آنے لگے۔ خاص طور پر جب وہ جلال الدین کی گندگی صاف کر رہی ہوتیں تو جیسے ایک جھما کا سا ہوتا........گھٹنوں کے بل بیٹھا، ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر روتا ایک شخص......ایک قد آور جوانِ رعنا!

وہ سر جھٹکتی، ذہن کو دوسرے طرف مرکوز کرتیں مگر کوئی تھا جو لپ جھپ کرتا آتا رہتا، جاتا رہتا۔

اس مرتبہ لالہ لگ بھگ بیس دن بعد آئے۔

آئے بھی تو یوں کہ دستک نہیں دی۔ شام اور رات کے جھٹپٹے میں اندر داخل ہوئے اور دروازے کے اندرونی حصے میں چپ چاپ کھڑے ہوگئے۔ عزّت النساء باورچی خانے میں کھانا تیار کر رہی تھیں۔ انہوں نے کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ مگر کچھ عجیب سی بےچینی کا احساس ہوا۔ وہ کام ادھورا چھوڑ کر باہر نکلیں۔ سب حسب دستور تھا۔ جلال الدین اپنے بستر پر پڑا ہوا تھا۔ بچے لالٹین کی روشنی میں پڑھ رہے تھے، چھوٹا بیٹا سو گیا تھا........انھیں اطمینان ہوا، اپنے کام میں مشغول ہوگئیں......مگر دو چار منٹ بعد انھیں پھر کچھ...... معمول سے الگ محسوس ہوا......وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ دل بےکل کیوں ہے......پھر پتہ نہیں ان کے من میں کیا آیا، وہ دروازے کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ذرا آگے بڑھیں، پورا اندھیرا نہیں چھایا تھا....... دروازے کے نزدیک پہنچتے پہنچتے پہچان گئیں......لالہ چپ چاپ کھڑے تھے۔

''ارے آپ کتنی دیر سے کھڑے ہیں؟ دستک کیوں نہیں دی؟''

''ہمت نہیں ہوئی۔'' لالہ بہت مری ہوئی آواز میں بولے۔

''آپ بھی لالہ جی......کمال کے آدمی ہیں......آیئے آیئے۔''

وہ پیچھے پیچھے باہری بیٹھک کی طرف آئے اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔

''میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔ چولھے پر سبزی چڑھی ہوئی ہے۔'' وہ کہتی ہوئی باورچی خانے کی طرف لپکیں۔

جلدی سے انھوں نے چائے کی کیتلی چولھے پر چڑھائی۔ طشتری میں اس دن بازار سے لایا کچھ ناشتہ رکھا اور پھر ایک ٹرے میں چائے، پانی اور ناشتے کی طشتری سجا کر باہری بیٹھک کی طرف بڑھیں۔

''ارے یہ کیا کیا آپ نے؟'' لالہ ان کے ہاتھ میں ٹرے دیکھ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے۔

''لالہ جی۔'' عزّت النساء کی ہنسی میں اداسی بھی شامل تھی۔ ''اس میں میری تھوڑی سی محنت لگی ہے۔'' انھوں نے صرف پر زور دیا۔

''بی بی۔'' لالہ ہاتھ جوڑے جوڑے بولے'' جو چاہے سزا دے لیجئے مگر آپ کا دل دکھانا میرا مقصد نہیں تھا۔''

عزّت النساء مدتوں بعد پہلی مرتبہ آواز کے ساتھ ہنسیں ایک لمحے کے لیے انھیں لگا کہ غم کے بادل چھٹ گئے۔ لالہ پہلی مرتبہ کچھ دیر تک رکے، تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ، پہلی مرتبہ باتوں کا رخ عزت النساء کے میکے کی طرف مڑا اور یوں مڑا کہ خود انھیں اندازہ نہیں ہوسکا کہ وہ حال کے جلتے سلگتے ریگستانوں سے ماضی کی نرم اور ٹھنڈی چھاؤں میں کیسے پہنچ گئیں۔ وہ مائیکے کے کمروں، دالانوں اور آنکھوں میں چوکڑیاں بھرتی رہیں۔ بالاریز سے گلی میں مداری کا تماشا دیکھتی رہیں۔ باپ کی شفقت، ماں کی ممتا، بہنیں، بھابھیاں، سکھی سہیلیاں، محبت کرنے والے بھائی اور ہلکی ٹھنڈی پھوار کی طرح انگ انگ میں اترتا اور سارے آپے سراپے کو شانت کرتا سمئے ....

عزت النساء بولتی رہیں اور لالہ بس ایک ٹک انھیں دیکھتے رہے اور سنتے رہے۔ مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز گونجی تو وہ چونک اٹھیں۔ ''ارے اتنا وقت ہوگیا؟''

لالہ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ''معاف کیجئے گا، میں نے آپ کا بہت وقت برباد کیا۔''

''نہیں لالہ، تم نے تو مدتوں بعد مجھ ابلا کو وقت کی قید سے آزادی دلائی۔'' عزت النساء نے سوچا مگر بولیں نہیں۔

لالہ کرسی سے اٹھے، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے باہری دروازے تک آئے، عزت النساء منتظر تھیں کہ وہ باہر جائیں تو دروازے کا قلابہ اب لگا ہی دیا جائے۔ مگر لالہ ڈیوڑھی پر قدم رکھتے رکھتے رک گئے۔ دو قدم پیچھے ہٹے اور بی بی کے بہت قریب آگئے۔ بی بی نے حیرت سے انھیں محسوس کیا۔

''ایک بات کہوں؟؟'' لالہ کی آواز بہت بوجھل اور گھبرائی گھبرائی سی تھی۔

''کہیے۔'' عزت النساء کی حیرت کا عرصہ ابھی مختصر نہیں ہوا تھا۔

''برا تو نہیں مانیے گا؟''

''اب تک کسی بات کا برا مانا ہے؟''

''گھر آنے سے منع تو نہیں کر دیجئے گا۔''

''اور آتا کون ہے؟''

''عرض کروں؟''

''ارشاد فرمایئے۔''

''میں آپ کو........سورج کی روشنی میں.......ایک مرتبہ......جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''کیوں؟ اس میں حرج کیا ہے؟''

''بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ یہ صحیح ہے کہ میرے میکے اور سسرال دونوں طرف، میری خبر لینے والا یا میری گرفت کرنے والا کوئی نہیں بچا، سب پاکستان جا چکے۔ اردگرد کے زیادہ مکانات شرنارتھیوں کو دے دئے گئے۔ یہ بھی صحیح کہ پرانے ملنے والوں میں جو لوگ بچے ہیں۔ ان میں زیادہ تر جلال الدین کے مزاج اور بدکلامی کے سبب دوری بلکہ دشمنی کا جو رشتہ قائم ہو، تو اب جب ہم خود مختار ہو چکے، بھلا دوستی میں کیوں بدلنے لگا۔ اس کے باوجود نزدیک و دور کی گلیوں میں غریبوں کے کچھ گھر تو بچ ہی گئے ہیں۔ ان کی بچیاں پڑھنے آتی ہیں۔ کبھی کبھی بچیوں کی مائیں، بہنیں بھی دن رہتے ہی آتی ہیں۔ ان سبھوں کو شرنارتھیوں سے ڈر لگتا ہے۔ پھر میں آپ کو دن میں کیسے بلاؤں؟''

اچانک لالہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ ان کا منھ اوپر اٹھا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔

''بی بی! میں مر جاؤں گا.......مجھے تھوڑی سی سانس........تھوڑی سی ہوا کی ضرورت ہے۔''

لالہ کی آواز کی سمفنی میں آنسوؤں کی آمیزش کا احساس بہت طاقتور تھا۔

عزت النساء کو محسوس ہوا کہ گھٹنوں کے بل جھکا ہوا یہ آدمی لالہ ہری ہر پرشاد نہیں ہے..... یہ تو کوئی پیاسی چڑیا ہے جو گرمی کی بھری دوپہر میں پیاس سے چھٹپٹا رہی ہے۔ عزت النساء کا جی چاہا...... پہلی مرتبہ جی چاہا کہ........

وہ بالکل بےخود ہو کر لالہ کے ماتھے کی طرف جھکیں.....ان کے دونوں ہاتھ لالہ کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لینے کے لئے بےتاب تھے......وہ کانپتی تھرتھراتی لالہ کے ماتھے کی طرف جھکتی محسوس ہو رہی تھیں۔

گھٹنوں کے بل بیٹھے لالہ کی آنکھیں اس انداز میں بی بی عزت النساء کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں جیسے بی بی کا چہرہ نہ ہو بادل کا وہ ٹکڑا ہو جسے برسات کو ترستا کسان حسرت سے تکتا ہے۔

بی بی کا لالہ کی طرف جھکتا ہوا چہرہ اور لالہ کی پیاسی آنکھیں...... یہ منظر جھما جھم برستے اندھیرے نے دیکھا، ڈیوڑھی کی چاروں طرفوں نے دیکھا، آسمان کے اس ٹکڑے نے دیکھا جس کا ناموجود شامیانہ دونوں پر تنا ہوا تھا۔

مگر پل بھر میں منظر بدل گیا...... بی بی لالہ کے ماتھے کی طرف جھکتے جھکتے اچانک رک گئیں...... پھر بڑی مشکل سے...... لالہ کی طرف جھکتی ہوئی عزت النساء...... آہستہ آہستہ کھڑی ہو گئیں اور رُندھی آواز میں بولیں۔

''لالہ! میرا جینا مشکل مت کیجئے۔ میرے سر پر بڑا بوجھ ہے۔''

لالہ تڑپ کر کھڑے ہو گئے۔ عزت النساء کے آنسو لالہ کے ہاتھوں پر جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ لالہ بڑے احترام سے اپنے ہاتھوں کو ہونٹوں تک لائے، پھر ان پیاسے ہونٹوں نے بی بی کے آنسو کو جیسے چوم لیا اور لالہ کی آواز قرن ہا قرن کی مسافت طے کرتی، عزت النساء تک پہنچتی محسوس ہوئی۔

''بی بی مریں آپ کے دشمن۔ آپ یہ سارا بوجھ تنہا کیوں اٹھائیں؟''

''لالہ آپ جائیے۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔'' عزت النساء نے ہاتھ جوڑ لیا اور لالہ تڑپ گئے۔

''بس بی بی...... بس۔ میں جاتا ہوں۔'' وہ آگے بڑھے، پھر رک گئے۔ آہستہ سے کہا: ''اسے لیتی جائیے۔'' لالہ نے ایک پیکٹ ان کی طرف بڑھایا۔

''کیا ہے؟''

''مجھے اتنا تو یقین ہو گیا ہے کہ آپ میری شردھا ٹھکراتی نہیں ہیں۔'' لالہ کے لہجے میں ذرا سی شگفتگی تھی۔

عزت النساء آہستہ سے مسکرائیں۔ ''اچھا خدا حافظ۔''

دروازے کا قلابہ لگا کر عزت النساء اس کمرے میں آئیں جس میں نہ شوہر تھا نہ بچے۔ انھوں نے پیکٹ کھولا۔ پیکٹ میں سب بچوں کے کپڑوں کے ساتھ ایک ساری بھی تھی۔ اور ایک لفافے میں پانچ سو روپے۔ اچانک عزت النساء کو یاد آیا کہ پچھلی مرتبہ لالہ نے جو روپے دیے تھے اس پر ایک ماہ کی مدت گزر چکی ہے۔

''خداوندا! میں کیا کروں؟'' عزت النساء آہستہ سے بڑبڑائیں۔

اس سوال کا جواب عزّت النساء کو کبھی نہیں مل سکا۔ البتہ لالہ ایک ہفتہ بعد پھر آئے۔ عزّت بی بی دروازہ کھول کر پیچھے ہٹیں کہ وہ اندر آجائیں۔ مگر لالہ خلافِ توقع ڈیوڑھی پر ہی کھڑے رہے۔

''کھڑے کیوں ہیں؟ اندر کیوں نہیں آتے؟''

''نہیں اندر نہیں آوٴں گا۔ یہ خط آپ پڑھ لیجئے گا۔''

لالہ نے ایک لفافہ ان کی طرف بڑھایا اور لمبے ڈگ بھرتے ہوئے رات کے اندھیرے میں تحلیل ہو گئے۔

عزّت النساء نے کمرے میں آکر لالٹین کی لو تیز کی۔

''میں خود کو مجرم سمجھنے لگا ہوں........آپ کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھانے کا مجھے کوئی حق نہیں....... مجھے آپ کی خدمت کرنی ہے، وہ میں تا حیات کیے جاؤں گا۔ اس خدمت کا اجر صرف آپ کی خوشی ہے...... مجھے بس تھوڑی سی سانس.......تھوڑی سی ہوا کی ضرورت ہے.....'' لالہ ہر یہر پرشاد [''پیلی کوٹھی'' بائی پاس روڈ، پہلے بائیں موڑ کی دوسری گلی کا آخری مکان موجود رہنے کا وقت: گیارہ بجے دن سے دو پہر دو بجے تک۔ بدھ اور اتوار]

دوسرے دن اتوار تھا۔

بی بی عزت النساء تین بجے سہ پہر کے قریب گھر میں داخل ہوئیں۔ وہ لالہ کی لائی ساری پہنے ہوئی تھیں۔

گھر میں داخل ہوئیں تو دیکھا، محلے کی ایک عورت ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ اسی دن مغرب بعد، اس کے یہاں محفلِ میلاد شریف تھی۔

میلاد شریف میں جانے کے لیے بی بی عزت النساء نے جلال الدین کی خریدی ایک پرانی ساری نکالی، زیب تن کیا، وقت سے ذرا پہلے ہی محفل میں حاضر ہوگئیں اور میلاد انھوں نے ایسے الحاح زاری سے پڑھا کہ سننے والوں کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ خود عزت النساء کی آنکھوں سے بھی آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

بی بی عزت النساء روئے جا رہی تھیں اور جھوم جھوم کر پڑھے جا رہی تھیں:

خدا کہ قہر سے روزِ جزاء بچالینا

بہت ہوں عاجز و ناچار، یارسول اللہ

''حق والے حسین''

غضنفر

موبائل : 7678436704

حسین ابن علی کربلا کو جاتے ہیں
مگر یہ لوگ ابھی تک گھروں کے اندر ہیں

عالمی شہرت یافتہ شاعر شہر یار کا یہ شعر بیشک سچ پر مبنی ہے مگر ایک سچ یہ بھی ہے کہ آج بھی کچھ سرفروش گھروں سے نکلتے ہیں، میدانِ پُر خطر میں راہِ پُر خار پر آگے بڑھتے ہیں۔ اہل جفا کار اور ستم شعار کے سامنے زبانیں کھولتے ہیں اور یزیدِ عصر کے حضور بھی حق بات بولتے ہیں۔

ان سرفروشوں میں ایک عہدِ حاضر کے حسین بھی ہیں۔ کسی مسئلے کو سننا ہو، کسی قضیے پر بولنا ہو، کسی آواز پر لبیک کہنا ہو، کسی کتاب کو پڑھنا ہو، کسی موضوع پر لکھنا ہو، کوئی علمی ذَروا کرنا ہو، کسی ادبی معرکے میں سرگرمِ عمل ہونا ہو، کسی عمل پر ردِّعمل ظاہر کرنا ہو، عمل خواہ سیاسی ہی کیوں نہ ہو کہ جس کے ردِّعمل پر معتوب ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو، حسین کو میں نے ہمیشہ ہی آگے پایا اور ہر جگہ، ہر محاذ پر مستعد، متحرک، منطقی، معروضی اور متوازن محسوس کیا۔

آج کا یہ حسین راہِ حق پر اس لیے پاؤں بڑھاتا ہے اور سلگتے ہوئے شراروں کو دیکھ کر ہچکچاتا نہیں کہ اس کے شانوں پر سر موجود ہے۔ وہ سر جس میں سودا ہوتا ہے، سودا جو سروں کو بلند رکھتا ہے، کبھی جھکنے نہیں دیتا۔ جو بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے۔ ہمارے اس حسین کے سر میں سودا تو ہے ہی، اس سودے میں دیوانگی کے ساتھ فرزانگی بھی شامل ہے۔ فرزانگی جو حق اور باطل کا ادراک کراتی ہے۔ خیر اور شر کے امتیاز کا احساس پیدا کرتی ہے۔ مشاہدے کے کرب کو شدید بناتی ہے اور جذبۂ جنوں کو فزوں تر کرتی ہے۔ جو جوش اور ہوش میں توازن برقرار رکھتی ہے۔ سر میں رہنے والا ایسا سودا اپنے سودائی کو بے باک تو بناتا ہی ہے اسے تناسب اور توازن بھی بخشتا ہے۔

اسی لیے ہمارا یہ حسین متوازن انداز میں بے باکی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ کسی بھی سچی اور اچھی بات پر چپ نہیں رہتا۔ جھوٹی اور بری بات پر اپنے ہونٹ بند نہیں رکھتا جیسا کہ ان دنوں سچی اور اچھی یا جھوٹی اور بری بات سن کر بھی لوگ چپ رہ جاتے ہیں۔ تائید و تصدیق، تعریف و توصیف یا تردید و تنقید اور تنقیص و تنبیہ میں منہ نہیں کھولتے اور کسی دباؤ میں کبھی کھولتے بھی ہیں تو نہایت احتیاط کے ساتھ نپے تلے انداز اور مدھم آواز میں بولتے ہیں۔ اس بات

کا پورا خیال رکھتے ہیں اور ایسی ساودھانی برتتے ہیں کہ کہیں سے کسی طرح کی گرفت میں نہ آجائیں۔ کسی کو خوش کرنے میں کوئی دوسرا ناراض نہ ہو جائے مگر ہمارا حسین ایسا کچھ نہیں کرتا۔ کسی بھی طرح کی مصلحت کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ وہ اچھی اور سچی بات پر بغیر اپنا نفع نقصان سوچے بولتا ہے۔ کسی بھی معاملے میں کسی بھی مرحلے پر کسی طرح کا کلکولیشن نہیں کرتا۔ اوپر اٹھنے یا نیچے جھکنے کا تخمینہ نہیں لگاتا۔ تعریف و توصیف میں بنیا گیری نہیں کرتا۔ اس کے لیے حاتمی انداز اختیار کرتا ہے۔ دل اور دماغ دونوں کھول دیتا ہے اور جو کچھ جس طرح بولنا ہوتا ہے بول دیتا ہے۔ اسے یہ بھی لکھنے میں عار نہیں ہوتا کہ اسے خوشی ہے کہ فکشن کے میدان میں اس کا چھوٹا بھائی اس سے آگے نکل گیا ہے۔ تعریف و تحسین کرتے وقت یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے بیان سے کسی کا قد بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا اپنا قد چھوٹا ہو رہا ہے۔ [بری اور جھوٹی بات کی سختی سے تردید کرتا ہے اور ایسے میں کبھی یہ نہیں سوچتا کہ اس کا یہ عمل خسارے کا سودا ثابت ہوسکتا ہے۔] حسین کا یہ وہ وصف ہے جو معاصرین میں کسی کو میسر نہیں۔ اس طرح کے جملے لکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس طرح کا فقرہ اسی دل سے نکل سکتا ہے جس میں خانقاہوں جیسی وسعت ہو، فقیروں جیسی قناعت ہو اور جس کے مراقبے میں استغنائی ریاضت ہو یا پھر اس طرح کی باتیں کوئی ادب کا یوڈھا کرسکتا ہے۔ حسین اس میدان کے واقعی یوڈھا ہیں۔ ان میں ہر طرح کی طاقت موجود ہے۔ وہ سچ کو صرف سچ کہتے ہی نہیں بلکہ اسے منوانے کے لیے حجتیں بھی کرتے ہیں۔ مگر ان کی حجت کٹ حجتی نہیں ہوتی۔ اس حجت میں منطق ہوتی ہے۔ منطق میں علم کا نور اور استدلال کا وفور ہوتا ہے۔ وہ حجت حجتِ قاطع ثابت ہوتی ہے اور اگر کبھی مقابل کی دلیلِ ناطق کے سامنے کمزور پڑتی ہے تو حسین خوبصورتی سے خاموشی کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ حق کے لیے لڑی جانے والی جنگ میں حسین کے ہاتھ نہیں، زبان چلتی ہے، بارود نہیں وہ لفظوں کے گولے پھینکتے ہیں اور اس لسانی گولہ باری کی مہم میں ادبی سلیقہ شعاری سے کام لیتے ہیں۔ تخلیقی پینترے دکھاتے ہیں، منطق کے تیر چھوڑتے ہیں۔ سچ کی لڑائی وہ صرف لڑتے ہی نہیں بلکہ معرکۂ حق و باطل کو صفحۂ قرطاس پر بھی لاتے ہیں۔ قوموں کے درمیان پنپنے والی فرقہ واریت، ان کے باطن میں فروغ پانے والی احیاء پسندی اور بنیاد پرستی کی کشمکش کو اس طرح دکھاتے ہیں کہ افسانوی بساط جنگ کا میدان بن جاتی ہے۔ ذہن و دل میں ہونے والے تصادم کی نئی جہتیں بھی ابھر آتی ہیں۔

حسین اپنی تحریروں میں اس صورتِ حال کو بھی سامنے لاتے ہیں کہ کس طرح آزادی کے ملتے ہی وطن پرستی، انسان دوستی، فرقہ ورانہ یک جہتی اور ایثار و قربانی کے جذبے خاک میں مل گئے اور زمینِ سرسبز سے ہوس پرستی، بالادستی، چھینا جھپٹی، جبر و زیادتی، رنجش و دشمنی اور بغض و کینہ توزی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ساتھ ہی اس تلخ

حقیقت کو بھی دکھاتے ہیں کہ کس طرح اپنی وراثت اور اقدار کا امین بدلے ہوئے تعلیمی ماحول کی چکا چوند اور کساد بازاری کی دوڑ میں بے وقعت اور بے بس ہو کر رہ جاتا ہے اور ایک جاہل، ان پڑھ گنوار، نالائق اپنی عیّاریوں، مکاریوں اور تگڑم بازیوں سے صاحبِ ذی شعور و ذی وقار بن بیٹھتا ہے۔

حسین پیاس کی شدت، پیاسوں کے اضطراب اور پانی پر بٹھائے گئے پہرے پر بھی بولتے ہیں اور اس طرح بولتے ہیں کہ سن کر دلوں میں گرداب ابھر آتا ہے۔ آنکھوں میں سیلاب آ جاتا ہے۔

وہ اس عمارت کے انہدام پر بھی چپ نہیں رہ سکے جس پر ایک ساتھ نہایت بے دردی سے ہزاروں ہتھوڑے برسائے گئے اور جس کی بنیاد تک کی اینٹیں نکال لی گئیں اور ان اینٹوں کے ساتھ وہ وحشیانہ سلوک کیا گیا کہ جسے دیکھ کر شرم سے زمانے کی آنکھیں جھک گئیں۔ انسانیت درد سے کراہ اٹھی۔

حسین کے بول جان دار اور کاٹ دار اس لیے ہوتے ہیں کہ ان کی شخصیت بے باک اور دھار دار ہے۔ ان کی بے خوفی ان کی زبان کو بھی تیغ بے میان بنا دیتی ہے۔ ایسی تیزی اور طرّاری عطا کر دیتی ہے اور آب داری بخش دیتی ہے کہ اسے راہ کی کوئی رکاوٹ روک نہیں پاتی۔ حسین کی زبان کا یہ ایسا جوہر ہے کہ جو زبان کے جوہریوں کو بھی حیران کر دیتا ہے۔ شاید اسی لیے ان پر کسی سمت سے کوئی لسانی تیر نہیں پھینکا گیا۔ یہاں تک کہ لکھنوی لسانی کمانیں بھی ان کی طرف نہ تن سکیں جیسا کہ اکثر یورپ کے ساکنانِ ادب پر تنتی رہتی ہیں۔ حسین کی زبان شاید اس لیے بھی اہل زبان کے طنز و تعریض کا نشانہ نہیں بن پاتی کہ اسے خانقاہی اور لسانی درس گاہی دونوں طرف کی پشت پناہی حاصل ہے۔

حسین کے لسانی معرکے رسالوں میں تو ملتے ہی ہیں فیس بک کے اوراق پر بھی نظر آتے ہیں اور حسین یہاں بھی اتنے ہی سنجیدہ دکھائی دیتے ہیں جتنا کہ رسائل و جرائد کے صفحات پر محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی زبان دانی اور انشاپردازی کا کمال یہ ہے کہ ان کا بے تکلف قسم کا حظ بھی پرتکلف مضمون کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جس کی نمایاں مثال رسالہ سوغات کے ایک شمارے کے خطوط کے کالم میں شامل ان کا مراسلہ بھی ہے۔

حسین چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ دوسرے بھی لب کھولیں، کوئی چپ نہ رہے، سبھی بولیں، ایسا وہ اس لیے چاہتے ہیں کہ۔

اس رات کی دیوار کو ڈھانا ہے ضروری
یہ کام مگر ہم سے اکیلے نہیں ہوگا

ضروری اس لیے ہے کہ اماوس کو ہٹائے بغیر چاند کو نہیں دیکھا جا سکتا۔

حسین الحق کے افسانے: حیات و ممات کے تخلیقی استعارے

پروفیسر صغیر افراہیم

موبائل : 9358257696

۲رنومبر ۱۹۴۹ء کو سہسرام کے ایک علمی خانوادے میں پیدا ہونے والے حسین الحق مزاجاً صوفی ہیں۔ سہسرام کی تنظیمی فضا، خانقاہوں کی مساواتی تربیت، عظیم آباد کی عظمت، گُرو گووِند سنگھ کی انکساری اور مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا کی وسیع النظری اُن کی تحریروں میں رچ بس گئی ہے۔ اسی لیے ان کے فکشن میں ہند، ایران اور عرب کی قدیم روایات کی بازگشت بھی ہے اور مغربی آگہی کی ترجمانی بھی اُن کے افسانوی ادب میں قصص الانبیاء کا عکس جھلکتا ہے اور اساطیری کہانیاں بھی تحلیل ہوئی ہیں جن میں انسانی جذبات و کیفیات کے ساتھ فلسفۂ زندگی کی موشگافیاں اور حقیقت و معرفت کے رموز و نکات بھی جلوہ گر ہیں۔

حسین الحق جتنے کامیاب ناول نگار ہیں اتنے ہی ممتاز افسانہ نگار بھی ہیں۔ سرِ دست اُن کے افسانوں کے تعلق سے گفتگو مقصود ہے۔ اُن کے افسانوی مجموعے، ۱-پسِ پردۂ شب، ۲-صورتِ حال، ۳-بارش میں گھرا مکان، ۴- گھنے جنگلوں میں، ۵-مطلع، ۶-سوئی کی نوک پر رُکا لمحہ، ۷-نیو کی اینٹ وغیرہ منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ کسی ایک مضمون میں اُن کے تمام افسانوں پر گفتگو ممکن نہیں۔ اس لیے تمام توجہ اُن کے چند منتخب افسانوں پر مرکوز کرتا ہوں جن کے موضوعات ہمارے اردگرد کے ماحول سے لیے گئے ہیں۔ ان میں سیاسی، سماجی اور تاریخی بساط کے بدلتے ہوئے مہرے نظر آتے ہیں، اور پسِ پردہ اردو کا سماجی و ثقافتی منظرنامہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

واقعہ، کردار، موضوع کے تنوع، اسلوب کے اظہار اور تکنیک کی ہمہ گیری کے اعتبار سے دیکھیں تو ''نیو کی اینٹ'' منفرد افسانہ ہے۔ تقریباً دس سال پہلے اِسی عنوان سے اُن کا چوتھا افسانوی مجموعہ منظر عام پر آکر دھوم مچا چکا ہے۔ اس افسانہ میں احتجاج نہیں، غیر مرئی احساس اور تفکر ہے جس کو خوبی سے اُجاگر کیا گیا ہے کہ زندگی اتنی آسان نہیں جتنا کہ ہم سمجھتے ہیں۔ یہ کسی ایک نعرے، اصول یا نظریے کی پابند نہیں ہے بلکہ ایک آگ کے دریا کے مانند ہے۔ تناؤ سے پُر، بے حد اُلجھی ہوئی زندگی میں مفاہمت کا جذبہ کس طرح لہریں لیتا ہے، اس کا فنکارانہ اظہار بھی ''نیو کی اینٹ'' میں موجود ہے۔

''جلیبی کا رس'' میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا معاصر منظرنامہ جھلکتا ہے۔ حسین الحق بے حد حساس

فنکار ہیں اِس لیے انھوں نے عوامی زندگی کے مختلف رنگوں اور معاشرے کے اُتھل پتھل کو بغور دیکھا، محسوس کیا اور پھر ان کو فنکارانہ طور پر افسانہ کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اس افسانہ میں بھی علاقائی اثرات، مقامی محاورے اور برمحل مکالموں نے انسانی فطرت و جبلت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

نہایت باریکی اور فنّی ہُنر مندی سے بُنا گیا افسانہ ''سبحان اللہ'' دائروی شکل میں گھومتا ہوا، اختتام سے آغاز کی طرف لوٹتے ہوئے بیانیہ عرصہ قائم کرتا ہے۔ درمیان میں کچھ واقعاتی اور نفسیاتی مناظر ہیں جو عقائد، توہمات اور تعصّبات کو منعکس کرتے ہوئے غور و فکر پر مجبور کرتے ہیں۔ اس افسانہ میں جمعیت اور فرد کا معاشرے سے برتاؤ بطور خاص منعکس ہوتا ہے۔

حسین الحق کا کمال ہے کہ وہ پلاٹ کی بُنت میں ایسی فضا خلق کرتے ہیں جس میں بنیادی قصّے میں علامتی اور اساطیری عناصر خود بخود ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ ''الحمد للہ'' کا اس نقطہ نظر سے بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے کہ قدیم تصورات زندگی کا جب آج کے صارفی سماج و تصورات سے ٹکراؤ ہوتا ہے تو اسے ہمارے درمیان سے آہستہ آہستہ رخصت ہوتی جانے والی پرانی نسل کس طرح جھیلتی ہے۔ مزید برآں پچھلے زمانوں کی علمی و ادبی گفتگو اور آج کے ادبی مباحث کے درمیان رفتہ رفتہ جو فاصلہ قائم ہوا، اور علم و ادب سے جینے مرنے کے بیش از بیش حوالے آہستہ آہستہ جس طرح تبدیل ہوئے ہیں، اس کے بھرپور اشارے اس افسانے میں دستیاب ہیں۔ اس انداز سے گزرتے اور آتے موسموں کے درمیان واقع ہونے والے فرق پر فنی اور تخلیقی انداز میں کم سوچا گیا ہے۔ ''انحد'' میں ماضی کے گُزرے ہوئے ایام کی شدّت کے ساتھ دورِ حاضر کی کیفیات کا انوکھا امتزاج ہے۔ موضوع و ہیئت کی گرفت اور اسلوب کا موثر انداز افسانہ کے حُسن کو دوبالا کرتا ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ آجکل میں شائع ہوا تھا۔ اسے دوبارہ پڑھتے ہوئے ذکیہ مشہدی کا وہ خط یاد آ گیا جس میں اس افسانے کے بارے میں انھوں نے لکھا تھا کہ... میں نے بہت کم ایسے افسانے پڑھے ہیں جس کا عنوان متن کو مکمل کرتا ہو۔ واقعی اس افسانے کی خاص بات یہ ہے کہ افسانے کی پہلی پرت رومان اساس ہونے کے باوجود اپنی بُنت میں بابا کبیر کی انہدوانی کا تاثر سموئے محسوس ہوتا ہے۔

دراصل افسانہ حیات و ممات کا استعارہ ہے، جو انسانی نفسیات اور جنسیات کے پیچ و خم کو بروئے کار لانے کا فنّی حربہ ہے۔ انسان کے افعال و اعمال کے پسِ پُشت جو عوامل کام کر رہے ہوتے ہیں اُن کی تلاش کا، فرد اور اجتماع کے ذہنی اور جذباتی رشتوں کی کہانی سُنانے کا، انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں جو

سماجی، نفسیاتی، تاریخی وجغرافیائی نیز مذہبی عناصر سرگرم ہوتے ہیں اُن پرغوروفکر کرنے کا کردار افسانہ بخوبی ادا کرتا ہے۔انسان کی شخصیت کوسنوارنے اور بگاڑنے میں بیرونی اثرات کے علاوہ خود اُس کوورثہ میں ملی جبلّت میں منتشر رموز کی نشاندہی بھی افسانہ کرتا ہے۔فرد کی زندگی میں جو کائنات چُھپی ہوتی ہے اُس کو اُجاگر کرنے کے لیے افسانہ نگار اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر آزادانہ طور پر شعوری کوشش کرتا ہے۔اس کا دائرہ کائنات کی طرح وسیع ہے۔تبھی تو یہ عمل اور ردِعمل پرغوروفکر کرتا ہے۔انسان سے سرزد ہونے والا ہر عمل دراصل شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک ردِعمل ہوتا ہے جس کے اسباب وعلل کی جستجو افسانہ کرتا ہے اور حسین الحق اِن تمام رموز ونکات کو واضح کرنے کا ہُنر جانتے ہیں جن کے واضح ثبوت زیرِ مطالعہ افسانوں میں ملتے ہیں۔

مشرقی تاریخ میں تہذیبوں کے سیاسی وسماجی ٹکراؤ اور بنی نوع انسان کی انفرادی اور اجتماعی حیثیت کو بیان کرنا حسین الحق کا پسندیدہ موضوع ہے۔وہ چرند و پرند ہوں یا حیوانات ونباتات انسانیت سب پر مقدم ہے۔ مساوات ومحبت حاوی جذبہ ہے جس کی وکالت افسانہ ''مور پاؤں'' کرتا ہے۔اس میں ماورائی تصور اور تہذیب و ثقافت کو عوامی مسائل سے جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔یہ افسانہ زندگی کے تلخ حقائق، اقدار کی شکست، خوف اور توہم کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔افسانہ میں واقعات ڈرامے اور مکالمے کے مِلے جُلے انداز میں بتدریج رونما ہوتے ہیں۔شعور اور تحت الشعور کی آمیزش سے اُبھرنے والے وہم، تذبذب، خوف اور حقیقت کے اظہار کے لیے حسین الحق نے دلچسپ انداز اور موثر اسلوب اختیار کیا ہے۔انھوں نے تمثیلوں اور استعاروں کے ذریعے توہم پرستی اور عقیدت مندی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سچائی کا مقابلہ کرنے کی جانب ذہن کو راغب کیا ہے۔مور کے حُسن، پاؤں کی بدصورتی، پالنے کی کشش اور اُس کی موت کے تصور سے اُبھرنے والا منظر نامہ ہمارے عہد کی شدّت پسندی کو نمایاں کرتا ہے۔یہ افسانہ اس لحاظ سے بھی یاد رکھا جائے گا کہ اس میں رخشندہ اور مور کی صورت میں جس گنگا جمنی تہذیب کو یاد رکھنے اور نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ عہد حاضر میں، جب اس کے انہدام کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے، ایسے میں یاد کے پردے پر رخشندہ کا جھلکنا، تلسی کا پیڑ اور مور پالنے کی خواہش اس تہذیب کے ساتھ کھڑا ہونے کی کوشش ہے، خواہ یہ کامیاب ہو یا ناکام۔

واقعۂ کربلا حسین الحق کا پسندیدہ موضوع ہے۔نام کی نسبت کا اثر ہونا بھی چاہیے کہ یہ حسینؓ کے حق وصداقت کا غماز ہے۔بلاواسطہ طور پر انھوں نے اپنی کئی تخلیقات میں اس کا سہارا لیا ہے۔افسانہ ''کربلا'' میں پلاٹ وقت کے تسلسل کا تابع ہے۔کفایتِ لفظی کے ساتھ یہ نسبتاً طویل افسانہ ہے جو ماضی اور حال کے وسیلے سے سامنے

آتا ہے۔صوفیائے کرام کے توسط سے اپنوں کو اپنی فکر کے تابع بنانا اس کا مطمحِ نظر ہے۔ اِس کی قرأت کے دوران حسین الحق کا ناول ''فرات'' یاد آتا ہے جو عمل اور ردِ عمل کے پیہم اور پیچیدہ دام میں گرفتار انسانی زندگی کا اعلامیہ بن کر اُبھرتا ہے۔اُس فرات کے مانند جس کے کنارے کھڑی تشنہ لب انسانیت کرب و بلا میں گرفتار ہے اور اُس سے نجات حاصل کرنے کی مسلسل جدو جہد میں لگی ہوئی ہے۔''کربلا'' کے ضمن میں یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ افسانے میں واقعات کا جو سلسلہ شروع سے آخر تک جاری رہتا ہے، اس کا عرصہ ابتدا سے انتہا تک کرفیو کے درمیان کا عرصہ ہے مگر یہ دلچسپ بات ہے کہ پورے افسانے میں کہیں بھی کرفیو کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔یقینی طور پر ایک شعوری فنی احتیاط ہے جو افسانہ نگار کے بالغ فنی شعور کا اشارہ ہے۔

تفصیلی مطالعہ کے لیے افسانہ ''ناگہانی'' کا انتخاب اس لیے کہ اس نے مجھے خواتین کے تعلق سے ازسرِ نو غور وفکر کی دعوت دی۔سولہ صفحات پر مشتمل اِس افسانہ میں چار کردار ہیں۔مرکزیت بی بی عزت النساء کو حاصل ہے۔ضمنی کرداروں میں شوہر جلال الدین اور لالہ بنسی دھر پرشاد ہیں۔شوہر بگڑا ہوا زمیندار ہے جس کے مزاج میں وحشت اور درندگی ہے تبھی تو علاقہ کا کوئی بھی شخص اس کا دلی ہمدرد نہیں۔خاندانی منشی لالہ بنسی دھر جو اپنی چاپلوسی کی بدولت تمام زمین و جائداد کے مختارِ عام تھے، وقت بدلتے ہی وہ مختارِ کُل بن گئے بلکہ سب کچھ سمیٹ کر منظر نامہ سے غائب ہوگئے البتہ اُن کا چھوٹا بھائی لالہ ہری ہر پرشاد اُس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔وہ نیک، ملنسار اور وضع دار ہے۔مجموعی تأثر عورت کی قوتِ برداشت اور پاس ولحاظ کا جذبہ ہے۔اُس کے توسط سے افسانہ نگار ازدواجی، حالات، فطری خواہشات اور تہذیبی و معاشرتی جبر کو اُجاگر کرتا ہے۔قاری شدّت سے محسوس کرتا ہے کہ جاگیردارانہ نظام میں، مسلم معاشرے میں بھی نہ جانے کیوں مرد کی انا نے اُسے برابری کا درجہ نہیں دیا بلکہ بالادستی اور برتری قائم رکھنے کے نئے نئے طریقے تلاش کیے۔ستم یہ کہ عورت نے سخت قدم اُٹھانے کے بجائے صبر وتحمّل اور اطاعت و فرمانبرداری کا ثبوت پیش کیا۔شاید اِس اُمید کے سہارے کہ آنے والے کل میں حالات بدل جائیں گے۔ جب تک حالات بدلے نہیں تھے تو وہ ایک انانیت پسند، جھوٹی آن بان والے بڑے زمیندار کی بیگم تھیں۔آرام و آسائش مہیا ہونے کے باوجود وہ اِس حقیقت سے بھی واقف تھیں کہ جلال الدین کے اندر ایسا وحشت ناک درندہ صفت شوہر چھپا بیٹھا ہے جو عام حالات کی بات تو الگ رہی، خلوت میں بھی اذیت کے نئے نئے حربے تلاش کرتا رہتا تھا۔

یہ افسانہ بربریت اور لذّت کی ایک الگ کہانی بیان کرتا ہے اور یہ سلسلہ تقریباً آٹھ سال چلتا ہے کہ

اچانک جلال الدین پر فالج کا حملہ ہوتا ہے جس نے اُس کو ہی نہیں پورے گھر کو فالج زدہ بنادیا۔ بدلے ہوئے حالات میں عزت النساء ذہنی کرب کے ساتھ ساتھ معاشی، اقتصادی اور سماجی کرب میں بھی مبتلا ہو جاتی ہیں۔ تین بچے اور فالج زدہ شوہر اضطراری کیفیت میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں۔

روایتی انداز سے الگ ہٹے ہوئے اِس افسانہ میں مردانہ پن کے مظاہر کے ساتھ جنسی لذّت پسندی سے مکمل گریز ہے کیوں کہ اس خطرناک معاملہ میں غیر ضروری چیزوں کو لذّت کے لیے نہیں، عبرت کی بنا پر شامل کیا گیا ہے۔ اسی لیے مرد اساس معاشرہ پر یہ تازیانہ کا کام نہیں بلکہ یہ واضح کرتا ہے کہ بے حد ترقی یافتہ عہد میں بھی انسان اپنی سائیکی سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا ہے۔

افسانہ ایک مثلث کی شکل میں اُبھرتا ہے۔ غور کیجیے تو محسوس ہوتا ہے نفسیاتی اُلجھنوں میں مبتلا مرکزی کردار، اخلاقیات وسلوک اور طرزِ عمل، دوہرے اور متضاد معیار اور رویے اُس کے اردگرد ہیں۔ سنجیدگی اور غیر سنجیدگی، محبت اور بوالہوسی، فطرت و جبلّت کی وہ مقناطیسی کشش جو خود سپردگی جانب راغب کرتی ہے، اور مجبور عورت اُس موڑ تک آ جاتی ہے جہاں وہ آنا نہیں چاہتی، مگر وہ کیوں آ گئی؟ جبر، مجبوری، فطری خواہش یا پھر مرد کا متاثر کن رویّہ!!۔ لباس کا اُتارنا پہننا، عورت کی ہی نہیں، اشرف المخلوقات کی فطری کمزوری ہے۔ زندگی میں کبھی کبھی کوئی ایسا لمحہ آتا ہے کہ پوری احتیاط کے باوجود وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ''ناگہانی'' کا اختتام ملاحظہ ہو:

> ''وہ لالہ کی لائی ساری پہنے ہوئے تھیں... میلاد شریف میں جانے کے لیے بی بی عزت النساء نے جلال الدین کی خریدی ایک پُرانی ساری نکالی، زیب تن کیا، وقت سے ذرا پہلے ہی محفل میں حاضر ہو گئیں اور میلاد انھوں نے ایسے الحاح وزاری سے پڑھا کہ سننے والوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ خود عزت النساء کی آنکھوں سے بھی آنسو تھے کہ رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے''۔ (ص:۳۴)

تکرار لفظی کے ساتھ برمحل شعر کا استعمال:

> ''بی بی عزت النساء روئے جا رہی تھیں اور جھوم جھوم کر پڑھے جا رہی تھیں ؎
>
> خدا کے قہر سے روزِ جزا، بچا لینا
>
> بہت ہوں عاجز و لاچار، یا رسول اللہؐ''۔ (ص:۳۴)

افسانہ نگار کا یہ بھی فنّی کمال ہے کہ شعر وحدتِ تاثر کو مجروح نہیں کرتا، بلندیوں پر پہنچاتا ہے۔

اسی طرح افسانہ ''ناگہانی'' غماز ہے خواتین کے تشخص، ذہنی اور جسمانی مسائل، عزت و وقار کا۔ حسین الحق نے اشاراتی انداز میں واضح کیا ہے کہ روزِ اوّل سے معاشرے کی تشکیل میں عورت، مرد کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر چلتی رہی ہے، لیکن نہ جانے کیوں مرد کی انا نے اُسے برابری کا درجہ نہیں دیا۔ کائنات کے ساتھ اپنے رفیقِ سفر پر بھی بالادستی اور برتری قائم رکھنے کی کوشش کی اور سائے کی طرح ساتھ رہنے والی عورت کو لاشعوری طور پر احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا۔ حسین الحق نے شعور اور لاشعور کو گرفت میں لیتے ہوئے نہایت فنکارانہ ڈھنگ سے مساوات کی حمایت اور عصبیت کی مخالفت کی ہے۔ یہ افسانہ محض عورت کے حقوق کے حصول پر اصرار اور مرد کی بالادستی کے خلاف احتجاج درج نہیں کرتا بلکہ ذہنی، نفسیاتی اور جنسی کشاکش کا بھی اظہار کرتا ہے اگر ایک مرد تخریب پسند ہے تو دوسرا کسی چالاکی کا مظاہرہ نہیں کرتا بلکہ اظہار جذبات کے مہذب انداز کا مظہر ہے۔ اس میں ہونے والے ردِ عمل میں بھی تسکین کا ایک تصور کارفرما ہے۔ چاہے وہ لالہ ہری ہر کی خاموش امداد ہو یا میلاد شریف، فضا اور ماحول کو سازگار بنانے کا سارا مرحلہ فطری ہے۔

دراصل حسین الحق کے افسانوں کا مجموعی تاثر تہذیبی، تاریخی، اساطیری اور مذہبی علامتوں سے نکھرتا ہے۔ فضا و ماحول کے مطابق علاقائی رنگ اور محاوروں کا برتاؤ دبے پاؤں وحدتِ تاثر میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ اسی جدّت و نُدرت کی بدولت اُن کے افسانے حیات و ممات کے تخلیقی استعارے قرار پاتے ہیں جن میں ایمائیت اور منظری ربط موجود ہوتا ہے۔

حسین الحق کی افسانہ نگاری - ایک جائزہ

مشتاق احمد نوری

موبائل : 9431080070

۱۹۷۰ء میں جب اردو فکشن ایک نئی راہ پر گامزن تھا اس زمانہ میں سب سے بڑا قافلہ بہار کے فکشن نگاروں کا ہی تھا۔ جس میں کچھ ایسے بھی تھے جنہیں اس زمانے میں بھی سرداری حاصل تھی۔ اور آج تک وہ اپنی سرداری بچانے میں کامیاب رہے ہیں ان میں ایک اہم نام حسین الحق کا بھی ہے ان کے ساتھ شوکت حیات، شفق ،عبدالصمد، علی امام، غضنفر، پیغام آفاقی، مشتاق احمد نوری اور بہار سے باہر سلام بن رازق انور خاں، سید محمد اشرف طارق چھتاری ساجد رشید اور ایک طویل وقفے کی خاموشی کے بعد شموئل احمد بھی، ان سب نے اپنے فکشن سے اردو دنیا کو مالا مال کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد ۱۹۸۰ء میں بھی بہت سے فنکاروں نے اپنی پہچان بنائی ۔جس میں مشرف عالم ذوقی سب سے اہم نام ہے اس کے بعد سید احمد قادری اور قاسم خورشید نے بھی اپنے افسانوں سے اردو دنیا کو روشناس کرایا۔ ناموں کی فہرست ادھوری ہے کیونکہ اس زمانہ کے فکشن نگاروں کے بجائے میں آج حسین الحق کی کہانیوں پر گفتگو کرنا چاہ رہا ہوں۔

۱۹۷۰ء میں جو کہانیاں سامنے آرہی تھیں وہ جدیدیت کی علمبردار تھیں اور یہ جدیدیت کا وہ دور تھا کہ ہر آدمی جدید بننے کے لئے اپنا سب کچھ تیاگ دینے پر آمادہ تھا اور کبھی کبھی ایسی کہانی بھی عالم وجود میں آجاتی تھی جو خود مدیروں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور وہ اسے بڑے اہتمام سے اس لئے شائع کرتے تھے تاکہ ان پر نا سمجھ ہونے کا الزام نہ لگایا جائے۔ جس طرح کوئی فیشن بہت دیرپا نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ فیشن بھی بہت دیرپا ثابت نہیں ہوا اور دھیرے دھیرے کہانی اپنے اوریجنل فارم میں لوٹ آگئی۔

حسین الحق بھی نہ سمجھ میں آنے والے جدید فنکار تھے لیکن ان کے یہاں ایک ایسا رکھ رکھاؤ تھا جو انہیں اوروں سے ممتاز بنانے میں مددگار ثابت ہوا۔ حسین الحق کے یہاں خانقاہی آداب اور مذہبی وراثت کے ساتھ الفاظ کی خوبصورت نشست و برخواست ایک ساتھ دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ ان کے سات افسانوی مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں اور دو ناول بھی قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب رہیں۔ ”بولو مت چپ رہو“ اور ”فرات“ کے بعد ان کا کوئی ناول سامنے نہیں آیا لیکن ”فرات“ کی دھمک اب تک محسوس کی جارہی

ہے۔

ان کا ساتواں مجموعہ ''نیو کی اینٹ'' میرے سامنے ہے جس میں بیس کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ ہر ایک کہانی کا الگ الگ پس منظر ہے لیکن کچھ کہانیاں ایسی بھی ہیں جس میں خاص طور پر عورتوں کے اس درد کو محسوس کرنے کی کوشش کی گئی ہے جسے وہ اپنے وجود کی تاریکی اور تنہائی میں گھونٹ ،گھونٹ پینے پر مجبور ہوتی ہیں۔اس مجموعہ کی پہلی کہانی ''نا گہانی'' ہے جس میں بی بی عزت النساء کی شادی ایک اڑیل زمیندار جلال الدین سے ہو جاتی ہے اور بقول حسین الحق جلال الدین کے اندر کوئی ایسا وحشت ناک درندہ چھپا بیٹھا تھا جو عام لمحات کی بات تو الگ رہی بستر پر بھی عزت النساء کے ساتھ صحبت بالجبر ہی کرتا ہے صرف اس ایک جملہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عزت النساء کی زندگی کس طور پر گذر رہی ہوگی ۔ جلال الدین کا سارا کاروباران کا خاندانی منشی بنسی دھر پرشاد سنبھالتے تھے۔اوران کا یہ حال تھا کہ ڈیوڑھی پر جب آتے تو انداز ایسا ہوتا جیسے کتا دم ہلا رہا ہے وہ احترام یا خوف سے ڈیوڑھی کے باہر ہی جوتی اتار دیتے اور دھوتی کھول کر لنگی بنا لیتے اوران کی یہ مجال نہ ہوتی کہ وہ اپنی آمد کی اطلاع اندر بھجوا سکیں ۔ وہ تب تک بیٹھے رہتے جب تک انہیں جانے کی اجازت نہیں مل جاتی ۔لیکن جلال الدین پر جب فالج کا حملہ ہوا، اور منشی بنسی دھر پرشاد چپکے سے کھسک لئے تو عزت النساء کی زندگی خارش زدہ کتے کے سر کا زخم بن گئی جسے چاٹ کر نہ تو وہ صاف کرسکتا ہے اور نہ ہی زخم سے مکھی اڑا سکتا ہے وہ ایسا زخم ہوتا ہے جس پر ہر گھڑی دشمن کتے کی نگاہ جمی رہتی ہے۔

جلال الدین کے جسم پر ہی فالج کا اثر نہیں ہوا بلکہ اس کی زبان پر بھی فالج نے اپنا اثر دکھایا۔ جب ڈاکٹروں نے بنسی دھر کو اس بات کی اطلاع دی کہ یہ فالج موت کے ساتھ ہی ختم ہوگا تو منشی جی جن کی حیثیت اس گھر کے مختار عام کی تھی اس نے چین کی سانس لی۔ کیونکہ اسے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اب نہ تو چپل کھولنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی دھوتی کو لنگی بنانے کی۔اب منشی کی دلچسپی حویلی سے کم ہوتی گئی اور اس کا آنا بھی نہیں کے برابر ہو گیا۔عزت النساء کو شوہر کے زمانے میں بھی کبھی محبت کی چاشنی نصیب نہ ہوئی بلکہ ان کا استعمال مال غنیمت کی طرح ہوتا رہا۔مگر اب تو ان کے لئے اپنے وجود کو قائم رکھنے کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔دنیا کی ضرورتیں اپنی جگہ لیکن جسمانی ضرورت گنڈلی مارے ناگ کی طرح اندر اندر بیٹھی تھی اور جب نہ تب انہیں ڈستی رہتی تھی۔ان کی خانہ داری کی ضرورت ہو یا کاروبار کا حساب زمین جائداد کے اندراج ہوں یا باغ باغیچے کی فکران سب نے انہیں بری طرح جکڑ لیا اور انہیں مجبوراً منشی بنسی دھر پرشاد کے گھر کا رخ کرنا پڑا جہاں جا کر انہیں محسوس ہوا کہ منشی کی حویلی اس کی

اپنی حویلی سے کافی بڑی ہے۔ لیکن اس بڑی حویلی میں منشی بنسی دھر پرشاد کا وجود نظر نہیں آیا کیونکہ وہ جلال الدین کو اچھی طرح لوٹ کر شہر میں جا کر بس گئے تھے تاکہ کوئی ان سے پوچھ گچھ بھی نہ سکے اور وہیں بنسی دھر کے چھوٹے بھائی لالہ ہر بیہر پرشاد پہلی بار نظر آئے۔ جس کے تیکھے ناک نقشہ سرخی مائل گورا رنگ اور متناسب قد و قامت نے عزت النساء کو اس بات کا احساس دلایا کہ وہ ان سے دو برس ہی بڑا رہا ہوگا اور نہ جانے کیوں اسی وقت ان کے اندر کنڈلی مارے ناگ نے سر اُٹھا کر اپنے وجود کا احساس دلایا اور اسے دیکھ کر انہیں رشتے کا وہ بھائی یاد آ گیا جوان کے لئے بولایا پھرتا تھا اور آج بھی جب نہ تب اس کا وجود ان کے سامنے آ جاتا تھا اور عزت النساء پر رنگوں کی یلغار ہو جاتی تھی جس میں نیلا، پیلا، لال، کاسنی، گلابی، فیروزی، کتھئی، لاجوردی، کاہی، پستئی، سرمئی، دودھیا، انگوری، کشمشی، بادامی، پیازی، سفید، کالا، ہرا اور نہ جانے کتنے رنگ اس کے سامنے بکھر جاتے تھے۔ اس قیامت خیز لمحے میں وہ لڑکا انہیں بار بار یاد آتا رہا اور اس کی آواز سمندر کی آخری سطحوں سے آتی سنائی دیتی رہی۔ ''بی بی آپ کیسی ہیں آپ کو دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔'' دھیرے دھیرے لالہ ہر بیہر پرشاد کی آمد پر وہ بولایا لڑکا یاد آتا رہا اور ایک لمحہ وہ بھی آیا جب اس لڑکے کی جگہ منشی ہری ہر پرشاد گھٹنے کے بل منہ اوپر اٹھائے دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے یہ کہتے نظر آئے کہ بی بی میں مر جاؤں گا.......... مجھے تھوڑی سی سانس.......... تھوڑی سے ہوا کی ضرورت ہے۔'' لالہ کی آواز کی سمفنی کی طاقت کو عزت النساء نے محسوس کیا اور انہیں لگا کہ گھٹنوں کے بل جھکا یہ آدمی لالہ ہری ہر پرشاد نہیں ہے۔ یہ تو کوئی پیاسی چڑیا ہے جو گرمی کی بھری دوپہر میں پیاس سے چھٹپٹا رہی ہے۔

لالہ کی آمد تحفوں کے ساتھ جاری رہی' عزت النساء آئینے میں اپنے وجود کو نہارتی رہیں' جلال الدین اپنی ہی غلاظت میں پڑے رہے اور وقت کا پرندہ دھیرے دھیرے بغیر آواز کے خاموشی کے ساتھ آسمان کی وسعتوں میں تیرتا رہا۔ حالات نے عزت النساء کو ایک ایسے چوراہے پر کھڑا کر دیا تھا جس کی ایک جانب زمیندار کی مخدوش عمارت اور اس کا غلاظت بھرا وجود تھا۔ دوسری طرف لالہ بنسی دھر پرشاد کا ایسا وجود جو جلال الدین کے ہر سیاہ سفید کا جانکار لیکن اندھیرے میں سائے کی طرح غائب، تیسری طرف عزت النساء کی زندگی، اس کا مکمل پیاسا وجود، اور اس کے اندر خواہشات کی کنڈلی مارے ناگ اور چوتھی طرف لالہ ہری ہر پرشاد کا بولایا بولایا وجود جو اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا سائبان بھی رکھتا تھا۔ لالہ کی خواہش بھی عجیب۔ رات کے اندھیرے میں آتا اور دن کے اجالے میں عزت النساء کے مکمل وجود کو جی بھر کے دیکھنے کی خواہش کرتا۔ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ لالہ بہت جلد بازی میں آئے اور بغیر کچھ بولے ایک خط عزت النساء کے حوالے کر باہر نکل گئے۔ عزت النساء نے لالٹین کی لو تیز

کی اور خط پڑھنے لگی۔لالہ ہری ہر پرشاد نے لکھا تھا۔ میں خود کو مجرم محسوس کرنے لگا ہوں آپ کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھانے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ مجھے آپ کی خدمت کرنی ہے وہ تاحیات کیے جاؤں گا۔اس خدمت کا اجر صرف آپ کی خوشی ہے.......... مجھے بس تھوڑی سی سانس.......... تھوڑی سی ہوا کی ضرورت ہے.......... لالہ ہری ہر پرشاد پیلی کوٹھی بائی پاس روڈ پر پہلے بائیں موڑ کی دوسری گلی کا آخری مکان.......... موجود رہنے کا وقت ۱۱ بجے دن سے دو بجے دن تک.......... بدھ اور اتوار------''

دوسرے دن اتوار تھا بی بی عزت النساء سہ پہر کے قریب گھر میں داخل ہوئی وہ لالہ کی لائی ساڑی پہنی ہوئی تھیں۔کہانی دراصل اسی جگہ ختم ہو جانی چاہئے تھی۔لیکن حسین الحق جیسے منجھے ہوئے فنکار نے نہ جانے کیوں عزت النساء جیسے کردار کو مشرف بہ اسلام کرنے کا بیڑا اٹھاتے ہوئے ساڑی بدل کر میلاد میں جانا اور جھوم جھوم کر رقت بھرے انداز میں نعت کا شعر پڑھتے دکھایا اور کہانی یہاں ختم کی اس سے اس کہانی میں جو Force تھا وہ کم ہو گیا۔

اس کہانی میں حسین الحق نے ایک عبرت ناک مثال پیش کی ہے۔زمینداروں کی ایسی مثال جو صرف اپنی بیوی بچوں پر ہی صبر نہیں کرتے بلکہ انہیں کوئی فکر نہیں ہوتی صرف منشی بنسی دھر جیسے ریا کار وفادار مختار کے سہارے ان کا کاروبار چلتا ہے اور جلال الدین جیسے شخص کو اس بات کی بھی مکمل جانکاری نہیں ہوتی کہ ان کی کتنی جائداد کہاں ہے؟ فالج زدہ وجود دھرتی کا بوجھ ہی ہوتا ہے اور منشی جی کا اپنا گھر حویلی سے بھی بڑا ہے۔وہ سب سمیٹ کر نکل جاتا ہے اور صرف رہ جاتی ہے عزت النساء جس کے پاس صرف عزت کی دولت ہی رہ گئی ہے جسے منشی کا چھوٹا بھائی اپنے دونوں ہاتھوں سے لوٹنے کی ترکیب بناتا ہے اور کامیاب بھی ہوتا ہے۔

اگر عزت النساء کے ساتھ جلال الدین کی وفاداری محبت خلوص اور ایثار کی کچھ بھی مثال ہوتی تو شاید اس کے سہارے زندہ رہنے کی کوشش کرتی لیکن اس کی یادوں میں تو صرف وہ باؤلا لڑکا تھا جو اس کی پرستش کرتا تھا جس کی جگہ لالہ ہری ہر پرشاد لے لیتے ہیں اور عزت النساء اس کے سحر میں خود کو گم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے کیونکہ شاید اسے اس بات کا علم اگر عزت النساء کے ساتھ جلال الدین کی وفاداری محبت خلوص اور ایثار کی کچھ بھی مثال ہوتی تو شاید اس کے سہارے زندہ رہنے کی کوشش کرتی لیکن اس کی یادوں میں تو صرف وہ باؤلا لڑکا تھا جو اس کی پرستش کرتا تھا جس کی جگہ لالہ ہری ہر پرشاد لے لیتے ہیں اور عزت النساء اس کے سحر میں خود کو گم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے کیونکہ شاید اسے اس بات کا علم ہے کہ مجبوری کے سمندر میں ضرورت کے مگرمچھ سے بیر نہیں رکھا جا سکتا۔

اس کہانی میں وہ بولا یا لڑکا اہم رول ادا کرتا ہے عزت النساء زندگی بھر اس کے خیال سے باہر نہیں نکل سکی۔ شوہر کی بے اعتنائی نے اس لڑکے کی یاد بھی مندمل نہ ہونے دی اور ہری ہر پرشاد نے اس بولائے لڑکے کی جگہ حاصل کر لی۔

ان کے مجموعہ کی دوسری کہانی ''مور پاؤں'' جو آج کے فرقہ پرست ماحول میں آدمی کے اندر کے چور کو باہر نکالنے کا کام انجام دیتی ہے۔ کہانی کا راوی اجمیر میں اپنی بیٹی کے یہاں ہے جو آس پاس کے لوگوں سے گفتگو کرتا ہے جس میں زیادہ تر ہندو ہیں۔ جس میں بی۔ جے۔ پی۔ کا کٹر فرقہ پرست ہندو یہ بتاتا ہے کہ ہندو کا مطلب کیول سبھیتا ہے دھرم نہیں پورے بھارت ورش کی سبھیتا ایک ہے ہندو مسلمان صرف بھارت کی سنتان ہیں اور بھارت ماتا کو بچانے کے لئے سبھیتا کی سماتنا انیوار یہ ہے۔ اروند جی جب اپنی گفتگو ختم کرتے ہیں تو راوی الجھ جاتا ہے۔ ان کی الجھن کانگریسی نیتا لکشمن ترویدی دور کرتے ہوئے جب اپنی بات بتاتے ہیں تو اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کانگریسی نیتا بھی وہی بول رہا ہے جو اروند جی بول رہے تھے اور جب وہ لکشمن ترویدی جی کے یہاں جا کر یہ کہتا ہے کہ آپ تو کانگریس کے بہت Active ممبر ہیں آپ کا یہ Difination سیکولرزم سے میل نہیں کھاتا تو اس کے جواب میں لکشمن جی بہت پر اعتماد لہجے میں کہتے ہیں:

''میں کانگریسی ضرور ہوں لیکن آپ نے مجھے سیکولر کیسے سمجھ لیا۔ یہ غلط بات ہے میں ہندو ہوں۔''

یہ سن کر راوی کے اندر کافی اتھل پتھل ہونے لگتی ہے وہ اپنے خوابوں میں بھٹکتا ہے اسے محسوس ہوتا ہے کہ آج کا دور وہ نہیں ہے جو اس کے خوابوں کا حصہ رہا ہے۔ آج کی ننگی سچائی اسے کافی پریشان کرتی ہے۔ اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ آج زمانہ قیامت کی چال چل چکا ہے اور وہ وہی برسوں پرانی ڈگر پر کھڑا ہونقوں کی طرح سیکولرزم کے معنی پر غور کر رہا ہے۔

اس کی بیٹی کے بچوں کو مور بہت پسند ہے اس کی بھی خواہش ہے کہ ایک مور پال لیا جائے کیونکہ اسے نیشنل برڈ کا درجہ بھی حاصل ہے مگر اس کا داماد دھیمے لہجہ میں اسے مذہبی پرندہ بھی بتاتا ہے اس کا کھلا ذہن داماد کی بات سمجھ نہیں پاتا وہ اپنی بیٹی کو سمجھاتا ہے کہ جب تم نے اپنے آنگن میں تلسی کا پودا لگایا ہوا ہے تو پھر ایک مور پال لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ لیکن بیٹی اپنی الجھن اور خوف سے باہر نہیں نکل پاتی۔ اس کے اندر ایک سناٹا پسرا ہوا ہے جو کسی بھی وقت ایک طوفان کا روپ لے سکتا ہے وہ اپنی بیٹی کی الجھن سمجھ نہیں پاتا لیکن اس پریشانی سے وہ خود بھی پریشان

ہونے لگتا ہے۔ جب وہ مور پال لینے کی ضد پر اڑا رہتا ہے تو بیٹی بے بسی اور خوف سے کہتی ہے:

ابو مور پال تو لوں لیکن اگر وہ مر گیا تو۔؟''

یہ سوالیہ نشان پھیل کر بہت بڑا ہو جاتا ہے جس میں اس کے ساتھ بیٹی داماد اور اس کے بچے سبھی نظر آنے لگتے ہیں اور اس کانگریسی نیتا کا وہ اقبالیہ بیان بھی سنائی دیتا ہے۔ میں کانگریسی ضرور ہوں لیکن ایک سیکولر ہونے کی بجائے میں ایک ہندو ہوں۔

خوف کے سائے میں زندگی کس طرح گذرتی ہے اور پل پل مرنے پر آدمی کیسے مجبور ہوتا ہے۔ اپنے سائے سے بھی کس طرح خوف زدہ ہونا پڑتا ہے یہ سب کچھ اس کہانی میں نظر آتا ہے۔

حسین الحق کی کہانیوں میں فلش بیک کی عمدہ مثال دیکھنے کو ملتی ہے کبھی کبھی وہ اس کا استعمال ترپ کے پتے کی طرح بھی کرتے ہیں۔ خاص طور پر ان کی کھوئی ہوئی جہت بھی چپکے چپکے ان کی کہانیوں میں اپنے وجود کا احساس کرا دیتی ہے۔ یہاں بھی ....ایک ایسا ہی کردار ہے جو ان کے ناسٹلجیا کا حصہ ہے اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ مجھے اب اپنے دوسرے خواب کی تعبیر بھی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی ہے۔ مگر حیرت اس بات پر تھی کہ اس خواب میں ان کی رخشندہ شامل نہیں تھی۔ تو دراصل وہ صرف اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ درخشندہ وجود کے اندر ہی رہ رہی ہے۔

''مور پاؤں'' ایک ایسی سچائی ہے جس میں سبھی کردار سچے ہیں جو ان کے اندر ہے اسے بڑی بے باکی سے ظاہر کر دیتے ہیں لیکن راوی بھی اپنے آپ کو انتہائی سچا سمجھتا ہے اور مور کی طرح اپنے پنکھ پھیلا کر ان کے درمیان ناچنے لگتا ہے۔ لیکن جب ناچتے ناچتے اُس کی نظر اپنے پاؤں پر پڑتی ہے تب اسے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ آج کے دور میں اس کا وجود مور پنکھ جیسا نہیں ہے بلکہ مور پاؤں بن کر رہ گیا ہے۔

حسین الحق کی ایک کہانی ''انحد'' ہے اس میں بھی عورت پر ہو رہے ایک ایسے نادیدہ (Unseen) ظلم کی داستان نظر آتی ہے جو عام طور پر متوسط طبقہ کی عورتیں جھیلنے پر مجبور ہیں۔ ساتھ ہی اس کہانی میں دیور اور بھابھی کے درمیان ایک نامحسوس طریقہ سے پنپ رہی عجب سی محبت کا احساس بھی ہوتا ہے جس کی لو کبھی مدھم کبھی تیز ہوتی ہے سبطین رضا جو Graduation کا امتحان دینے کے بعد .M.A میں داخلہ لینے جا رہا ہے وہ اپنے رشتہ کے بھائی مظفر کی دلہن کو دیکھ کر اس پر وارے نیارے ہونے لگتا ہے اور اس کی بھابھی بھی اس کو دیکھ کر کافی خوش ہوتی ہے اور امتحان کے بعد اپنے یہاں آنے کی دعوت دیتی ہے۔ جب وہ برسات کے زمانے

میں کشتی پرسوار ہوکر اپنی بھابھی سے ملنے جاتا ہے تو اس کے اندر کی خواہش جس طرح اتھل پتھل مچاتی ہے اسے بڑی خوبصورتی سے حسین نے ان جملوں میں بیان کیا ہے۔

''مجھے ایسا لگا جیسے یہ کشتی لنگر توڑ کر بدمست ندی سے ملن کی موہ مایا میں لت پت ہو رہی ہے یہ کشتی مجھے ایسا پاگل محسوس ہوئی جس کے پیروں میں زنجیریں ڈال دی گئی ہوں اور پاگل پابہ زنجیر ہونے کے باوجود ناچنے کی کوشش کررہا ہو''

وہ جب مظفر بھیا کے گھر میں داخل ہوتا ہے تو اس کی پھوپھی جن کا منھ پان کی سرخی سے لال ہورہا تھا وہ اسے کڑک خاں کی طرح نظر آئیں۔اور جب اس نے ہکلاتے ہوئے اپنا نام سبطین بتایا تو ''ارے سبطے ہو جی'' کہتی ہوئی اس کی بھابھی چھلانگیں مارتی ہوئی اس کی طرف دوڑی اور اس سے کہنے لگی کہ تم نے اپنے بھیا سے وعدہ کیا تھا کہ Result نکلتے ہی آؤں گا تمہارے بھیا نے تمہارا کتنا انتظار کیا تو بھیا کی گردان اور پھوپھی کی گھورتی ہوئی آنکھوں سے اسے بہت کچھ سمجھ میں آ گیا اور اس نے یہ محسوس کیا کہ جس خوبصورت بھابھی کو اس نے شادی کے بعد دیکھا تھا۔وہ تو آگ کا شعلہ کے بجائے چولھے کی بجھی ہوئی لو ہو کر رہ گئی ہیں۔جس میں تپش کی بجائے صرف دھواں رہ جاتا ہے۔لیکن یہ ایک ایسا دھواں تھا جسے ہلکی سی پھونک بھی چنگاری میں تبدیل کرسکتی تھی اور کچھ ایسے لمحے آئے بھی جہاں بھابھی دیور کے رشتے نے اپنے محدود دائرے سے آگے نکلنے کی کوشش کی لیکن پرندے کی اڑان میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ اپنے بازو دیر تک پھیلائے رکھ سکتا۔اس دوران اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی پھوپھی خط لکھ لکھ کر اس کے بھائی کو آنے سے روکتی رہتی ہیں۔انتہا یہ ہے کہ اس کی بھابھی نے اپنی انتہائی افسوسناک خواہش کا بھی اظہار کیا کہ سبطے اسے زہر لادے تاکہ وہ اپنی اس بے کیف اور جبر بھری زندگی سے نجات پا جائے۔اس کہانی میں حسین نے خوبصورت الفاظ کے سہارے جذبات واحساسات کا ایک خاموش اور دلفریب رقص پیش کیا ہے جسے بیان کرنے کے بجائے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔یہ ایک گھر کی کہانی نہیں ہے بلکہ یہ ہزار گھروں کی کہانی ہوسکتی ہے۔اس کی طرف اشارہ اس کہانی کا عنوان ''انحد'' بھی کرتا ہے۔اس کہانی کا شمار حسین کی خوبصورت کہانیوں میں ہونا چاہئے۔ کب ٹھہرے گا درد اے دل بھی حسین کی ایسی کہانی ہے جس میں ایک جوان بیوہ کے درد کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔شباہت ایک ایسی لڑکی ہے جس کے سامنے اس کی عزیز ترین سہیلی راگنی بیوہ ہوجاتی ہے۔مرتے وقت اس کے شوہر نے وصیت کی تھی کہ راگنی کو ستی کرایا گیا تو اس کی آتما بے چین رہے گی مگر راگنی کو بھری جوانی میں شوہر کی چتا پر لیٹنا پڑا کیونکہ سوال خاندان کی پرمپرا کا تھا۔شباہت کے ٹوکنے پر اسے

جواب ملا تھا کہ تم خوش نصیب ہو بیٹی ہم اس سلسلے میں بدقسمت ہیں ۔اس درد کو بہت اندر تک شباہت نے محسوس کیا تھا۔اور شوہر کی موت کے بعد اس کے سسرال والوں نے اسے اپنی مرحوم اولاد کی نشانی سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا گیا جو اوروں کے ساتھ ہوتا تھا۔ کسی قسم کی کوئی کمی وہ جب مظفر بھیا کے گھر میں داخل ہوتا ہے تو اس کی پھوپھی جن کا منھ پان کی سرخی سے لال ہو رہا تھا وہ اسے کڑک خاں کی طرح نظر آئیں ۔اور جب اس نے ہکلاتے ہوئے اپنا نام سبطین بتایا تو ''ارے سبطے ہو جی'' کہتی ہوئی اس کی بھابھی چھلانگیں مارتی ہوئی اس کی طرف دوڑی اور اس سے کہنے لگی کہ تم نے اپنے بھیا سے وعدہ کیا تھا کہ Result نکلتے ہی آؤں گا تمہارے بھیا نے تمہارا کتنا انتظار کیا تو بھیا کی گردان اور پھوپھی کی گھورتی ہوئی آنکھوں سے اسے بہت کچھ سمجھ میں آ گیا اور اس نے یہ محسوس کیا کہ جس خوبصورت بھابھی کو اس نے شادی کے بعد دیکھا تھا۔وہ تو آگ کا شعلہ کے بجائے چولھے کی بجھی ہوئی لوہو کر رہ گئی ہیں ۔جس میں تپش کی بجائے صرف دھواں رہ جاتا ہے۔لیکن یہ ایک ایسا دھواں تھا جسے ہلکی سی پھونک بھی چنگاری میں تبدیل کر سکتی تھی اور کچھ ایسے لمحے آئے بھی جہاں بھابھی دیور کے رشتے نے اپنے محدود دائرے سے آگے نکلنے کی کوشش کی لیکن پرندے کی اڑان میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ اپنے بازو دیر تک پھیلائے رکھ سکتا۔اس دوران اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کی پھوپھی خط لکھ لکھ کر اس کے بھائی کو آنے سے روکتی رہتی ہیں ۔انتہا یہ ہے کہ اس کی بھابھی نے اپنی انتہائی افسوسناک خواہش کا بھی اظہار کیا کہ سبطے اسے زہر لا دے تا کہ وہ اپنی اس بے کیف اور جبر بھری زندگی سے نجات پا جائے ۔اس کہانی میں حسین نے خوبصورت الفاظ کے سہارے جذبات واحساسات کا ایک خاموش اور دلفریب رقص پیش کیا ہے جسے بیان کرنے کے بجائے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے ۔یہ ایک گھر کی کہانی نہیں ہے بلکہ یہ ہزار گھروں کی کہانی ہو سکتی ہے ۔اس کی طرف اشارہ اس کہانی کا عنوان ''انحد'' بھی کرتا ہے ۔اس کہانی کا شمار حسین کی خوبصورت کہانیوں میں ہونا چاہئے ۔

کب ٹھہرے گا درد اے دل بھی حسین کی ایسی کہانی ہے جس میں ایک جوان بیوہ کے درد کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شباہت ایک ایسی لڑکی ہے جس کے سامنے اس کی عزیز ترین سہیلی راگنی بیوہ ہو جاتی ہے ۔مرتے وقت اس کے شوہر نے وصیت کی تھی کہ راگنی کو ستی کرایا گیا تو اس کی آتما بے چین رہے گی مگر راگنی کو بھری جوانی میں شوہر کی چتا پر لیٹنا پڑا کیونکہ سوال خاندان کی پرمپرا کا تھا۔شباہت کے ٹوکنے پر اسے جواب ملا تھا کہ تم خوش نصیب ہو بیٹی ہم اس سلسلے میں بدقسمت ہیں ۔اس درد کو بہت اندر تک شباہت نے محسوس کیا تھا۔اور شوہر کی موت کے بعد اس کے سسرال والوں نے اسے اپنی مرحوم اولاد کی نشانی سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا گیا جو اوروں

کے ساتھ ہوتا تھا۔ کسی قسم کی کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دی گئی لیکن کسی نے شباہت کے اس درد کو محسوس نہیں کیا کہ رات رات بھر وہ جاگتی کیوں ہے اور اس کی ڈھلی ڈھلی ہر صبح کسی نہ کسی طرح میلی کیوں ہو جاتی ہے۔ پہلی جنوری کو دوسروں کی طرح وہ بھی جب بچوں کو ساتھ لے کر ان کو گھمانے کے لئے باہر جانے کا ارادہ کرتی ہے تو اس کی ساس بہت محبت اور پیار سے اسے جانے سے روکتی ہے۔ مگر جب شباہت یہ بتاتی ہے کہ اس کی عدت تو پوری ہو چکی تو اس کی ساس بہت نرمی سے جواب دیتی ہے:

''ہاں بیٹی! مگر سال ڈیڑھ سال ہم لوگوں کے یہاں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا'' تب اسے راگنی کے پتا کی بات یاد آتی ہے ''پرکھوں کی پرمپرا توڑنا بہت مشکل ہے بیٹی'' تب وہ سوچنے لگتی ہے کہ راگنی اور اس میں فرق کتنا ہے؟ اس کے شوہر کے انتقال کے بعد اس کے بچے شرعی طور پر مجوب ہو گئے۔ ان بچوں کی خاطر وہ سارا درد سہنے پر مجبور ہے اور محبتوں کے درمیان بھی وہ خود کو درد کے ساغر میں ڈوبتا ہوا محسوس کرتی ہے وڈمبنا تو یہ ہے کہ پاکستان میں اس کے رشتہ کی بہن شائستہ کی شادی ۳۴ر برس کی عمر میں ہونے کی خبر آتی ہے۔ اور اس سے ۱۰ر دس سال چھوٹی شباہت ۲۴ر سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی اس کے والدین اس بات سے مطمئن ہیں کہ اس کی بیٹی سسرال میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور سسرال والے اسے اپنے بیٹے کی امانت سمجھ کر حفاظت سے رکھے ہوئے ہیں لیکن اس کے اندر کے درد کو کوئی محسوس نہیں کرتا اس کے شوہر کی بیوہ پھوپھی اسے ایک شہزادی کی کہانی سناتی ہے جہاں برسات کا پانی چھاجھوں برس رہا ہے اور لڑکی جنگل کی اندھیری رات سے جوجھ رہی ہے تب شباہت یہ سوچتی ہے کہ جنگل کی اندھیری رات میں شہزادے ایک ہی مرتبہ کیوں آتے ہیں۔ اپنے سارے حالات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے شباہت یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ کاش! ....وہ راگنی ہوتی اور پوری زندگی تل تل مرنے کے بجائے ایک ہی بار چتا پر لیٹ کر سارے دکھوں سے آزاد ہو جاتی۔

حسین نے اس کہانی کے ذریعہ سماج میں ہو رہے ایک ظلم کی طرف اشارہ کیا ہے جسے لوگ عام طور پر محسوس نہیں کرتے۔ ویسے تو ہر سماج میں بیوہ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ لیکن یہاں شباہت کے ساتھ بہت اچھے سلوک کے بعد بھی کس طرح تل تل مرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ سچائی اس کہانی میں ابھر کر سامنے آئی ہے اور فنکارانہ انداز میں عقدِ بیوگان کی افادیت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ حسین الحق نے بہت فنکاری سے محبت کے اندر چھپے ظلم کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کم وبیش کچھ ایسا ہی معاملہ برجس کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس کا رشتہ پاکستان میں رہنے والے اس کے پھوپھیرے بھائی عرفان سے بڑی خاموشی کے ساتھ طے کیا جاتا ہے لیکن اس

کا اعلان نہیں کیا جاتا۔ وہ صرف عرفان کی ایک جھلک دیکھتی ہے عرفان اس کے کمرے میں آتا ہے اور خاموشی سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ صرف ایک جملہ کہہ پاتا ہے مگر مجھے پتہ نہیں تم کیا سوچتی ہو؟ یہی ایک جملہ برجیس کی کل کائنات ہے۔ عرفان کی نوکری عراق میں ہوتی ہے اور عراق کی جنگ میں وہ مارا جاتا ہے۔ برجیس کے والد اس بات پر مطمئن ہیں کہ برجیس کے رشتے کی بات عام ہونے سے بچ گئی۔ لیکن انہیں اس بات کا قطعی احساس نہیں ہوتا کہ برجیس کے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ اور اس کے آنسوؤں کی دھار نے اندر ہی اندر سے اُسے کس طرح بھگویا ہوگا جو شادی ہونے سے پہلے ہی خود کو بیوہ سمجھنے پر مجبور کر دی گئی۔ اس کہانی ''لڑکی کو رونا منع ہے'' میں حسین نے برجیس کے کنوارے درد کو بہت خوبصورتی سے ابھارنے کی کوشش کی ہے درد کی یہ کہانی صرف برجیس کی نہیں ہے بلکہ اس میں والدین کی بے حسی بھی ہمیں جھنجھوڑنے کا کام کرتی ہے۔ اس سچائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لڑکی کے اندر ہو رہے اتھل پتھل کی جانکاری والدین کو نہیں ہو پاتی اور لڑکی کی شادی کے فیصلے میں وہ صرف اپنی پسند اور ناپسند پر ہی توجہ دیتے ہیں۔ اس سے ایک نہیں سیکڑوں برجیس کا درد ہمارے سامنے آجاتا ہے، اس کہانی کا ایک سچ یہ بھی ہے کہ عراق کی جنگ کا اثر صرف عراق پر نہیں پڑا۔ عراق تو ہر گھر آنگن میں گھس آیا۔

اس مجموعے میں سیاست کے گلیارے کی کہانیاں بھی بیان کی گئی ہیں جس میں ''جلیبی کارس'' آج کے سیاسی گلیارے کے اندھیرے کو ایک تلخ حقیقت کی طرح سامنے لانے کا اہم کرتی ہے۔ روشن بہاری آج کے سیاسی کارندے کا نمائندہ کردار ہے جو اپنے سیاسی مفاد کے لئے .... اپنے ضمیر کا قتل کرتا ہے اور اپنی بیوی کی عزت کا بھی سودا کرنے پر شرمندگی محسوس نہیں کرتا۔ ششی بھوشن، مکھ منتری کا قریبی آدمی ہے اس نے روشن بہاری پر سیاسی احسانات کئے ہیں وہ شراب کے نشے میں اس کی بیوی کے ساتھ اس کے بیڈروم میں بند ہے مگر جب ششی بھوشن سامنے آتا ہے تو روشن بہاری کا غصہ دودھ کے اُبال کی طرح سرد ہو جاتا ہے اور وہ شکرانے کے طور پر ششی بھوشن کا پاؤں چھونے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے جلیبی کارس میں آج کی سیاست کی ایک ایسی ننگی سچائی بیان کی گئی ہے جس سے ہر کوئی واقف ہے لیکن پھر بھی بے ضمیر لوگ اس دلدل کی جانب بڑھنے سے خود کو نہیں روک پاتے۔ حسین نے تو ایک آئینہ سامنے رکھ دیا اگر لوگ چہرے کو نہ پہچان سکیں تو پھر اس میں فنکار کا کیا قصور۔

مجموعے کی آخری اور سرنامہ کی کہانی ''نیو کی اینٹ'' پر بھی سرسری نگاہ ڈال لی جائے۔ یہ کہانی بابری مسجد کی شہادت کے پس منظر میں بیان کی گئی ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ بابری مسجد کے شہادت کے بعد بھی کارسیوک مسجد کی ایک ایک اینٹ اٹھا کر لے گئے تھے اسی میں ایک شیو پوجن بھی ہے جو اجودھیا سے نیو کی اینٹ

لے کر آتا ہےاور سارے لوگوں کے درمیان وہ اچانک اہم ہو جاتا ہے پنڈال لگائے جاتے ہیں اور جے شری رام کے نعرے چاروں طرف گونجنے لگتے ہیں۔شیو پوجن کا پڑوسی سلامت اللہ اور اس کی بیوی بچے خوفزدہ ہو جاتے ہیں ۔شیو پوجن کی لائی ہوئی اینٹ ایک طرف کہیں پوجنے لائق ہوتی ہے تو دوسری طرف خوف کا ماحول بھی پیدا کرتی ہے ۔سلامت اللہ کی نگاہوں میں گذرے ہوئے فسادات کی تصویر گھومنے لگتی ہے اور اسے لوگوں کے نعرے اور تضحیک بھری سرگوشی بھی یاد آتی ہے تب وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی جنگ میں ہارا ہے جس میں اس نے حصہ ہی نہیں لیا۔

چونکہ سرکار اپوزیشن والوں کی ہے اور شیو پوجن کے گھر آئی ہوئی اینٹ کی خبر پر پرشاسن متوجہ ہو جاتا ہے نتیجتاً آن کی آن میں شامیانہ اور بھیڑ سب غائب بھجن بھی بند اور شیو پوجن سلامت اللہ سے زیادہ پریشان دکھائی دینے لگتا ہے ۔اسے اپنے یہاں پولیس کے چھاپے کا ڈر ہے اجودھیا سے لائی گئی نیوکی اینٹ کل تک اس کے لئے فخر کا اعلانیہ تھی مگر اب گلے کی ہڈی بن گئی ہے اور وہ اس سے نجات کی صورت تلاشنے لگتا ہے ۔وہ اس اینٹ کو اپنے گھر سے ہٹا کر کسی دوسرے کے گھر میں رکھنا چاہتا ہے لیکن کوئی بھی ہندو اپنے یہاں رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ جبکہ کل تک سارے لوگ اس کی پوجا کر رہے تھے ۔اس اینٹ سے سب سے زیادہ خوف زدہ سلامت اللہ کا ہی خاندان تھا اور شیو پوجن یہ اینٹ یہ کہہ کر سلامت اللہ کو ہی تھما جاتا ہے کہ یہ آپ کے لئے بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی ہمارے لئے شیو پوجن اپنے گھر میں تالا لگا کر پورے خاندان کے ساتھ کاشی اور متھرا کی یاترا پر نکل جاتا ہےاور سلامت اللہ یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ وہ اس نیو کی اینٹ کا کیا کرے۔

حسین الحق نے نیو کی اینٹ کے بہانے بابری مسجد کی شہادت کے بعد مسلمانوں کے اندر ڈرے سہمے جذبات کی خوبصورت عکاسی کی ہے ۔دوسری طرف اس سچائی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ کل تک جو اینٹ فخر کا باعث اور پوجنے لائق شئے تھی وہ اچانک انہیں لوگوں کے لئے کس طرح قابل نفرت اور معتوب بن گئی ۔انہوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ تھوڑے سے خوف کے باعث لوگ کس طرح اپنے دھرم ایمان سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔

وقت نے تھوڑا سا پلٹا کھایا یہ اینٹ ایسے شخص کو سونپ دی گئی جسے اس اینٹ سے چڑھایا جا رہا تھا۔اس زمانے میں سماج اور دفتر میں جس قسم کے سرگوشی بھرے حالات تھے اس کی بہتر عکاسی حسین کی اس کہانی میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

حسین الحق ایک ایسا فنکار ہے جس نے سماج کے ہر طبقہ سے کردار کا انتخاب کیا ہے اور زمانے اور حالات کی بہتر عکاسی کی ہے سچا فنکار وہی ہوتا ہے جس کی کہانیوں میں زمانہ بولتا ہے اور زمانہ کے اعتبار سے کردار ہمارے سامنے آتے ہیں حسین خوبصورت زبان کا استعمال کرتے ہیں جذبات کی عکاسی میں انہیں مہارت حاصل ہے۔ کبھی کبھی وہ رنگوں چاند، ستارے، ہوا، سرگوشی، ہاتھ پاؤں کے اشارے چہرے کی تمتماہٹ' جذبات کے اُبال' آنکھوں سے بہتے درد اور سماج کی ننگی سچائیوں کو بڑے خوبصورت استعاراتی انداز میں بیان کرتے ہیں اور اپنے فن کا لوہا منوانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ حسین کی کہانیوں میں وقت بولتا ہے زمانہ سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے ہوا کی سسکیاں بھی کہانی سناتی ہیں اور مدھم سرگوشی میں بھی جذبات کا درد بیان ہوتا ہے۔ محبت کو حسین اپنی کہانیوں میں نیو کی اینٹ کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ محبت ان کی کہانیوں میں لاشعوری طور پر محسوس ہوتی رہتی ہے کبھی اشارے کنائے میں اور کبھی کھل کر اس کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ محبت کو چھپاتے بھی نہیں حسین کی کہانیوں میں محبت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے وہ اس آگ کے دریا میں ڈوب کر پار اترنے کا ہنر جانتے ہیں۔

وہ فنکار بہت خوش نصیب ہوتا ہے جو اپنے جذبات کو کردار پر حاوی نہیں ہونے دیتا۔ اردو فکشن کی جب بھی کوئی مستند تاریخ لکھی جائے گی حسین کی کہانیوں کا شمار کئے بغیر وہ ادھوری سمجھی جائے گی۔

حسین الحق۔شہر داستاں کا معزز شہری

معصوم عزیز کاظمی

موبائل : 9431422786

ادب خلا میں پیدا نہیں ہوتا ہے۔ یہ ادیب کی تپسیا کا حاصل ہے۔اس کی تخلیق میں مطالعہ،مشاہدہ،جذبات ،احساسات، رنج وغم ،افراد و سماج اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ادب کا تخلیقی عمل سانس لینے کی مہلت تو عطا کرتا ہے لیکن سکون و اطمینان اسے کم نصیب ہوتا ہے۔خوب سے خوب تر کی تلاش ایک ادیب کو ہر لمحہ متحرک رکھتی ہے۔کسی مقام پہ اسے ٹھہراؤ کا مختصر وقفہ تو حاصل ہوتا ہے لیکن مستقل قیام ایک خواب ہے۔رشتوں کو یہاں دوام حاصل نہیں ہے۔حبیب کب حریف اور رفیق کب رقیب بن جائے یہ کہنا ایک مشکل امر ہے۔یہاں تاج اچھالے جاتے ہیں،دستار اتارے جاتے ہیں اور دامن تار تار کیا جاتا ہے۔بت تراشے جاتے ہیں اور منہدم کیے جاتے ہیں۔ادب کی وادیِ پر خار میں اعلیٰ و ادنی کا خیر مقدم ہوتا ہے لیکن سرخروئی اور سرفرازی اس کا مقدر بنتی ہے جو یقیں محکم اور عمل پیہم پر عمل پیرا ہوتا ہے۔حسین الحق ان چند خوش نصیبوں میں ہیں جنھیں ان کے بے غرض ادبی تپسیا کے لیے عزت و افتخار سے نوازا جاتا رہا ہے۔

حسین الحق صرف ایک ادیب نہیں ہے۔وہ بیک وقت معلم، خطیب،تاریخ داں، رہنما اور عاشق ہیں۔اختلاف کرنا ان کے مزاج میں شامل ہے۔ وہ خود کو منوانے کے لیے دوسرے کو رد کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔اختلاف کو نمایاں کر مرعوب کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔مرعوب ہونا ان کی سرشت میں شامل نہیں ہے۔عظمت کا اعتراف ان کے مزاج میں ہے لیکن سپردگی ان کے خمیر میں نہیں ہے۔زندگی کے آزمائشوں اور آلائشوں نے انھیں ایک ایسا عزم و حوصلہ عطا کیا ہے جہاں مصلحت گناہ اور بے باکی گناہ بن جاتی ہے۔صوفی خانوادے کے فرد ہونے کے ناطے انھوں نے زندگی کے ہر غم کو سینے سے لگایا۔من و تو کی لکیر ان کی نظروں سے دور ہوگئی جو انسان کو عقیدے اور مسلک کی بنیاد پہ تقسیم کرتی ہے۔ابتدائی تعلیم و تربیت نے انھیں وسیع النظر اور وسیع القلب بنا دیا۔وہ آج تک اس پہ کاربند ہیں۔

۲رنومبر ۱۹۴۹ء کو مولانا انوار الحق شہودی، ضلع سہرام کے گھر ایک بچّے نے جنم لیا جس کا نام حسین الحق رکھا گیا۔

مولانا انوارالحق ایک صوفی خانوادے سے تھے۔صاحب علم ہونے کے علاوہ وہ ایک ادیب،شاعراورواعظ بھی تھے۔ایک ملاقات میں دوران گفتگو جب میں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے اسلوب کے خود موجداور خود خاتم تھے،تب حسین الحق نے نہایت انکساری کے ساتھ کہا کہ یہ ایک خیالِ خام ہے۔میں نے نگاہیں ان کے چہرے پہ شرارت بھری مسکراہٹ تلاش کرنے کے لیے مرکوز کیں لیکن ان کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔ میں نے ان سے وضاحت چاہی تو انھوں نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا کہ میرے والد مولانا انوارالحق کا اسلوب مولانا آزاد کے اسلوب سے مشابہت رکھتا ہے۔اب میرے چونکنے کی باری تھی کیونکہ میرے ناقص مطالعے سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی تھی۔ مجھے حیرت میں دیکھ کر حسین الحق اندرون خانہ گئے اور چند چھوٹی بڑی کتابیں لے کر واپس آئے۔کتابیں سونپتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ان کا مطالعہ کریں اور پھر میری باتوں پہ غور کریں۔ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد حسین الحق کے خیال کو تسلیم کرنے میں مجھے کوئی تامل نہ تھا۔مولانا انوارالحق کے گھر میں دولت کی ریل پیل نہ تھی،قناعت تھی۔گھر میں اسلامی شعائر کی پیروی لازم تھی۔حسین الحق ابتدائی تعلیم والد بزرگوار کے زیرسایہ تکمیل تک پہنچی۔والد نے ان کی ذہنی کیفیت کو مذہب وتصوف سے ہم آہنگ کیا لیکن ادب کی طرف ان کی والدہ شوکت آرا نے انھیں مائل کیا۔انھوں نے مولوی کا امتحان مدرسہ بورڈ سے پاس کیا۔درس عالم تک کی تعلیم مدرسہ خانقاہ کبیریہ' سہسرام میں پوری ہوئی۔حسین الحق نے خود اپنے الفاظ میں تعلیمی،ادبی اور تدریسی سفر کی روداد ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

> ''میں ۲؍نومبر ۱۹۴۹ء کو سہسرام میں پیدا ہوا۔ابتدائی اور مذہبی تعلیم کے بعد آرہ ضلع اسکول سے میٹرک کیا۔ایس۔پی۔جین کالج سے گریجویشن کیا اور یونیورسٹی میں فرسٹ کلاس فرسٹ آیا۔ پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم.اے کیا اور اس میں بھی ٹاپ کیا۔مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا سے فارسی میں ایم.اے کیا اور فرسٹ کلاس سیکنڈ پوزیشن پائی۔اردو افسانوں میں علامت نگاری کے موضوع پر ۱۹۸۵ء میں پی ایچ۔ڈی کا کام مکمل ہوا، ایم۔اے کرنے کے فوراً بعد گرو گوند سنگھ کالج، پٹنہ سیٹی میں عارضی طور پر بحیثیت لیکچرار جوائن کیا۔پھر کچھ دنوں کے بعد یو.جی سی سے جونیر فیلوشپ ملی اور غالباً ۱۹۷۴ء تک ریسرچ فیلو کی حیثیت سے پٹنہ یونیورسٹی میں ریسرچ کا کام بھی کرتا رہا اور آئی اے سے ایم اے تک کی کلاسیں بھی لیتا رہا۔میرے اس زمانہ کے شاگردوں

میں پروفیسر شاداب رضی، ڈاکٹر انیس صدری، ڈاکٹر نعیم فاروقی اور آج کے کانگریسی لیڈر شکیل الزماں انصاری کا نام قابل ذکر ہے۔ اسی درمیان کمیشن سے ایس۔ پی کالج دمکا میں بحالی ہوئی۔ ۱۹۸۱ء میں مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ میں تبادلہ ہوگیا اور اس وقت سے اب تک وہیں مصروف کار ہوں (اب سبکدوش) میری شادی نشاط آرا خاتون بنت سید محمد اسرار الحق ریٹائرڈ اسسٹنٹ رجسٹرار ٹو وی سی سے ۱۹۷۷ء میں ہوئی۔ اہلیہ گیا کے ایک ہائی اسکول میں اردو ٹیچر ہیں۔ دو بیٹی اور دو بیٹے اللہ نے عطا کئے۔ (ماشاء اللہ سب اعلی تعلیم سے آراستہ ہیں) لکھنے پڑھنے کا کام دس برس کی عمر سے شروع ہوگیا تھا۔ پہلی کہانی 'عزت کا انتقال' صوفی بلیاوی کے نام سے ماہنامہ 'کلیاں' لکھنؤ میں غالباً ۱۹۶۴ء یا ۱۹۶۵ء میں چھپی۔ اسی زمانہ میں پہلا افسانہ 'پسند' ماہنامہ 'جمیلہ' دہلی میں چھپا۔ ۱۹۶۶ء میں شفق اور فخر رضوی کے ساتھ مل کر میں نے بچوں کا ایک رسالہ 'انوار صبح' سہسرام سے نکالا۔ میرا پہلا مضمون 'بہار کی خبریں' پٹنہ میں غالبا ۱۹۶۹ء میں چھپا جس کا عنوان تھا 'اردو شاعری پر گاندھی جی کے اثرات'، آج تقریباً دو سو افسانے ڈیڑھ سو مضامین، پانچ افسانوی مجموعے دو ناول، چار نثری کتابیں شائع ہوچکی ہیں جس میں مطلع کو بہار اردو اکیڈمی نے پہلے ناول کا اور ناول فرات کو دوسرے انعام کا اور افسانوی مجموعوں 'پس پردہ شب' اور 'صورت حال' کو بھی دوسرے انعام کا مستحق سمجھا۔ وزارت فروغ انسانی حکومت ہند کی طرف سے جونیر فیلوشپ اور سینئر فیلوشپ دونوں سے نوازا گیا۔ پچاسوں سینار، کانفرنسوں اور جلسوں میں شرکت کا موقع ملا۔ حتی الامکان اور اپنی بساط بھر زبان و ادب سے جڑے رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ باقی آپ جانیں اور اردو والے جانیں۔"

اس روداد میں ۲۰۰۳ء تک کے ادبی مہمات کا ذکر ہے۔ حسین الحق اس عرصے کے بعد بھی درس و تدریس کے اہم فرائض نبھاتے ہوئے جوش جنوں کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ ۱۹۹۲ء میں وہ ریڈر شعبہ اردو مگدھ یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر فائض ہو گئے۔ نومبر ۲۰۱۴ء میں وہ پروفیسر اور صدر شعبہ اردو مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ ان کے شایع شدہ افسانوں کی کل تعداد تقریباً دو سو ہے لیکن افسانوی

مجموعوں کی کل تعداد سات ہے۔ان کے افسانوی مجموعے تواتر سے شایع ہوتے رہے ہیں جن میں (۱) پس پردہ شب ۱۹۷۹ء (۲) صورت حال ۱۹۸۱ء (۳) بارش میں گھرا مکان ۱۹۸۳ء (۴) گھنے جنگلوں میں ۱۹۸۵ء (۵) مطلع ۱۹۹۰ء (۶) سوئی کے نوک پہ رکا لمحہ ۱۹۹۶ء (۷) نیو کی اینٹ ۔شامل ہیں۔اس کے علاوہ پروفیسر صغیر افراہیم نے حسین الحق کے افسانوں کا انتخاب شائع کیا ہے جس میں سولہ افسانے شامل ہیں۔ناول (۱) بولومت چپ رہو ۱۹۹۰ء (۲) فرات ۱۹۹۲ء، دوسرا نظر ثانی ایڈیشن ۲۰۱۵ء (۳) اماوس میں خواب ۲۰۱۷ء میں شائع ہوئے ہیں۔ دیگر تصانیف میں (۱) نثر کی اہمیت (۲۰۱۳ء) (۲) اردو فکشن ہندوستان میں (۲۰۱۴ء) (۳) آثار حضرت وصی (۲۰۰۱) (۴) آثار حضرت وحید اصدقی (۱۹۹۸ء) (۵) آثار بغاوت (۲۰۱۶ء) (۶) تفہیم تصوف (۲۰۱۵ء) (۷) شرح غیاث الطالبین (۱۹۹۸ء) کے علاوہ حضرت انوار الحق شہودی نازش سہرامی کی چھ ۶ کتابوں کی ترتیب وتدوین شامل ہے۔ یہ تفصیل اس بات کا

ثبوت ہے کہ حسین الحق ہر دم ادبی طور پر فعال رہے۔اردو دنیا نے ان کی خدمات کا اعتراف ایوارڈ اور انعامات کی شکل میں دیا ہے۔ مجموعی خدمات کے اعتراف میں سہیل عظیم آبادی فکشن ایوارڈ (بہار اردو اکیڈمی/ ۲۰۱۵ء)، کل ہند ادب ایوارڈ (بنگال اردو اکیڈمی/ ۲۰۱۴ء) کل ہند غالب ایوارڈ (غالب انسٹی چیوٹ نئی دہلی/ ۲۰۱۷ء)، شمیم نکہت ایوارڈ (لکھنؤ/ ۲۰۲۱)، ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ (نئی دہلی ۲۰۲۱ء) شامل ہیں۔ان کی تخلیقات (۱) مطلع (پہلا انعام بہار اردو اکیڈمی ۱۹۹۶ء)، (۲) نثر کی اہمیت (پہلا انعام) (۳) اردو فکشن ہندوستان میں (پہلا انعام) (۴) تفہیم تصوف (پہلا انعام) (۵) فرات (دوسرا انعام ۱۹۹۴ء) (۵) اماوس میں خواب (ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ نئی دہلی ۲۰۲۱ء) شامل ہیں۔

حسین الحق نے ۱۹۷۴ء میں ایم؛ اے فارسی کی سند سند مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا سے حاصل کی۔ ۱۹۷۶ء میں ان کی تقرری گیا کالج گیا میں بحیثیت لیکچرار ہوئی اور اس طرح گیا میں ان کے مستقل قیام کی ابتدا ہوئی۔انھوں نے گیا کو اپنایا اور گیا نے باہیں پسار کر انھیں اپنا لیا۔ ملازمت کے سلسلے میں میرا قیام ۱۹۷۲ء کے بعد گیا سے باہر رہا۔ ۱۹۷۷ء میں میری تقرری محکمہ نگرانی بہار میں ہوئی اور تعیناتی گیا شہر میں کی گئی۔ میں نے حسین الحق کو ان ہی ایام میں دیکھا۔ میانہ قد روشن چہرہ۔ متجس آنکھیں، گھنے بال، شرعی داڑھی اور ہر دم متحرک رہنے والے اس شخص کو ایک مجلس میں دیکھ کر میں نے ایک واقف کار سے اس کے کوائف جاننا چاہا۔اس بندے نے آنکھیں پھیلا کر کہا کہ حیرت ہے آپ یونیورسٹی کے داماد کو نہیں جانتے ہیں۔ میں نے مزید حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بھائی یونیورسٹی

کا استاد، یونیورسٹی کا طالب علم، یونیورسٹی کا کارندہ تو سنا ہے لیکن یہ یونیورسٹی کا داماد کون سی شئے ہے؟ اس بندے نے اپنے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا کہ یہ حسین الحق ہیں گیا کالج کے شعبہ اردو کے نئے استاد۔ ان کی شادی مگدھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے پی اے سید محمد اسرار الحق کی صاحبزادی سے ہوئی اور اس رشتے سے یہ یونیورسٹی کے داماد ہیں۔ ان دنوں بھی لوگ حسین الحق کے اخلاق، اخلاص اور وضع داری کے قائل تھے۔

گیا میں ان دنوں ادبی سرگرمیاں شباب پر تھیں۔ ظفیر الدین شمس مینائی، علامہ سریر کابری، ریاست علی ندوی، ادریس سنسہاروی، معین شاہد، ادیب حسن ادیب، فرحت قادری، تاج انور، ڈاکٹر سید محمد حسنین، وہاب اشرفی، شاہد احمد شعیب، عبدالصمد، مقصود عالم گیاوی، حکیم یوسف پھلواری، قسیم الحق گیاوی، جگیشر پرشاد خلش، منیر واحدی، کیدار ناتھ اشک، کلام حیدری، بدنام نظر، عشرت ظہیر، نعمان ہاشمی، مختار احمد عاصی، ڈاکٹر حسن مثنیٰ ادبی طور پر ہر طرح سے فعال تھے۔ ماہنامہ 'سہیل'، ماہنامہ آہنگ، ہفتہ وار لال مرچ، ہفتہ وار ہمزاد، ہفتہ وار مورچہ اور ہفتہ وار آدرش پورے آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہے تھے۔ کلام حیدری نئی نسل کے پیر مغاں تھے۔ رسالہ آہنگ میں نئی نسل کے تخلیق کاروں کی تخلیقات پورے طمطراق کے ساتھ شائع ہو رہی تھیں۔ کلام حیدری کی سرپرستی اور ہمت افزائی اس نئی نسل کو حاصل تھی۔ حسین الحق، شوکت حیات، عبدالصمد، شفق، انور قمر، سلام بن رزاق، انور خاں، حمید سہروردی، علی امام، م ق خاں، سید احمد قادری، شمیم افزا قمر کا خصوصی مطالعہ رسالہ آہنگ میں پیش کیا گیا۔ اس سے اردو ادب میں ان کی شناخت بنی۔ حسین الحق اپنی ادبی صلاحیتوں کی بنا پر کلام حیدری کے منظور نظر تھے۔ رینا ہاؤس میں برپا تمام جشن اور ہنگامے اس بات کی گواہ ہیں کہ حسین الحق کبھی خاموش تماشائی نہ رہے۔ وہ ہر مقام پر اپنی موجودگی درج کراتے رہے۔ بقول عبدالصمد حسین الحق کو ہر جگہ، ہر موقع پر اپنے آپ کو منوانے اور اپنی انفرادیت قائم رکھنے کا جنون تھا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جوانی کے دنوں میں انھوں نے عشق کے میدان میں چاندماری کی لیکن کس حد تک ظفریاب رہے یہ صیغۂ راز میں ہے۔ کلام حیدری نے ان کے بارے میں کہا کہ ان کے پاس روایت کا خزانہ ہے۔ اور وہ انھیں عہد جدید کے لئے Relevent بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مذہب ان کی تربیت کا پس منظر ہے۔ کلام حیدری کا یہ بیان آدھی سچائی کو اجاگر کرتا ہے۔ حسین الحق کے پاس روایات کے ساتھ حکایات کا بھی خزانہ ہے۔ حکایات کا پٹارہ انتظار حسین کے پاس بھی تھا لیکن وہ اسے دور جدید سے Relevent نہیں کر پائے تھے بلکہ دور جدید کے کثافت کو اجاگر کرنے کے لئے حکایات کا سہارا لیا کرتے تھے۔ حسین الحق کی تخلیقات میں حق و باطل کا تصادم، شر و خیر کی نبرد آزمائی، ایثار و حرص کی کارفرمائی پوری شدت کے ساتھ موجود ہے، لیکن وہ اپنی

کتھااور کہانیوں میں سب کچھ بیان کرنے کے باوجود بھی غیر جانب دار رہتے ہیں اور نتیجہ اخذ کرنے کا حق قاری پر چھوڑ دیتے ہیں۔انھوں نے زندہ خواب سجائے ہیں ۔اہم اور حساس موضوعات کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے ۔اس پیش کش میں دردمندی کے ساتھ جرأت اظہار بھی شامل ہے۔

ستر کی دہائی سے وہ افسانہ لکھ رہے ہیں ۔اس دور میں جدیدیت کا ڈنکا بج رہا تھا۔روایتیں منہدم ہو رہی تھیں اور ماضی کو رد کرنا ایک فیشن بن چکا تھا۔حسین الحق جدیدیت کے کارواں کا نہ صرف حصہ بنے بلکہ انھوں نے اس نظریے کو فروغ بخشا۔ جدیدیت کے علمبردار رسائل میں وہ خوب چھپے۔قیام نیر نے حسین الحق کے اس دور کی تخلیقات پر بڑا بامعنی تبصرہ کیا ہے۔

> ''حسین الحق صاحب افسانہ نگاری کے تیسرے دور سے لکھ رہے ہیں، یہ وہ دور تھا جب افسانے میں نئے تجربے ہو رہے تھے،علامت نگاری کا بول بالا تھا،شعور کی رو پہ کہانیاں لکھنا ایک فیشن بن چکا تھا، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس رجحان اور رویے کو اپنایا، لیکن اس ڈھنگ سے اپنایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے جدید افسانے کی دنیا میں ان کا نام اہمیت کا حامل بن گیا۔وہ اردو افسانوں میں اظہار کی تیز دھار ، نئے نئے الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی تخلیقی سطح کی وجہ سے اپنے ہمعصروں سے کافی آگے بڑھ گئے ہیں۔وہ کسی مسئلے کو سننے سے زیادہ محسوس کرتے ہیں اور بے باک ہو کر گفتگو کرتے ہیں۔یہی ایک ایسی طاقت ہے جس کے ذریعے وہ پوری کائنات کو سانسوں میں اتار لینا چاہتے ہیں۔''

حسین الحق کے افسانے زندگی کی صداقتوں، کثافتوں اور آلائشوں سے عبارت ہیں۔وہ کسی ایک عہد،قومیت، خطہ ،ثقافت اور نظریے پہ اپنی نظر و توجہ مذکور نہیں کرتے ہیں بلکہ انھوں نے تاریخ کے ساتھ دستاویز اور سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی روایتوں کا مطالعہ بھی کیا ہے۔وراثت میں ملی تاریخ،تہذیب،ثقافت اور اقدار انھیں عزیز ہیں۔وہ انھیں انسان،انسان دوستی اور انسانیت کی بنیاد سمجھتے ہیں۔زندگی کے نشیب و فراز اور اسرار و رموز کو انھوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔حسین الحق کا اعتراف ہے:

> ''آدمی پر ہونے والے مظالم،کمزور آدمی کے خلاف ،ظالم و جابر انسانی گروہوں کی سازشیں،منفی اقدار کا پھیلاؤ،وحدت اعظم ،وحدت کائنات،سماج میں پھیلی گندگی، تقسیم ہند کے ہولناک اثرات ، فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں انسانی درندگی کی

روداد، اقتدار کے ذریعہ ہماری طاقت، ملوکیت، حمایت کے بدترین نتائج، وحدت وجود کی تہذیبی اہمیت، کھوئے ہوؤں کی جستجو، ۱۹۴۷ء کے بعد جوجھنے کا جذبہ رکھنے والی ہندوستانی مسلم قوم کی جدوجہد، انسانی درد کی انسانیت وغیرہ کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔"

یہ دعویٰ تجزیے کا طالب ہے، لیکن حسین الحق کی تخلیقات میں فرد کا رشتہ اجتماعی زندگی سے برقرار رہتا ہے۔ وہ معاشرے کے اچھے برے حالات اور واقعات سے نا صرف نبرد آزما ہوتا ہے بلکہ غیر یقینی حالات سے دو چار ہو کر نئی سمت اور منزل کی تلاش کرنے لگتا ہے۔ وہاب اشرفی نے حسین الحق کو Writer of Protest کہا ہے، یعنی احتجاجی ادیب گردانا ہے۔ مجھے حسین الحق پہ چسپاں کئے گئے اس لیبل سے کچھ اختلاف ہے کیونکہ اس طرح ان کے افسانے صرف مزاحمتی یا احتجاجی ادب کے دائرے میں سمٹ جائیں گے۔ حسین الحق نے مختلف اور متضاد موضوعات کو یکجا کر الفاظ اور جملوں کا جامہ پہنایا ہے اور قاری کو غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ ان کے افسانوں کی قرأت کے بعد قاری کسی نقطے پر لبیک کہہ کر برسر پیکار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے بلکہ غور وفکر کے عمل سے گزرتا ہے۔

حسین الحق نے جب باضابطہ طور پر افسانہ نگاری شروع کی اس وقت جدیدیت کے نام پہ نئے تجربات کا بول بالا تھا۔ استعارہ، تمثیل، علامت، ابہام، لایعنیت، اقدار سے گریز جدید افسانوں کے لازمی جزو تھے۔ انھوں نے بھی اس صورت حال میں یہی رویہ اپنایا۔ اس دور کے ان کے افسانوں کو بغیر ذہنی جمناسٹک کے سمجھنا قاری کے لئے ایک مشکل امر رہا۔ جلد ہی انھوں نے اس پر تصنع اسلوب، جس پہ دانستہ کاریگری کا شبہ ہوتا ہے سے نجات حاصل کر لی۔ وہ زندگی کی آلائشوں، الجھنوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ فرد کے خواب، آرزوؤں، گھٹن، پسپائی، نامرادی وغیرہ کی عکاسی اپنے افسانوں میں کرنے لگے۔ داخلیت سے خارجیت کی شناسائی متاثر کن رہی۔ ان کی ابتدائی کہانیاں (۱) پس پردہ شب (۲) صحرا کا سورج (۳) وقنا عذاب النار (۴) امرلتا میں فرد کی تنہائی، زندگی کی بے معنویت، عہد حاضر کی شکستگی، معاشرہ کی شکست و ریخت اور معرکہ حق و باطل کو نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان افسانوں میں ناہمواری کا کچھ احساس ہوتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ جدیدیت کے تقاضے اور انفرادیت کی خواہش کا حسین الحق شکار ہو گئے۔ ان کے افسانوں میں بیان کرنے کے عمل (Narration) کے تقاضے پورے نہیں ہوتے ہیں۔ جدیدیت کے تقاضوں کے زیر اثر جدید افسانوں میں الفاظ کو نئے معنی اور مفہوم دینے کی کوشش کی گئی اور اس عمل میں الفاظ نے اپنی مروج معنی اور شناخت کھو دی۔ حسین الحق کے اس دور کے افسانے موضوع کے

اعتبار سے نہیں بلکہ اسلوب کے اعتبار سے جدید ہیں۔ یہ موضوعات کم وبیش مختلف اوقات اور انداز میں اردو ادب میں پیش ہوتے رہے ہیں لیکن ان موضوعات نے حسین الحق پر مختلف انداز سے اثرات مرتب کیے اس لئے ان کی پیش کش میں ندرت کا احساس ہوتا ہے۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں اردو افسانے نے کروٹ بدلی۔ جدیدیت کا غلغلہ کم ہوا۔ بیانیہ انداز و اسلوب میں کہانی کی واپسی ہوئی۔ ماجرا نگاری اور منظر نگاری میں علامت، استعارہ اور تمثیل کو بے جا طور پہ ٹانکنے کا سلسلہ بتدریج کم ہوا۔ حسین الحق کا اعتراف ہے

''ترقی پسندوں کے سپاٹ بیانیہ اور جدیدیوں کے مبہم علامتی انداز، دونوں سے نئے افسانے نے دامن چھڑا لیا۔ لہٰذا آج کا افسانہ سپاٹ بھی نہیں اور مبہم بھی نہیں۔''

اس احساس کے بعد انھوں نے متعدد قابلِ قدر افسانے تخلیق کیے جن میں دوام حاصل کرنے کی طاقت ہے۔ ایسے افسانوں میں (۱) جب اسماعیل جاگا (۲) گونگا بولنا چاہتا ہے (۳) زخمی پرندہ (۴) بچاؤ بچاؤ (۵) مور پاؤں (٦) نا گہانی (۷) احد (۸) کربلا (۹) سبرا منیم کیوں مرا (۱۰) الحمداللہ (۱۱) نیو کی اینٹ کی نشاندہی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کی جا سکتی ہے۔ اس فہرست میں اضافے کی پوری گنجائش ہے۔ میں نے حسین الحق کے چند شاہکار افسانوں کی صرف نشاندہی کی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے افسانوں کا فکری اور فنّی تجزیہ کیا جائے' کیوں کہ یہ افسانے معاشرتی زندگی، زندگی کی تلخی اور وراثت کی پامالی کے عکاس ہیں۔ ان افسانوں میں زندگی سانس لیتی ہے اور زمانے کو گویائی حاصل ہو جاتی ہے۔ منظر نگاری، جزیات نگاری، ماجرا نگاری اور شفاف بیانیہ ان افسانوں کو دو آتشہ اور سہ آتشہ بنا دیتے ہیں۔

اردو افسانے میں حسین الحق ایک معتبر نام ہیں اور ان کی اہمیت مسلّم ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اردو افسانہ میں دنیا کے کسی زبان وادب کے افسانے سے آنکھ ملانے کا دم خم ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میرا مطالعہ محدود ہے لیکن ان کی یہ رائے نے مجھے بے چین رکھا اور میں اسے شرف قبولیت نہ دے سکا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، کے ایک سیمینار میں جو غالب کالج کالج کے جلسہ گاہ میں منعقد ہوا تھا اور اس کی نظامت شمش اقبال کر رہے تھے موضوع تھا ''اردو افسانے کا ماضی وحال''۔ نام چین افراد بحیثیت شرکا اس سیمینار میں موجود تھے۔ حسین الحق نے اپنی تقریر میں یہ کہا کہ دنیا اب ایک گاؤں بن چکی ہے اور اس کے تمام رنگ، ہلچل، استحصال، خوں ریزی کا موثر اظہار اکیسویں صدی کے اردو افسانوں میں ہوا ہے۔ حسین الحق ایک کامیاب مقرر ہیں اور اپنے خطاب

میں وہ مؤثر انداز میں اپنی بات پیش کر تسلیم کرانے کی حکمت عملی اختیار کرتے ہیں۔ حسین الحق کے خطاب کے بعد تقریر کرنے کی جب میری باری آئی تب میں نے میانہ روی اختیار کرتے ہوئے کہا کہ اردو افسانے میں ہندوستان کی تصویر تو دکھائی پڑتی ہے لیکن دنیا کے شب و روز، نشیب وفراز، حق و باطل کا معرکہ اور تہذیبوں کے تصادم وغیرہ کو اب تک اس میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔ میری تقریر کے دوران حسین الحق کی گردن ایک طرف کج رہی اور آنکھیں مجھ پر مرکوز رہیں۔ میری تقریر کے فوراً بعد وہ یکلخت کھڑے ہو گئے اور اونچی آواز میں بولے کہ وہ میری تمام باتوں کو رد کرتے ہیں۔ صدر کی اجازت سے وہ دوبارہ مائک پر آئے۔ انھوں نے اپنی بات پہ قائم رہتے ہوئے کہا کہ اکیسویں صدی کے اس مشینی دور میں انسان اور انسانیت کو درپیش تمام خطرات کی عکاسی اردو افسانے میں ہوئی ہے۔ میں حسین الحق کی باتوں کو غور سے سنتا رہا مگر میرے اندر کا خوابیدہ پولیس والا بیدار ہو کر ذہن میں لیفٹ رائٹ کرنے لگا۔ حسین الحق کی بات ختم ہوتے ہی میں کھڑا ہو گیا اور ان کی کہی گئی باتوں پہ اپنی رائے دینے کی اجازت چاہی۔ میں نے مجمع بالخصوص حسین الحق کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ فراخدلی ایک صحت مند روایت ہے لیکن ایسی فراخدلی جو حقائق کو مسخ کر دے قابل قبول نہیں ہے۔ میں نے سوال کیا کہ کیا امریکہ کے ٹوئن ٹاور کا حادثہ، روہنگیا مسلمانوں پہ ظلم، ایغور مسلمانوں کا استحصال، افغانستان میں طالبان کا جبر، آئی. ایس. آئی. کی قتل و غارت گری، عراق پر امریکہ کا حملہ، فلسطینیوں پر امریکہ کی جارحانہ کاروائی کیا اہم، روح فرسا اور دل شکن واقعات نہیں ہیں۔ اگر ہیں تو ان اہم واقعات پہ اردو میں کتنے افسانے لکھے گئے۔ اسے کیا اردو افسانہ نگاری کی کم علمی اور کوتاہ نظری قرار دیا جا سکتا ہے۔ میری بات ختم ہوتے ہی حسین الحق اپنی نشست سے اٹھے لیکن ان کے بولنے سے پہلے ہی شمش اقبال نے طعام کے وقفے کا اعلان کر دیا۔ اس نوک جھوک کے بعد کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ہم دونوں کے رشتے شائد استوار نہ رہیں لیکن ہمارا رشتہ حسب سابق خوشگوار رہا۔ حسین الحق میرے لئے حسین بھائی اور میں ان کے لئے معصوم بھائی رہا۔

حسین الحق نے ناول نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ۱۹۸۸ء میں عبدالصمد کو دو گز زمین پہ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملا۔ اس کے بعد اردو ادب میں ناول کی باڑھ آ گئی۔ پیغام آفاقی کا ناول ''مکان'' (۱۹۸۹ء)، غضنفر کا ناول ''پانی'' (۱۹۸۹ء) منظر عام پہ آئے۔ ان ناولوں کے کچھ آگے پیچھے ظفر پیامی کا ناول ''فرار'' قرۃ العین حیدر کا ناول ''گردش رنگ و چمن'' (۱۹۸۸ء) اور صلاح الدین پرویز کا ناول ''آئڈینٹیٹی کارڈ'' (۱۹۸۹ء) کی اشاعت ہوئی۔ حسین الحق کا پہلا ناول ''بولو مت چپ رہو'' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کا قصہ حصول آزادی کے بعد کے عصری

حالات پہ مبنی ہے۔ یہ ایک عبرتناک داستان ہے۔ حصول آزادی کے بعد جنگ آزادی کے مجاہد درکنار کردیئے گئے ۔مفاد پرستوں کو فروغ حاصل ہوا۔وہ افراد جو حصول آزادی کے لئے فعال اور سرگرم تھے درکنار کردئے گئے ۔منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔ جو طبقہ اقتدار میں آیا اس نے سماجی فلاح بہبود کے بجائے اپنے ذاتی مفاد کو مقدم جانا۔بدعنوانیاں شباب پر پہنچ گئیں۔ بےبسی، بے چارگی نے بیزاری کی راہ اختیار کی۔عوام میں اس کا سخت ردعمل ہوا اور مایوسی اور ناکامی کی اس فضا میں تشدد کی راہ ہموار ہوئی۔قانون شکنی نے افراتفری کی صورت اختیار کرلی۔اختیارالزماں جیسے مجاہد آزادی کنارہ کشی اختیار کر خاموشی سے خدمت خلق میں لگ گئے۔انھوں نے بساط بھر حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی لیکن بااثر اور مفاد پرستوں نے ان کے خلاف ایک محاذ قائم کرلیا۔افتخارالزماں خود کو بے بس اور لاچار محسوس کرنے لگے۔حسین الحق نے اس ناول میں ان کے نفسیات کو بخوبی پیش کیا ہے۔مرکزی کردار کے توسط سے بہار کے تعلیمی نظام بالخصوص پرائمری، مڈل اور سکنڈری اسکول میں رائج بدنظمی، تعفن،فرسودگی کو اجاگر کیا گیا ہے۔اس صورتحال میں مرکزی کردار افتخارالزماں کا ایک شاگرد کیلاش مہتو ،جو باغی بن جاتا ہے،انھیں مشورہ دیتا ہے کہ اگر ظلم،ناانصافی،استحصال اور رشوت خوری کو مٹانا ہے تو وہ اس کے ساتھ مل کر خونی سنگھرش کریں۔افتخارالزماں کا اصلاح پسند اور وطن پرست مزاج اس مشورہ پر عمل کرنے پہ تیار نہیں ہوتا ہے۔ان کا ذہن ایک صالح متوازن نظام کا متلاشی ہے۔وہ تمام خوبیوں اور خامیوں سے برسرپیکار ہوتے ہیں لیکن صحیح سمت پہ گامزن نہیں ہو پاتے ہیں اور تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ابتدا میں وہ جس مقام پہ تھے اختتام پہ بھی وہ اسی مقام پہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ان کی بےعملی مسائل کا حل نہیں دیتی ہے اور وہ کوئی لائحہ عمل تیار کرنے اور اس پر گامزن ہونے میں ناکام رہتے ہیں۔

اس ناول کی چرچا ہوئی لیکن حسین الحق اس ناول سے اردو ناول نگاری کا ایک معتبر نام نہ بن سکے۔حسین الحق کا دوسرا ناول 'فرات' ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔اس کا نظر ثانی شدہ اڈیشن ۲۰۱۵ء میں منظر عام پہ آیا۔ایک گفتگو میں فرات کے دوسرے اڈیشن کے بعد حسین الحق نے مجھ سے پر امید لہجے میں کہا تھا کہ اردو دنیا میں ''فرات'' انھیں زندہ رکھے گا۔''فرات'' کی کہانی انسان کی خباثت، بےبسی، بےحسی اور تاریخ کے جبر پہ مرکوز ہے۔اس ناول میں ملک کو درپیش مختلف النوح کے مسائل کو بڑے چابکدستی سے ایک ربط وتسلسل کے ساتھ کہانی میں پرویا گیا ہے۔اس عمل میں اقدار، روایت اور رویہ متصادم ہوتے ہیں لیکن کسی ایک مقام تک نہیں پہنچ پاتے ۔ایک بیزاری، بے چارگی ہر طرف سایہ فگن نظر آتی ہے جو گماں کو حقیقت کی شکل اختیار کرنے نہیں دیتی

ہے۔مرکزی کردار وقاراحمد ایک پروفیسر،ناقد،ادیب اور شاعر ہونے کے باوجود تشنگی اور گومگو حالت کے شکار ہیں۔زندگی سے بیزار ہیں۔انھیں سب کچھ ملا لیکن دل پر دستک دینے والی صفیہ خالہ کی بیٹی نہیں ملی۔وہ ایک نظر میں دل ہار بیٹھے تھے۔لیکن وہ ان کے خوابوں کو حقیقت میں نہ بدل سکی۔یہ ناکامی تاحیات ان کی پژمردگی کا باعث بن گئی۔ستر سال کے بزرگ وقاراحمد اس تیر نیم کش کو یاد کر اپنے پوتے پوتیوں کی موجودگی میں زار و قطار آنسو بہاتے ہیں۔ستر سال کی عمر میں بھی وہ پرسکون اور مطمئن نہیں ہیں۔ساری زندگی ادب،آرٹ، کلچر،فلسفہ پہ غور و فکر کرنے والا اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر پاتا ہے اور بیزار ہو کر زندگی تج دینے کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔زندگی سے اکتاہٹ اسے گھر چھوڑ دینے پہ مجبور کر دیتی ہے۔ذہنی انتشار کے زیر اثر وہ تبلیغ جماعت میں پناہ لیتا ہے۔اس کے بعد وہ کسی دوسری جماعت سے تعلق بحال کرتا ہے اور پھر مدرسی کا دامن تھامتا ہے۔اسے کسی جگہ ذہن و قلب کا سکون نہیں ملتا ہے۔وہ ایک دن سڑک پر کمر مٹکا کر رقص کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔اس کی زبان پہ ہیری میں تو پریم دیوانی کا ورد ہوتا ہے۔

حسین الحق نے فرات میں ایک شخص کے ارمانوں اور حسرتوں کو سماجی جبر کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔وقاراحمد کی شخصیت کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ شعر ان پہ چسپاں کیا جا سکتا ہے۔

کہہ دو ان حسرتوں کو کہیں اور جا بسیں　　اتنی جگہ کہاں ہے دل داغ دار میں

وقاراحمد کی طرح تبریز، فیصل بھی سیماب صفت ہیں ۔یہ متحرک ہیں لیکن متزلزل ہیں۔انھیں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا علم نہیں ہے۔منزل کا تعین کئے بغیر وہ سرگرم عمل رہتے ہیں۔نتیجتاً خش و خاشاک کے انجام تک پہنچ جاتے ہیں۔اس ناول میں فیصل کی بیوی عنبیرہ خودسری و خودنمائی کا شکار ہے۔وہ زندگی کے بارے میں کوئی سنجیدہ رویہ نہیں رکھتی ہے۔فیصل کے اولاد انتظار اور ثمن نئی نسل کے نمائندہ ہیں جنھیں یہ علم نہیں ہے کہ وراثت کیا ہے اور اس کی اہمیت کیا ہے۔ان سب کے علاوہ اس ناول کا ایک اہم کردار شبل ہے جو وقاراحمد کی بیٹی ہے۔تعلیم یافتہ صحافی ہے اور نئے قدروں پر عمل پیرا ہے۔وہ ایک کامیاب و بے باک صحافی ہے۔اسے شادی میں دلچسپی نہیں ہے۔حالات سے بیزار ہے اس لئے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہے۔

''ان کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یہ اپنے حال سے کبھی مطمئن نہیں ہو پاتے۔نتیجتاً ذہنی طور پہ ہمیشہ گویا سفر میں رہتے ہیں اور شاید اسی سبب سے بہترین صلاحیتیں اور بدترین بوکھلاہٹیں انہی طبقات کے افراد میں پائی جاتی ہیں۔مولانا آزاد، اقبال، شبلی، مسٹر

جناح، جگر مرادآبادی اور بالکل آخری دہوں میں سید شہاب الدین ان سب کا تقریباً یہی پرابلم ہے............مولانا آزاد مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے، بعد میں الحاد کی طرف مائل ہوئے اور ایک مرتبہ شراب تک پی، پھر واپس ہوئے مفسر قرآن بن گئے، پھر سیاست میں آئے ناکام ہوئے اور مرتے مرتے اپنی روش تصوف اختیار کر لی اور دو چار کو مرید بھی کر لیا، اقبال رنڈی کے کوٹھے پہ گئے، عطیہ فیضی سے عشق کیا، فلسفیانہ تشکیک سے گزرے، شاعر اسلام ہوئے، تصوف کا مذاق اڑایا اور آخر میں تصوف سے ہار مان لی۔شبلی مذہبی عالم رہے اور عطیہ فیضی کی طرف جھک گئے، اتنے جھکے کہ عطیہ کو ان کے یہاں خباست تک نظر آ گئی، مسٹر جناح کانگریسی تھے، پھر مسلم لیگی ہو گئے، پاکستان بنوایا، مگر ساری زندگی پابند شریعت نہ ہو سکے، جگر مرادآبادی بے تحاشہ شراب پینے والے، ذہنی ٹریک بدلا تو متشرع صوفی بن گئے، شہاب الدین ڈپلومیٹ بنے، وہاں مطمئن نہ ہو سکے تو سیاست داں بن گئے، پھر حزب مخالف میں رہے، پھر برسر اقتدار پارٹی کا حصہ بن گئے اور اب سب کچھ چھوڑ کر ملت اسلامیہ کے درد سے تڑپتے رہتے ہیں۔''

شبل ماضی پرست نہیں ہے لیکن اس کے خاندان کے افراد یادایام کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ہرنا کامی پہ انھیں ماضی یاد آ جاتا ہے کیونکہ ماضی ان کے لئے عظیم اور شاندار ہے۔اس صورتحال کو پیش کرنے کے لئے فلیش بیک ٹیکنیک کا استعمال کیا گیا ہے جس میں تاریخ، تصوف، روایات وغیرہ سب شامل ہیں۔شبل اس صورتحال سے واقف ہے لیکن بے بس۔اسے اپنی زندگی پہ ترس آتا ہے لیکن وہ گیا وقت واپس نہیں آتا ہے سے اتفاق کرتے ہوئے حالات کے سامنے سرخم کر لیتی ہے۔اس کے باپ کی زندگی گومگو الم میں گزری، بھائی اوسط درجے سے طبقۂ خواص میں چھلانگ لگانے کے غلط راستے پہ گامزن ہوئے لیکن پھر بھی ناکام رہے۔ وہ خود انتشار کا شکار ہوتی ہے لیکن زندگی سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اس میں برقرار رہتا ہے۔وہ حالات کے خلاف سینہ سپر ہوتی ہوئی دکھائی پڑتی ہے اور دوسروں کی عزت و ناموس کی حفاظت کرتے ہوئے خود کو قربان کر دیتی ہے۔ناول کا یہ انجام نہایت جذباتی اور سنسنی خیز (Melodramatic) ہے۔ذہن کو اسے قبول کرنے میں کچھ تامل ہوتا ہے لیکن دل کہتا ہے کہ جذباتیت میں ایسے قدم اٹھائے جا سکتے ہیں۔

حسین الحق نے اس ناول میں کئی سوال اٹھائے ہیں لیکن قاری اختتام تک جواب کا منتظر رہتا ہے۔ناول میں جس تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے وہ Acolturation کی دین ہے۔ جب دو تہذیب غیر دانستہ طور پر ایک دوسرے کے ساتھ باہمی عمل (Interact) کرتے ہیں تو ان دونوں کے ملاپ سے کچھ نئے تہذیبی عناصر وجود میں آتے ہیں جو روزانہ زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔اس ناول کے مختلف کردار اس حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں اور عدم مطابقت (Maladjustment) کا شکار ہوتے ہیں۔ گفتگو میں انگریزی الفاظ و جملوں کا کثرت سے استعمال اسی بے آہنگی کی دین ہے۔شموئل احمد نے حسین الحق پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ قرۃ العین حیدر کی طرح اپنی تخلیقات میں انگریزی الفاظ اور جملوں کا استعمال کر خود کو Intellectual ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔شموئل احمد کی اس رائے سے اختلاف کی پوری گنجائش ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ انگریزی الفاظ اور جملوں کا کثرت سے استعمال قرأت کو بوجھل بنا دیتا ہے۔ یہ ناول حسین الحق کے ادبی سفر کا اہم پڑاؤ ہے، لیکن ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہے۔

حسین الحق کا تیسرا ناول ''اماوس میں خواب'' ۲۰۱۷ء میں منظر عام پہ آیا ہے۔اس کا انگریزی ترجمہ سرور حسین نے کے عنوان سے کیا ہے۔جس کی اشاعت ۲۰۲۱ء میں ہوئی ہے۔ناول کی اہمیت میں اضافہ کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اسے ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ناول کا کینوس بڑا ہے اور یہ پورے ہندوستان کا احاطہ کرتا ہے ۔آزادی کے بعد بدلتے نظریات،سیاست کے ترجیحات ،مذہب کی تشریحات ،دانشوری کے انکشافات ،معاشرے کے اختلافات اور تعلیم کے نام پہ خرافات کی مؤثر عکاسی اس ناول میں کی گئی ہے۔رشوت خوری،اقربا پروری،فرقہ پرستی کے علاوہ ذات کے نام پر جو کچھ فرد، سماج اور نظام کا حصہ بن گیا ہے اسے جرأت کے ساتھ حسین الحق نے پیش کیا ہے۔ناول میں ابتدا سے اختتام تک ملک و معاشرہ کے موجودہ منظر نامہ سے قاری آشنا ہوتا ہے۔ مصنف نے حالات حاظرہ کے واقعات ،حادثات اور تنزلی کو نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ وہ اس کے گواہ بھی رہے ہیں۔اس ناول میں کرداروں کی کثرت ہے۔مرکزی کردار اسماعیل، نائلہ ،قیدار کے علاوہ ذیلی کردار منتشر، رجائی ،میاں والا ،بنسی دھر،رمیش، رکمنی ، دلیر سنگھ،انل شرما، مجمدار،ٹوپوا اور شو بھا وغیرہ ناول کے ناگریز حصہ ہیں۔ یہ سب قصہ کو پروان چڑھاتے ہیں اور ان میں سے کچھ اپنا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔دوران مطالعہ اس ناول میں تجسس برقرار رہتا ہے جو ایک ناول کا بنیادی وصف ہے۔ناول کے ابتدائی صفحات میں وہ منظر نامہ پیش کیا گیا ہے جو بیان ہونے والے واقعات و حادثات کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ یہ منظر نامہ طویل ہے لیکن استعاراتی انداز میں جو کچھ پیش

کیا گیا ہے وہ اہم ہے۔

اس ناول کا مرکزی کردار اسماعیل متوسط طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ بمبئی اور بھیونڈی میں اپنا سب کچھ لٹا کر وہ ایک خانقاہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ خانقاہ میں ہجوم ہے۔ مانگنے والے، پانے والے، ملنگ، فقیر، پیر، مرید، سب یہاں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ حسین الحق نے خانقاہ کی بہت مؤثر تصویر کشی کی ہے کیونکہ ان کا تعلق خانقاہ سے ہے۔ خودغرضی اور بے غرضی کے ماحول میں کچھ عرصہ گزار کر اسماعیل اپنے آبائی وطن میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پٹنہ آ کر اپنے ماموں کے یہاں قیام پزیر ہوتا ہے۔ کہانی کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے۔ اسماعیل پے در پے ان عصری مسائل سے دو چار ہوتا ہے جن سے معاشرے کا ہر فرد نبرد آزما ہے۔ اسماعیل حصول تعلیم کے لئے کالج میں داخلہ لیتا ہے اسے پہلی بار احساس ہوتا ہے کہ شکچھا کا مندر کہے جانے والے تعلیمی اداروں میں کیسی اور کتنی بھیانک سیاست ہے۔ مذہب کی سیاست، ذات کی سیاست، علاقہ کی سیاست، زبان کی سیاست، اونچ نیچ کی سیاست کا وہ شعوری اور غیر شعوری حصہ کا شکار ہوتا ہے۔ چھٹیوں میں جب وہ میرن بیگہ آتا ہے تو اسے ہر طرح کے استحصال اور دلتوں پہ ہونے والے ظلم اور نا انصافیوں کا انداز ہوتا ہے۔ ان حالات میں وہ خود کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ اس کے ساتھ اسے ظلم کے خلاف بلند ہونے والی غیر منظم اور کمزور آواز کا بھی احساس ہوتا ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسماعیل کی تقرری پیروی کی بنیاد پہ بحیثیت لیکچرار ایک پرائیویٹ کالج میں ہو جاتی ہے۔ حسین الحق نے پرائیویٹ کالج سے Constituent College بننے کے مراحل اور اس سے وابستہ تمام بدعنوانیوں کی جزئیات کو پوری دیانت داری سے پیش کیا ہے۔ اس بیانیہ میں حسرت و افسوس کے ساتھ طنز و تمسخر بھی شامل ہے۔ سماج دشمن عناصر کی نظام میں فوقیت اور بنیاد پرستی کی سماج میں کارفرمائی کو بڑی جرأت کے ساتھ عریاں کیا گیا ہے۔ اسماعیل اور اس کا خاندان ایسے تمام حالت کا شکار ہوتا ہے اور خود کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ حسین الحق خود نظام تعلیم کا حصہ رہے ہیں اس لیے کالج میں در پردہ رائج خرافات سے پوری طرح واقف، کالج کے اساتذہ کی الیکشن میں ڈیوٹی اور اس سے نجات حاصل کرنے کی تگ و دو کو انھوں نے بڑی اچھی تصویر کشی کی ہے۔ الیکشن کے دوران اسماعیل کی گرفتاری ہوتی ہے۔ ایک پروفیسر ہونے کے باوجود اسے جس ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ عبرت انگیز ہے۔ ناقص نظام تعلیم کے بعد کوچنگ انسٹی چیوٹ کا فروغ، مدرسے کا نظام، چندہ کی اگاہی، ریزرویشن کی مار اور ملک کا سیاسی منظر نامہ بھی اس ناول کا حصہ ہے۔ ملک میں سکہ رائج الوقت کی طرح قابل قبول سیاسی رہنما اٹل بہاری باجپائی، لالو پرشاد، جیوتی باسو، نریندر مودی اور نتیش کی سیاسی سرگرمیوں، موقع

پرستی اور مذہبی جنون کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے ۔اگر اس منظر نامے کو تھوڑی وسعت دی جاتی تو چند اور حقیقت عریاں ہوتی۔

اپنے آپ کو بچانے کی تمام کوششوں کے بعد بھی اسماعیل کی ایک دھماکے میں موت ہو جاتی ہے۔اس موت سے ایک خاندان کے بکھراؤ کی ابتدا ہوتی ہے۔اسماعیل اپنے غیر فطری اور غیر ضروری موت کے ساتھ اپنے اولاد قیدار محمد اور نائلہ کے لئے مسائل کا ایک سلسلہ چھوڑ جاتا ہے۔ناول نگار نے ان دونوں سے دور جدید کے ان لاکھوں کروڑوں افراد کی نمائندگی کرائی ہے جن کی بے بسی اور انتشار کا کوئی حل نہیں ہے۔حالات کو بدلنے کا حوصلہ ان میں نہیں ہے اس لئے وہ سبھی کچھ کو نوشتہ تقدیر سمجھ کر حالات کا شکار ہو جاتے ہیں۔دھماکہ میں اسماعیل کی حادثاتی موت اسے دہشت گرد بنانے کے لئے کافی تھی۔اس کی اولاد قیدار محمد کو دہشت گرد کی اولاد کا طعنہ سننا پڑتا ہے۔اس کے پاس جواب ہے لیکن وہ دل مسوس کر رہ جاتا ہے کیونکہ جواب دینے کی جرأت وہ اپنے آپ میں نہیں پاتا ہے ۔نائلہ مذہب و معاشرہ کی تمام حدود کو پامال کر ایک نئی دنیا سجانے کے لئے گھر سے فرار ہو جاتی ہے۔حسین الحق کے الفاظ میں نائلہ خوابوں کے انگنت جوت جگانے کے لئے گھر سے بھاگ گئی۔رمیش کے ساتھ بمبئی پہنچ کر اسے ایک حال میں رہنے کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے۔وہ رمیش کی بیوی نہیں رکھیل بن جاتی ہے۔حسین الحق نے نائلہ کے حالات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> ''سچ مچ اسے رمیش سے ڈر لگنے لگا تھا۔وہ آیا کھانا کھایا، دیر تک بلو فلم دیکھی ،گندے گانے اسے اور اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔اس نے سکینہ کی طرح اپنا ازار بند کھول دیا۔''

حالات اسے چکلہ کی دہلیز تک پہنچانے کی راہ ہموار کر دیتی ہے۔خود کو بچانے کے عمل میں وہ موت کے آغوش میں پہنچ جاتی ہے۔

ناول کا اختتام غیر یقینی ماحول میں ہوتا ہے۔قیدار احمد امید و یاس کے درمیان معلق کھڑا نظر آتا ہے۔حسین الحق نے اس کی ذہنی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> ''قیدار نے سوچا، میرا باپ جو مالیگاؤں اور بمبئی سے بہار تک مارا مارا پھرا اور بالآخر مارا گیا۔میری بہن جو ہمسفر کی تلاش میں نکلی مگر پتہ نہیں اسے ہمسفر ملا یا وہ بھی حاکم محکوم کے دو دھاری تلوار والی منطق پہ ٹکی مخلوق بن گئی۔یا خود میں جو نگری نگری پھرا مسافر کی ایک

علامت بن چکا ہوں۔ہم سب کیا چاہتے تھے۔کیا پایا ہے۔‘‘

ذہنی تصادم کے اس پس منظر میں روشنی اس کے پاس آتی ہے اور وہ دونوں ندی کے کنارے بیٹھ کر اپنے اپنے خیالوں میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں۔کئی سوال ذہن میں سر اٹھاتے ہیں،لیکن ان سب کا جواب ان کے پاس نہیں ہے۔حسین الحق نے ان گومگو کی کیفیت اور مبہم فضا میں ناول کا اختتام ان الفاظ میں کیا ہے۔

’’دو بدن جل رہے تھے، بھیگ بھی رہے تھے

کہیں سے کوئی فاختہ اپنے ہونٹوں میں زیتون کی ننھی سی شاخ لے کر آئی اور ان پر نچھاور کیا، کسی مور نے اپنے رنگ برنگے پران پر وارے۔کوئی ٹھنڈی ہوا انھیں چھو کر گزری، ترل ترل بہتی ندی نے آگے بڑھتے ہوئے ان کی طرح ذرا پلٹ کر دیکھا اور خوشی میں مست ہو کر دو لہریں ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کرنے لگی اور قیدار نے اپنے دونوں بازو روشنی کے گلے میں حمائل کرتے ہوئے بھاری آواز میں کہا:

’’گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے‘‘

’’جگنوؤں کو جگمگانے دو‘‘، روشنی روتے ہوئے بولی۔دونوں روتے جاتے تھے اور ایک دوسرے کو چومتے جاتے تھے اور ایک دوسرے میں مدغم ہوتے جاتے تھے۔‘‘

اس ناول کا کینوس بڑا ہے اور اس میں ہندوستان کے بڑے خطے، اقوام اور مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔یہ مسائل حل طلب ہے لیکن معاشرہ اور مملکت کے لئے غیر اہم ہیں۔قرأت کے بعد قاری کا ذہن ان کی طرف مرکوز ہوتا ہے اور کچھ لمحے کے لئے وہ احساس جرم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔یہ ناول نگار کے قصہ گوئی کا کمال ہے۔

ناول میں کرداروں کی اکثریت یاسیت کا شکار ہے۔مرکزی کردار اسماعیل کے علاوہ، قیدار، فیضان، نائلہ کے علاوہ انل شرما ہیں جو حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں لیکن ذہنی طور پر خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتے ہیں۔دیگر ضمنی کردار مبشر، رجائی، میاں والا، بنسی دھر، رمیش، رکمنی، دلبیر سنگھ، مجمدار، ٹوپو اور شو بھا وغیرہ روغنی پتلے نظر آتے ہیں۔ناول میں حزن و ملال کی ایک فضا قائم ہے۔اس کا المیہ یہ ہے کہ کوئی کردار سرخرو سرفراز ہوتا نہیں نظر آتا ہے۔معاشرہ میں یوں تصویر پیش کی گئی کہ وہ ایک رخی نظر آتی ہے مسلمان اس میں اپنے آباء واجداد کی حکمت عملی اور جدو جہد کو خیراج پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اس لئے ان کا شمار مظلوم کے زمرے میں شاید بجا نہیں ہے۔مسلمان متحرک اور فعال ہے اس لئے زندہ ہے۔یہ سچ ہے کہ مسلمان بے اعتنائی

اور ناانصافی کا شکار ہے لیکن شکست خوردہ نہیں ہے۔ اس نے ہمت نہیں ہاری ہے۔ معاشرہ میں کثافت ضرور پھیلی ہے لیکن اتنی نہیں کہ قہقہے ناپید ہوجائیں۔ ناول میں امید کی کرن نظر نہیں آتی ہے۔ صرف اختتام پہ اچھے دن کی تمنا کی خواہش سے قاری دوچار ہوتا ہے۔ رابندرناتھ ٹیگور نے کہا تھا کہ خدا آج بھی انسان کی تخلیق اس امید پہ کر رہا ہے کہ وہ انسان اور انسانیت سے اب تک مایوس نہیں ہوا ہے۔ ناول میں کرداروں پہ مسائل کو فوقیت دی گئی ہے۔ مسائل کی پیش کش میں صداقت ہے لیکن حسین الحق نے خود کو نشتر زنی سے باز نہیں رکھا ہے۔ ناول کو ایک پاکٹ تھیٹر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں ماضی، حال، تصوف، صداقت، تاریخ، تہذیب، مفاہمت، معرکہ، مسئلہ، حل وغیرہ پیش کرنے کی گنجائش ہے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ ان میں ربط اور تعلق ہو اور یہ قصہ کو پروان چڑھاتے ہوئے ناول کا حصہ بن جائیں۔

اس ناول کے ہر صفحے پر حسین الحق اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں کیونکہ جو کچھ انھوں نے پیش کیا ہے وہ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ ہے۔ جو نتیجہ انھوں نے اخذ کیا ہے وہ تلخ ہے لیکن حقیقت پہ مبنی ہے۔ شموئل احمد نے اپنے ایک مضمون میں اس خلاف کا اظہار کیا تھا کہ حسین الحق اپنی کہانیوں میں گھر کی دہلیز سے باہر نہیں نکلتے ہیں۔ اس ناول میں معاملہ برعکس ہے۔ اس کے تمام کرداروں کو گھر کی عافیت اور سکون کم نصیب ہوتا ہے۔ اس تگ و دو میں یہ کردار درون خانہ سے زیادہ بیرون خانہ میں برسر پیکار نظر آتے ہیں۔

ایک مصنف خود پوشی کا کتنا ہی اہتمام کرلے، اپنی تحریر، اپنا اسلوب اور موضوع کے انتخاب میں وہ اپنی جھلک دکھانے پہ مجبور ہوجاتا ہے۔ یہ صورتحال اس وقت اور زیادہ پیدا ہوتی ہے جب مصنف معاشرہ مملکت پر خامہ فرسائی کرتا ہے۔ اس مقام پر خلوت ذات کا حجاب اٹھ جاتا ہے۔ ''اماوس میں خواب'' موضوع کے علاوہ اپنے بیانیہ کے لئے بھی قابل توجہ ہے۔ اس ناول کا شعری بیانیہ متاثر کن ہے، لیکن یہ شعری بیانیہ کرشن چندر کا شعری بیانیہ ہے۔ کرشن چندر کے شعری اسلوب میں موضوع پس پردہ چلا جایا کرتا تھا۔ ایک نشست میں راجندر سنگھ بیدی سے کسی نے کہا کہ کرشن چندر اپنی کہانیوں میں نثر میں شاعری کرتا ہے۔ ان کی بات سن کر راجندر سنگھ بیدی نے کہا کہ میرا یار نثر میں شاعری ہی کرتا رہے گا یا کبھی کہانی بھی لکھے گا۔ اس ناول میں حسین الحق کا اسلوب ہر باب میں یکساں نہیں ہے، لیکن قاری کسی مقام پہ ابہام یا ترسیل کی ناکامی کا شکار نہیں ہوتا ہے۔ تلخ اور سفاک حقیقتوں کو بیان کرنے اور معنی و مفہوم کے ترسیل میں حسین الحق کا سادہ، سلیس، رواں دواں اسلوب ایک طرح سے سونے پہ سہاگہ کی کارفرمائی ہے۔ اس ناول میں عشق ہے جنس نہیں۔ عشق جو لازوال ہے۔ عشق جسے ابدیت حاصل ہے کو اس

ناول میں عبادت کی طرح پیش کیا گیا ہے۔ حسین الحق کی نگاہ میں عشق پناہ نہیں تکمیل ہے۔ ناکام ونامراد ہونے کے باوجود عشق زندگی کو سرور بخشتا ہے۔

حسین الحق کے ذہن میں ماضی زندہ ہے ان کا تعلق خانقاہ سے ہے، اس لئے وراثت انھیں عزیز ہے۔ داستان گوئی ان کی سرشت میں ہے۔ وہ اگر ماضی کے اوراق پلٹنے کی زحمت گوارہ کریں تو وہ ''آگ کا دریا'' (قرۃ العین حیدر)، ''سنگم'' (خواجہ حسن فاروقی)، ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' (شمس الرحمٰن فاروقی) جیسے پایہ کے تصنیفات تخلیق کر سکتے ہیں۔

حسین الحق کا ادبی سفر ابھی جاری ہے۔ بیماری نے انھیں ایک مقام پر پڑاؤ ڈالنے پر مجبور کیا ہے، لیکن یہ پڑاؤ عارضی ہے، آزمائش کی اس گھڑی میں انھوں نے جس حوصلہ، ہمت، یقین کا مظاہرہ کیا ہے وہ عزم حسین کو تازہ کرتا ہے۔ حسین اور حق لازم وملزوم ہیں۔ اسی مناسبت سے حسین الحق کی تخلیقات میں حق وصداقت کی تلاش حق ہر اعتبار سے حق بجانب ہے۔ صداقت جو پس پردہ ہے، صداقت جو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ صداقت جسے جاننا آنے والی نسل کے لئے ضروری ہے۔ یہ ایک مشکل امر ہے لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ حسین الحق سہل راہوں کے مسافر نہیں ہیں۔

آخر وقت میں کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور بالآخر زندگی کی جنگ ہار گئے اور ۲۳/ دسمبر ۲۰۲۱ء بروز جمعرات صبح ۷/ بجے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

حسین الحق کے افسانوی سفر کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر سیّد احمد قادری

موبائل : 9934839110

حسین الحق کا نام افسانوی ادب میں کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل رہا ہے۔ ستّر کی دہائی میں بہار کے افسانہ نگاروں کی ایک تثلیث شوکت حیات، حسین الحق اور شفق پر مشتمل تھی، جو بڑی مشہور، متحرک اور فعال تھی۔ ستّر کی دہائی کے افسانہ نگاروں کے تزکرہ میں اس تثلیث کا ذکر ناگزیر ہوا کرتا تھا۔ افسوس کہ ان تینوں نے اپنا افسانوی سفر ادھورا چھوڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئے اور شہر افسانہ نگاری کو ویران کر گئے۔

حسین الحق کے افسانوی سفر کی ابتداُ دہلی سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار ''تیج'' کے 1969ء کے ایک شمارہ میں شائع ہونے والا افسانہ ''جیسے کو تیسا'' سے ہوتی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ترقی پسند افسانے اپنے عروج پر پہنچ کر دم توڑ رہے تھے اور جدیدیت کے طلسم نے اردو ادب پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔ داخلیت اور خارجیت کے مباحث جاری تھے۔ شکست ذات اور داخلیت کو مسترد کرتے ہوئے خارجیت پر زور دیا جا رہا تھا۔ اس ردّ و قبول کی کشمش میں جدیدیت نے علامتوں، استعاروں، تشبیہات اور شعور کی رو وغیرہ کی ایسی فضا تیار کر دی تھی کہ جو افسانہ جتنا افہام و تفہیم سے دور یعنی مبہم ہوا اتنا ہی جدیدیوں کی نگاہ میں کامیاب قرار دیا جا رہا تھا۔ اینٹی اسٹوری، اینٹی پلاٹ، اینٹی ہیرو، سرلیزم اور شعور کی رو میں ڈوب کر لکھے گئے افسانوں کو جدیدیت کی حمایت میں شائع ہونے والے رسالوں کے مدیران اور راتوں رات نقاد کی پدوی کے خواہش مندوں نے خوب خوب بانس پر چڑھانے کی کوششیں کیں۔ اردو افسانوں میں تجربے کے نام پر سماجی اور معاشرتی مسائل سے رشتہ منقطع کرنا سود مند تصور کیا گیا۔ جس کے باعث بقول محمد حسن ایسے ''کھوپڑی چٹخا دینے والے'' افسانوں سے قاری کا رشتہ ٹوٹتا چلا گیا اور ایک ایسا وقت آیا جب اردو افسانے کی موت کا اعلان کر دیا گیا تھا۔

یہ وہی زمانہ تھا جب حسین الحق پٹنہ یونیورسٹی میں ایم اے کے طالب علم تھے اور اپنے دور کے مشہور اسلامی نظریہ کے حامی نقاد پروفیسر عبدالمغنی کی صدارت میں منعقد ہونے والے انجمن ترقی اردو، بہار کے ادارہ حلقۂ ادب کی ایک ادبی نشست میں اپنا ایک افسانہ ''ماحصل'' سنا رہے تھے۔ اس افسانہ میں جنسی تلذذ کی آمیزش کچھ زیادہ ہی تھی۔ پروفیسر عبدالمغنی اس افسانہ کو کچھ دیر تک ہی برداشت کر پائے اور جب ناقابل برداشت ہو گیا تب

انھوں نے اپنے صدارتی حق کا استعمال کرتے ہوئے حسین الحق کو فوراً اس افسانہ کو بند کر بیٹھ جانے کو کہا۔ اس وقت پروفیسر عبدالمغنی کے لحاظ میں کوئی کچھ نہیں بولا۔ لیکن اس نشست کی روداد اخبارات میں شائع ہوئی، جس میں اس واقعہ کا بھی ذکر تھا۔ حلقۂ ادب کے اس واقعہ کا ادبی حلقے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اس کی بازگشت مشہور افسانہ نگار اور ہفتہ وار اخبار ''مورچہ'' کے مدیر کلام حدری صاحب تک پہنچی۔ اس زمانے میں پروفیسر عبدالمغنی اور کلام حیدری صاحب میں نظریاتی اختلاف اور شخصی اختلاف کی خلیج قائم تھی۔ کلام حیدری صاحب نے اس واقعہ میں حسین الحق کی حمایت کرتے ہوئے حلقۂ ادب کی رپورٹ شائع کردی۔ اس رپورٹ کا شائع ہونا تھا کہ دو گروپ بن گیا اور خوب خوب مراسلہ بازہ ہوئی۔ اس معرکہ سے حسین الحق کو یہ فائدہ ہوا کہ وہ ادبی دنیا میں متعارف ہو گئے ، دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اس زمانے میں کلام حیدری صاحب جدیدیت کے علمبرداروں میں تھے اور وہ اپنے ادبی رسالہ ''آہنگ'' میں نئے فنکاروں پر ''میں کا تعارف'' کے ساتھ خصوصی گوشہ نکال کر رہے تھے۔ چنانچہ حسین الحق کے ہم عصر افسانہ نگار علی امام، انور خان اور شوکت حیات کے بعد ان کا بھی نمبر آ گیا اور 1972ء کے شمارہ نمبر 26-25 میں حسین الحق کے یکمشت چھ افسانوں بند مٹھی کا نوحہ، اندھی دشاوں کے سائے ، کھلے ہونٹوں کی چاپ، میری تمہاری کہانی، بلبلہ، اور شکسیدہ کے ساتھ ''میں کا تعارف'' شائع ہوا۔ اس تعارف سے حسین الحق کو یقینی طور پر بڑا فائدہ ہوا کہ وہ' دور دور تک پھیلے' آہنگ' کے قارئین اور ناقدین کے درمیان متعارف ہو گئے۔ ان کے افسانے پر باتیں ہونے لگیں۔ کسی نے ان کے افسانوں کو مسترد کیا تو کسی نے تعریف کر خود کے' ذہین' ہونے کا ثبوت دیا۔ اس طرح حسین الحق کا افسانوی سفر ایک خاص سمت میں بڑھنے لگا۔ ایک اندازے کے مطابق حسین الحق نے تقریباً دو سو افسانے لکھے۔ لیکن انھوں نے اپنے پسندیدہ افسانوں میں مندرجہ بالا افسانوں کو اس فہرست میں شامل نہیں کیا ہے۔ اس لئے کہ میرے خیال میں حسین الحق بھی اس بات کو بخوبی سمجھ رہے تھے کہ یہ افسانے تجریدیت اور فیشن زدگی اور بقول گوپی چند نارنگ علامتیت اور لغویت (افسانوں) کے تحت لکھے گئے تھے، ایسے افسانوں کے خلاف آواز اٹھائی گئی۔ ایسے افسانوں کا افسانوی ادب میں ضمناً کہیں کوئی ذکر مل کیا سکتا ہے۔ لیکن انھیں کوئی مقام نہیں مل سکتا ہے۔ وقت نے یہ ثابت بھی کر دیا کہ تجریدیت کے نام پر افسانوں کو مبہم اور معمّہ بنا کر وہ قاری کے دل و دماغ میں جگہ نہیں بنا سکتے ہیں۔ قاری یقینی طور پر بہت ذہین ہوتا ہے، اس نے کسی بھی حال میں اور کسی بھی تجربہ کے نام پر بے تکے علامتی، تمثیلی، استعاراتی اور تجریدیت کے نام پر لکھے گئے افسانوں سے افسانیت ختم کرنے کی تحریک کو پسند نہیں کیا، گرچہ ایسے افسانوں کی ہمنوائی میں خود افسانہ نگاروں اور بعض ناقدوں نے طرح طرح کی تعویلیں پیش

کیں، لیکن انھیں بھی قارئین نے مسترد کردیا۔ اس لئے 1980ء کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ کسی بھی افسانہ میں افسانویت، ماجرا، پلاٹ اور متحرک کردار کے بغیر کوئی افسانہ، افسانہ نہیں ہوسکتا ہے۔ یہ سب ایک افسانہ کے لئے جز ولاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔

چنانچہ حسین الحق نے بھی اردو افسانے کی بدلتی فضا میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو بروے کار لاتے ہوئے پس پردہ شب، وقتا عذاب النار، امرلتا۔ صحرا کا سورج، گھنے جنگلوں مین، مطلع، نیوکی اینٹ، سبحان اللہ، وغیرہ جیسے افسانوں میں بامعنی اور حیات وکائنات کے رنگ و بوکو بڑے خوبصورت اور معیاری انداز میں پیش کئے۔ اپنے اس بدلتے رویہ کا اعتراف حسین الحق نے اس انداز میں کیا ہے.....

''۷۰ سے ۸۸ یعنی ۱۸ سال کے اس وقفے میں اردو افسانے نے یہ ثابت کردیا کہ وہ یک رجائی (یعنی ترقی پسند) ہے اور نہ ہی مطلق قنوطی (یعنی غیر ترقی پسند) بلکہ گزشتہ دو دہائیوں میں سامنے آنے والے اردو افسانے نے معاصر زندگی کی حقیقی زندگی اور فنکارانہ پیش کش کی ہے۔ نتیجتاً حقیقت نگاری کے آثار نمایاں ہیں۔''

(بہار میں تخلیقی نثر، ڈاکٹر قیام نیّر، صفحہ:238.239)

افسانوی ادب کے اس منظرنامے کے بعد حسین الحق کے افسانوں میں جو تغیرات، تفکرات اور تحریکات کی کارفرمائیاں ملتی ہیں، ان کے جائزہ کے لئے حسین الحق کے شائع ہونے والے سات افسانوی مجموعے (۱) کرب ذات (۱۹۷۲ء) (۲) پس پردۂ شب (۱۹۸۰ء) (۳) صورتِ حال (۱۹۸۲ء) (۴) گھنے جنگلوں میں (۱۹۸۹ء) (۵) مطلع (۱۹۹۶ء) (۶) سوئی کی نوک پر رکا لمحہ (۲۰۰۲ء) اور (۷) نیوکی اینٹ (۲۰۱۰ء) پر ایک عمومی نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حسین الحق کو ایک مخصوص ٹائپ کا افسانہ نگار نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کے یہاں مختلف ڈائمنشن ہیں۔ حسین الحق کے افسانے تجرباتی دور سے گزرنے کے بعد جہاں کئی علامتی اور استعاراتی افسانے ملتے ہیں وہیں ''عکس عکس'' جیسا افسانہ خوبصورت عصری رومانی افسانوں کی موجودگی کا احساس بھی کراتے ہیں اور یہی نہیں ''قصہ سریز'' کے افسانے عزیز احمد کے بعد اردو میں دوسری مرتبہ اور باضابطہ شعوری طور پر سریلزم کی روایت کو زندہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے افسانوں کے ضمن میں حسین الحق کا کہنا ہے کہ.....

> ''میں ان کے کہانی ہونے یا نہ ہونے پر قطعئی بضد نہیں ہوں، میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب موسیٰ کے دس خوابوں کی اور اولیاء انبیاء کے خوابوں کی اہمیت ہے تو پھر فنکار کے خواب کیسے غیر اہم کہے جاسکتے ہیں۔ لہذا، میں جو خواب دیکھتا ہوں اسے من وعن بغیر کسی

بیرونی آمیزش کے ایمانداری کے ساتھ صفحہ قطاس پر بکھیر دیتا ہوں، اب اگر یہ خواب کہانی بنتے ہیں تو بھی ٹھیک نہیں بنتے ہیں تو بھی کوئی بات نہیں. میں مطمئن ہوں کہ میرے لاشعور کا (تخلیقی) احساس اپنے اظہار کی تکمیلیت سے آشنا ہوگیا۔''

(میں اور میری کہانیاں: حسین الحق)

حقیقت یہ ہے کہ حسین الحق کے افسانے اظہار کی مختلف النوع جہتوں سے آشناء ہیں۔ جن میں سے چند میرے خیال کچھ اس طرح ہیں۔علامتی افسانے'' آندھی دشاؤں کے سائے''(شب خون) ''صحرا کا سورج''(شب خون) ''امرلتا''(شب خون) ''خار پشت'' ''بلکہ''(آہنگ) ''بند مٹھی کا نوحہ''(شب خون) ''جال''(کتاب) ''خوف تماشا'' (آہنگ) ''اتم کتھا'' (الفاظ) ''لخت جگر''(شب خون) ''ایک کہانی''(آہنگ) ''زاویے نقطے اور لکیریں''(مورچہ) ''کرب ذات''(مورچہ) کے بعد استعاراتی افسانوں میں''منظر کچھ یوں ہے'' (نشانات) ''سوانح حیات''(عصری ادب) ''بارش میں گھرا ہوا مکان'' (شب خون)''پس پردہ شب''(شب خون) ''چہرہ پس چہر منزل (صبح نو) ''مصلوب لمحے''(صبح نو)''شکستیدہ''(کتاب)''شاید''(آہنگ)''منادی''(کتاب)''ایک کہانی پرویز کے لئے'' (کتاب) ''مردہ آنکھوں کا زہر''(مورچہ) ''سنگھار ہار کے پھول'' (آواز)۔سرالسلسلک افسانے، پہلا قصہ (آہنگ) دوسرا قصہ (آہنگ) تیسرا قصہ (صبح نو) چوتھا قصہ (الفاظ) پانچواں قصہ (جواز)۔رومانی افسانے''میری تمہاری کہانی''(شب خون) عکس عکس (شاعر) ابھرتی ڈوبتی چاپ (آواز) کھلی مٹھی کا نوحہ (آواز)۔عام سے افسانے'روح کی موت''(مریخ) ''درندہ'' (شب رنگ) ''ماحصل'' (مورچہ) ''طلسم مہر'' (صبح نو) ''یادوں کے کھنڈر'' (مورچہ) ''کفن احساس کا''(سہیل) وغیرہ جورد و قبول سے گزرتے ہوئے افسانوی ادب شامل ہوئیں ۔لیکن اظہار کی ان مختلف اور نوع بہ نوع کیفیتوں کے باوجود حسین الحق کی سب سے بڑی خصوصیت میرے خیال میں وہی ہے۔جس کی جانب ڈاکٹر سید محمد عقیل نے اشارہ کرتے

ہوئے لکھا تھا کہ....''حسین الحق ان کہانی کاروں میں ہیں جو کہانی کو دوبارہ کہانی کی طرف واپس لا رہے ہیں۔''

(بیس نئی کہانیاں۔مرتب۔علی احمد فاطمی)

ڈاکٹر سید محمد عقیل نے آدھی ادھوری بات کی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اپنے ابتدائی دور میں حسین الحق بھی تجریدیت کی فیشن زدگی کے شکار ہوئے،جن کا میں نے مندرجہ بالا سطور میں ذکر کیا ہے۔ساتھ ہی ساتھ میں نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ افسانے کی واپسی میں حسین الحق اوران کے کئی ہمعصر افسانہ نگاروں کی کوششوں سے انکارنہیں کیا جاسکتا ہے۔ایسی کوشش کا ایک بڑا فائدہ یہ دیکھنے کوملا کہ اردو افسانوں میں کئی طرح کے فنی تجربات بھی شامل ہو گئے۔ان تجربات سے اردو افسانے کے کینوس اور ڈائمنشن میں اضافہ ہوا۔

موضوع،ہئیت اور اسلوب کے لحاظ سے حسین الحق کا افسانہ''اندھی دشاؤں کے سائے'' عہد حاظر کے تناظر میں خوف کے وسیع بے نام اورزیریں لہروں سے آشنا کرنے کی ایک کوشش ہے۔''صحرا کا سورج'' فرد کو اس کی اپنی داخلی خامیوں سے روشناس کراتا ہے۔''خار پشت'' میں پراگندہ، بدہئیت اور اجتماعی طور پر کرپٹ معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے۔''بلبلہ'' درون ذات کی کشمکش کا آئینہ دار ہے''بند مٹھی کا نوحہ'' Displacement کا افسانہ ہے۔ جہاں کوئی شئے نہ تو اپنی اصلی ہیئت میں برقرار ہے اور نہ اپنے مقام پر۔''حال'' وقت کی سفاکیوں کا اعلانیہ ہے''آتم کتھا'' ایمرجنسی کے پس منظر لکھا گیا،ایک عمدہ افسانہ ہے اوراس افسانہ کا''میں'' برصغیر ایشیاء کا وہ اینٹی ہیرو ہے جو وِش پی کرشنکر کا ہم پلّہ ہونے کے بجائے سرکٹا کر بے سر کی فوج کا ایک حصہ بننے کو زیادہ پسند کرتا ہے۔''لخت لخت'' میں عہد حاضر کی دو بڑی تہذیبوں کے زوال کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔''ایک کہانی'' میں زندگی کی کراہیتوں اورصعوبتوں کے بہ نسبت موت کو زیادہ پسند کیا گیا ہے۔اس کہانی کا Sucidial Approach ایسے موضوعاتی طور پر کامیوں کی کہانی Out Siders کے قریب لا کھڑا کرتا ہے۔''منظر کچھ یوں ہے'' میں صرف فلیش بیک کی تکنیک کے سہارے ایمرجنسی کے دورسیاہ کی تصویر الفاظ کے ذریعہ پیش کی گئی ہے۔''قافلے غباروں کے'' انسانی کوششوں کی ناکامی اورمحرومی دکھاتا ہے۔''بارش میں گھرا ہوا مکان'' آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمان کی تین نسل کی ذہنی کیفیت پیش کرتا ہے اور''چہرہ پس چہرہ'' جہاں ایک طرف کمزور طبقے کی حمایت میں لکھا گیا افسانہ ہے۔وہیں دوسری طرف دورحاضر کے فرد کے اس خودغرضانہ رویئے کو پیش کرتا ہے جو اپنے حق کیلئے لڑتے ہوئے فیصل کو اس کے باپ کے ذریعہ صرف اس لئے کمرے میں بند کردیتی

ہے کہ اس کا بیٹا دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ کیوں اڑائے۔ یوں تو بابری مسجد کے انہدام پر بہت سارے افسانے لکھے گئے۔ لیکن حسین الحق نے ''نیو کی اینٹ'' لکھ کر افسانوی ادب میں ایک انقلاب لا دیا ہے۔ بابری مسجد سانحہ کو جس انداز فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے وہ نہ صرف مختلف اور منفرد ہے بلکہ افسانوی ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

حسین الحق کے ان افسانوں کے علاوہ وہ افسانے جو علامتی، استعاراتی، سریلسٹک، رومانی یا بیانیہ ہیں۔ ان میں بھی حسین الحق موضوع اور اسلوب دونوں لحاظ سے اپنی انفرادیت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حسین الحق نے جہاں روایت سے بغاوت کی ہے وہیں جدید اور عصری تقاضوں کو بھی اپنے افسانوں میں فنکارانہ طور پر پیش کیا ہے۔ حسین الحق کے یہاں انفرادیت بھی ہے مگر وہ اپنے مخصوص ادبی ماحول اور اقدار سے پوری طرح واقف ہیں، ان کے افسانے خلاء میں معلق نہیں ہیں اور خارجی سے زیادہ داخلی حقیقت نگاری کی حمایت کرنے کے باوجود وہ سرزمین افسانہ پر مضبوطی کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں جس مٹی سے ان کا خمیر اُٹھا ہے۔ اس مٹی کی مہک رنگ اور چاپ ان کے افسانوں میں سنائی دیتی ہے اور محسوس ہوتی ہے۔ عصری حسیت کو فلسفیانہ طور پر رد کرنے کے باوجود ''خار پشت''، ''اتم کتھا''، ''لخت لخت'' منظر کچھ یوں ہے ''قافلے غباروں کے'' بارش میں گھرا ہوا مکان ''پس پردہ شب''، ''چہرہ پس چہرہ''، ''شاید''، ''شکیدہ''، ''منادی'' ''مردہ''، ''آنکھوں کا زہر''، ''ناگہانی''، ''سبحان اللہ''، ''مور پاؤں'' اور ''نیو کی اینٹ'' ایسے افسانے ہیں جن میں عصری حسیت اور فکر و آگہی کا احساس نمایاں ہیں۔ حسین الحق نے اپنے مختلف نوع کے افسانوں سے جس طرح افسانوی ادب کو گرانقدر بنایا ہے، انھیں افسانوی ادب میں ہمیشہ یاد رکھا جانا چاہئے۔

اقلیتی ڈسکورس کا نمائندہ ناول ''اماوس میں خواب''

پروفیسر اسلم جمشید پوری

موبائل : 8279907070

حسین الحق کا شمار ۱۹۶۰ کے بعد سامنے آنے والی فکشن نگاروں کی نسل میں ہوتا ہے۔ آپ نے جو زمانہ پایا اس میں ایک طرف ترقی پسند تحریک زوال پذیر ہو رہی تھی ۔ جدیدیت کا عروج بھی سامنے دیکھا۔ مابعد جدیدیت کو انگڑائی لیتے ہوئے پایا۔ اور نئی صدی میں فکشن کا نیا انداز بھی آپ نے دیکھا۔

حسین الحق نے فکشن نگاروں کی بھیڑ میں اپنی الگ شناخت قائم کی ۔ ان کی اس شناخت میں ان کا اسلوب، نت نئے موضوعات، معاصر مسائل، تصوف کی گتھیاں اور اپنے خاص انداز کی وجہ سے اپنے معاصرین میں ایک الگ مقام بنانے میں کامیاب ہوئے ۔ آپ نے اردو کو کئی افسانوی مجموعے 'پسِ پردۂ شب، صورت حال، گھنے جنگلوں میں، مطلع، سوئی کی نوک پر رکا لمحہ، نیو کی اینٹ اور کئی ناول 'بولو مت چپ رہو، فرات، اماوس میں خواب دیے ہیں ۔ آپ کے افسانوں اور ناولوں میں جہاں اچھا اسلوب ملتا ہے وہیں کچھ علامت نگاری اور کچھ جدیدت کے اثرات تجربے کے طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

حسین الحق معیار کے معاملے میں اردو فکشن کی آبرو مانے جاتے ہیں ۔ بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ اور ان کے ساتھی شفق، انور خان، شوکت حیات، عبدالصمد، ساجد رشید، انجم عثمانی، حمید سہروردی، ابن کنول، سید محمد اشرف، نگار عظیم، شموئل احمد، علی امام نقوی، نورالحسنین، بشیر مالیر کوٹلوی، طارق چھتاری، وغیرہ نے جدیدیت کے زوال کے بعد افسانے اور ناول کو زمین سے جوڑنے کا کام کیا ۔ بلکہ بیانیہ کی واپسی کرداروں کا لوٹنا، زمینی مسائل کی عکاسی، اور اپنے آس پاس کو پیش کرنا بھی ان کا اور ان کی نسل کے فکشن نگاروں کا ہی کمال ہے۔ حسین الحق ہمارے ان فکشن نگاروں کی صف اول میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے ترقی پسندی، جدیدت اور مابعد جدیدیت سے اچھے اوصاف لے کر اردو افسانے اور ناول کو نئے ماحول میں، نئی طرز سے لکھنا شروع کیا۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ حسین الحق کے بہت سے افسانے اور ناولوں میں اقلیتی ڈسکورس بدرجہ اتم پایا جاتا ہے ۔ دراصل بابری مسجد کے انہدام کے واقعے نے ہمارے فکشن نگاروں کو بہت متاثر کیا۔ حسین الحق نے اپنی تحریروں میں اقلیتوں پر ہونے والی مظالم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اور ایسے ماحول کو خواہ وہ بہار کا ہو، ممبئی کا ہو، یا اتر پردیش کے مختلف شہروں کا

۔یا پھر بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کے خلاف ہونے والی سازش اور عمل کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنی تحریروں میں اس کا اظہار بھی کیا۔

حسین الحق کا ناول 'اماوس میں خواب' اردو ناول کی روایت میں اقلیتی ڈسکورس کے سبب الگ مقام رکھتا ہے۔ یہ ناول اس وقت منظر عام پر آیا جب پورے ہندوستان میں اقتدار کی تبدیلی آ چکی تھی اور زعفرانی رنگ کے پھریرے لہلا رہے تھے۔

ناول ''اماوس میں خواب'' میں مرکزی کردار میں اسمٰعیل، ان کی بیوی شہسوار، اسماعیل کے دو دوست مبشر رجائی، انل شرما، انل شرما کے دوست شوبھا، فیضان، فیضان کا دوست نولیش، نولیش کی بہن رما، اسماعیل کے بچے قیدار اور نائلہ اہم کردار کے روپ میں ناول میں اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ قیدار کے ساتھ پڑھنے والی جے این یو کی طالبہ روشنی اور نائلہ کو بھگا کر بمبئی لے جانے والا نوجوان رمیش بھی ناول میں اہم کردار کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔

یوں تو پورا ناول اسمٰعیل کے ارد گرد گھومتا ہے جسے بچپن سے ہی خواب دیکھنے کی عادت ہے۔ وہ خواب میں ایسی باتیں اور ایسی چیزیں دیکھتا ہے جس سے خواب ٹوٹنے پر وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ پورا ناول اقلیتوں پر اکثریت کے ذریعہ ڈھائے گئے مظالم کا بیان ہے۔ اسمٰعیل مرچنٹ جو کہ بھیونڈی (ممبئی) میں پاور لوم میں کام کرتا ہے اور فساد ہو جانے پر وہ کسی طرح سے بہار آ جاتا ہے۔ ویسے اس کی تعلیم مدرسے، اسکول اور کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر اورنگ آباد سے لے کر پٹنہ تک میں پوری ہوتی ہے۔ بعد میں بہار میں ہوئے خون خرابے میں اس کی پوری فیملی اس کے والدین، اس کی بہن وغیرہ فساد کی نذر ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی مارا مارا پھرتا ہے۔ لیکن پٹنہ میں اپنے ماموں کے یہاں اسے پناہ ملتی ہے۔ وہیں پٹنہ یونیورسٹی سے وہ ایم اے کی ڈگری حاصل کرتا ہے اور بہار کے کسی کالج میں پروفیسر بن جاتا ہے۔

ناول میں ہندوستان میں ہو رہے ہندو مسلم فسادات یہاں تک کہ بھاگل پور، رانچی، جمشید پور، گجرات اور ممبئی کے خطرناک فسادات کا ذکر بھی ناول میں موجود ہے۔ ناول میں ۱۹۷۱ کی بنگلہ دیش کے قیام کی خوں ریز داستان بھی موجود ہے۔ یوں دیکھا جائے تو آزادی سے پہلے کا منظر نامہ اور آزادی کے بعد کا منظر نامہ بہت عمدگی سے ناول کا حصہ بنتا ہے

ناول میں اسمٰعیل کی پہلی محبت کے طور پر رکمنی سے اس کے تعلقات دکھائے گئے ہیں۔ پھر تمکنت اس

کی زندگی میں آتی ہے۔لیکن دونوں کا ساتھ وقتی ہوتا ہے جو کچھ وقت کے بعد اسمٰعیل کے ذہن سے محو ہو جاتا ہے اور اسمٰعیل اپنی ماموں زاد شہسوار کی محبت میں یوں گرفتار ہوتا ہے کہ دونوں شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔

ناول میں بابری مسجد کے انہدام کا واقعہ، بہار کے بھومی ہار اور ہریجن طبقے کا ٹکراؤ، شاہ بانو کیس کی دھمک، بہار الیکشن کا خوں ریز منظر نامہ، اڈوانی کو لالو پرشاد کے ذریعہ گرفتا کئے جانے کا واقعہ، بابری مسجد کے تالا کھولنے کا عمل، کانگریس کے ذریعہ اقلیتوں پر ڈھائے گئے مظالم، بہار میں نکسل واد کے پھیلتے دائرے اور اس دائرے میں مسلمانوں کی بھی شرکت، بہار میں بڑھتا فرقہ پرستی کا جنون، پورے ملک میں زعفرانی رنگ کی حکومت کا آنا، جے این یو کے انقلابی معاملات، اخلاق کا گوشت کے معاملے میں بھیڑ کے ذریعہ اس کے گھر میں قتل کیا جانا، بمبئی اور یوپی میں بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ رنگ وغیرہ کو جگہ دی گئی ہے۔کالج انتظامیہ کا کالج کے پروفیسر کے سلیکشن میں رول، کالج کے پروفیسروں کا آپس میں لڑنا جھگڑنا، پروفیسرز کے اندر کی گٹ بازی، کوچنگ کلاسیز کا عروج، کلاس میں پڑھائی نہیں ہونے کا معاملہ، تعلیمی نظام کا کرپشن، لالو اور نتیش کی دوستی اور دشمنی، نکسل واد اور بہار کے فرقہ پرست طبقے کا خونی کھیل، یہ سب مل کر ایک ایسا نقشہ تیار کرتے ہیں جس کو حسین الحق نے اماوس میں خواب میں بہتر طور پر استعمال کیا ہے۔

لیکن ناول کا مطالعہ قاری کے ذہن میں بہت سارے سوال پیدا کرتا ہے۔۳۴۷ صفحات پر پھیلے ناول میں تقریباً دوسو ساٹھ صفحے کے بعد اسمٰعیل کی موت واقع ہو جاتی ہے۔اسمٰعیل کی موت ایک سوالیہ نشان ہے۔اسمٰعیل اور فیضان دونوں دوست کی موت پٹنہ اسٹیشن پر اس وقت واقع ہوتی ہے جب وہاں ایک بم کا دھماکہ ہوتا ہے۔اسی دن پٹنہ میں ملک کے وزیر اعظم مودی کی آمد بھی ہوتی ہے۔یہاں یہ سوال بھی کھڑا ہوتا ہے کہ اقلیتوں سے متعلق اتنے سارے موضوعات کو ناول میں شامل کیوں کیا گیا ہے۔کیا ناول صرف بہار کی زندگی پر نہیں ہوسکتا تھا؟اسمٰعیل کی موت کے بعد ناول کا آگے بڑھنا بھی ایک سوال کے روپ میں سامنے آتا ہے۔نائلہ اور قیدار کی زندگی میں ان کے مخالف مذہب کے لوگ آتے ہیں۔پتہ نہیں ناول نگار رمیش اور روشنی کی شکل میں کیا پیغام دینا چاہتا ہے۔وہ رمیش جو نائلہ کو اس کی مرضی سے بھگا کر ممبئی لے جاتا ہے۔شروع میں کچھ دن اس کی محبت کے گن گان بھی کرتا ہے ۔اس کے جسم کا استعمال بھی بالکل شوہر کی طرح کرتا ہے اور ناول کا اختتام بھی قیدار اور روشنی کے وصال سے ہوتا ہے جو اپنے آپ میں ایک سوال ہے۔؟

ویسے دیکھا جائے تو اسمٰعیل ایک ایسا کردار ہے جو ظلم کے خلاف لڑتا ہے۔اس نے اپنے کالج کے

زمانے میں بھی انل شرما پر حملہ آور ہونے والے لڑکوں سے لڑائی کی تھی۔اسمٰعیل کالج کے مینجمنٹ کی غلط بات کے خلاف بھی کھڑا ہو جاتا تھا۔اسے جو خواب نظر آتے تھے وہ ان سے پریشان ضرو ہوتا تھا،لیکن معاشرے میں پھیلتے فرقہ پرستی کے زہر کے خلاف لڑنے کی اس کی ہمت کبھی کم نہیں ہوتی تھی۔اسمٰعیل ایک مثالی کردار کے طور پر پورے ناول میں چھایا رہتا ہے۔ایسا بھی نہیں ہے کہ ناول میں اسمٰعیل کے کردار کو خوب پینٹ کر کے دکھایا گیا ہو۔اس کی کمزوریوں اور خامیوں کا ذکر نہ کیا گیا ہو، بلکہ حسین الحق نے اقلیوں اور خاص کر مسلم اقلیتوں کا ایک ایسا کردار پیش کیا ہے جو ہر اندھیرے کے خلاف لڑتا ہے اور امید کی روشنی باقی رکھتا ہے۔

ناول 'اماوس میں خواب' حسین الحق کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ناول کا ہیرو یعنی مرکزی کردار اسمٰعیل مرچنٹ ہے جو اقلیتوں کا نمائندہ بھی ہے اور ہر ظلم کے خلاف نبرد آزما ہوتا رہتا ہے۔خواہ وہ مدرسے کا یا اسکول کا معاملہ ہو، کالج میں انل شرما کی مدد کی بات ہو، یا پھر کالج کے اسٹاف روم میں غیر مسلم اساتذہ کے ذریعہ کی گئی کوئی نازیبا بات کا اختلاف ہو، ہر جگہ اسمٰعیل مرچنٹ اپنی موجودگی درج کراتا رہتا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ وہ صرف ایک مثالی کردار کے طور پر سامنے آیا ہو۔ بلکہ اس کی نظر میں کانگریس، مسلمانوں کی مخالف جماعتیں، ہندو اکثریتی جماعتیں وغیرہ ،سب ایک تھیں،اور سب مسلمانوں کے حقوق کو غصب کرنے کے لئے ایک دوسرے پر بازی لے جانا چاہتی تھیں۔اسمٰعیل مرچنٹ کا ذہنی ارتقاع سی پی آئی سے ملتا جلتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ جب سی پی آئی کے ایک بڑے لیڈر نے بہار میں اپنی پارٹی بدل لی اور وہاں سی پی آئی کی حالت خراب ہوگئی تو اسمٰعیل مرچنٹ جیسے لوگوں کو ذمہ داری دی گئی اور اسمٰعیل مرچنٹ خود وہاں جا کر گھبرائے ہوئے سی پی آئی کے لوگوں میں اطمینان اور سکون بھرنے کا کام کر رہے تھے۔زمین سے سی پی آئی کو دوبارہ جوڑنے کا کام اسمٰعیل مرچنٹ کا کارنامہ ہے۔

اسمٰعیل مرچنٹ زندگی کے ہر شعبے میں اپنی کارکردگی کی بنیاد پر واقعی لیڈر کے طور پر اُبھر کر سامنے آتا ہے۔اس نے اپنی کم عمری میں بھی محبت کی تھی اور بعد میں ماموں زاد سے محبت کو شادی میں تبدیل کیا تھا۔لیکن اس کے ذریعہ دیکھے جانے والے خواب کو حسین الحق نے علامتی طور پر بیان کیا ہے۔دراصل پورے ناول میں حسین الحق نے ہندوستان اور باہر بھی مسلمانوں پر ہو رہے مظالم کا خوبصورت نقشہ پیش کیا ہے۔ایسے میں جب کہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہوا اسمٰعیل مرچنٹ کے خواب اور خوابوں کو پوری کرنے کی اس کی عملی جدوجہد، اسے پورے ناول پر حاوی کر دیتی ہے۔ایسے کردار کا تین چوتھائی ناول کے بعد ناول کے پس منظر سے اچانک غائب ہو جانا قاری کو صدمے میں گرفتار کر دیتا ہے۔وہ بھی ایک بم حادثے کا شکار ہونا، بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔لیکن یہاں مجھے عینی

آپا کا ناول 'چاندنی بیگم' یاد آتا ہے، جس میں تقریباً نصف ناول کے دوران ناول کے مرکزی کردار چاندنی بیگم اور قنبر علی ایک حادثے کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔ یعنی قنبر علی کی حویلی میں چاندنی بیگم کی غلطی سے آگ لگ جاتی ہے۔ پورا ریڈ روز کا عملہ، اخبار کے کاغذات اور حویلی کی تمام چیزیں جل کر خاکستر ہو جاتی ہیں۔ وہاں بھی قاری سوچتا رہتا ہے کہ اب ناول کیسے آگے بڑھے گا۔ لیکن یہ عینی آپا کا کمال ہے کہ انہوں نے اس حادثے کے بعد بھی ناول کو تقریباً دو سو صفحات تک آگے بڑھایا۔ حسین الحق کا یہ ناول بھی حقیقتاً دیکھا جائے تو زندگی کا ترجمان ہے کہ کسی کی بھی کہیں بھی موت واقع ہو سکتی ہے اور کسی کی موت سے انسانی زندگی کبھی رکتی نہیں ہے۔ ناول بھی اپنے فطری انداز میں اسمٰعیل مرچنٹ کی موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اب ناول نگار نے اسمٰعیل مرچنٹ کے بچوں قیدار اور نائلہ کی زندگی کو ناول کا حصّہ بنایا ہے۔ نائلہ کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے وہ انجانے میں زیادہ ہوتا ہے۔ گھر سے بھاگ کر غیر مسلم نوجوان رمیش کے ساتھ ممبئی جانے میں نائلہ کی اپنی مرضی ضرور شامل ہوتی ہے۔ لیکن رمیش کچھ دن تو اس کے محبوب جیسا ہی رہتا ہے۔ پھر شوہر بنتا ہے اور پھر ایک ظالم انسان بن کر سامنے آتا ہے۔ نائلہ اب ایسے ریتیلے چوراہے پر کھڑی ہے جہاں اس کی زندگی بالکل بے آب و گیاہ صحرا میں کانٹے دار درخت کی مانند ہے کہ وہ کسی سمت بھی جائے تو بدنامی کی دھول اور ریت کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

دوسری طرف اسمٰعیل مرچنٹ کے بیٹے نے جے این یو کی فضا میں انقلابی رنگ اپنا لیا تھا کہ جے این یو کی فضا بھی زعفرانی رنگ میں رنگنے سے نہیں بچ پائی تھی۔ جو تھوڑی بہت روشنی باقی تھی، وہ روشنی کی شکل میں اس کا مقدر بنتی ہے۔

حسین الحق نے پورے ناول میں کئی طرح کا اسلوب استعمال کیا ہے۔ کہیں ان کا بیانیہ علامتی ہو جاتا ہے تو کہیں ان کے بیانیے میں رومانیت اتر آتی ہے۔ یہ دراصل حسین الحق کے زمانے کا اثر ہے کہ انہوں نے ترقی پسندی کی رومانیت، جدیدیت کی علامت نگاری اور ان دونوں کی حقیقت پسندی، حسین الحق کے افسانوں اور ناولوں کے اسلوب کا خاصہ بن جاتی ہے۔ حسین الحق نے اپنے ناول 'اماوس میں خواب' میں اسمٰعیل مرچنٹ کے ذریعہ دیکھے گئے بہت سارے خوابوں میں سے ایک خواب کا ذکر رومانی انداز میں کچھ یوں کیا ہے۔

''اور پردہ ابھی اُٹھا نہیں تھا، حریری پردوں کی سرسراہٹ نرم بھی تھی اور ریشم جیسی کومل بھی،
پردے ساکن نہیں تھے، مگر اُٹھ بھی نہیں جا رہے تھے۔ اہتمام یہ تھا کہ کچھ چھپا بھی رہے،
کچھ جھلملاتا بھی رہے، ایسے ستر پردوں کے پرے وہ ساعد سیمیں ایک مستانہ سی بوجھل اور

سرشار کیفیت میں مکیف ہوئیں کہ ماتھے پہ اُن کے شکنیں مثل صنف تشنگاں تھیں اور بھنویں طلب کی آگ میں جل کر زلف زلیخا کی مانند اور سیاہ آنکھوں کی پتلی میں سیاہی تھیں، سفیدی تھی، شفق تھی، ابر باراں تھا، مگر یہ ابر کچھ رکا رکا سا تھا اور ناک کی کیل پھول پر شبنم اور لب۔ گلاب کی دو پنکھڑیاں ایک دوسرے سے وصل کے نشے میں سرشار، رخسار ڈوبتے ہوئے دو سرخ سورج جو روشنی کی ہلکی ہلکی پھوار چھینکتے ہیں، مگر اپنی گرمی سے پریشان نہیں کرتے، گردن انگوری شراب کا، ایسا جام جس کی ساری شراب کف ساقی کو بھگوتی محسوس ہو، سینہ خلد کے دو گنبدوں کا بیضوی عرصہ جس پر مینار کی انتہا کا نوکیلا پن بھی نمایاں ہو، کہنی سے ہتھیلی تک جلد ایسی شفاف کہ رگوں میں دوڑتا خون آئینے کی طرح عکس آسا اور شیشے کی طرح آر پار.....''

(ناول 'اماوس میں خواب،

حسین الحق، ص۔۳۱۔۳۰)

حسین الحق کے ناول کے کردار اپنے پس منظر اور خاندانی وراثت میں ملی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔وہ اسمٰعیل مرچنٹ ہوں، مبشر رجائی ہوں، نائلہ یا رمیش ہوں، انل شرما اور شوبھا ہوں، یا پھر قیدار اور روشنی ہر کردار اپنے ماحول کے مطابق زبان بولتا ہے۔ کردار کی زبان کا ایک نمونہ دیکھیں۔اس اقتباس میں جو پہلا جملہ ہے ''اوئے اسمٰعیلا! تو خود کیا کر رہا ہے یار؟'' کا استعمال ناول میں بار بار ہوا ہے اور اسمٰعیل اس جملے کی یادداشت اور بازگشت سے پریشان ہو جاتا ہے۔

''اوئے اسمٰعیلا! تو خود کیا کر رہا ہے یار؟'' اچانک پھنکار گونجی اور وہ رات کے اندھیرے میں چھٹپٹا کر اُٹھ بیٹھا، کھڑکی پر کوئی پرچھائیں مار رہی تھی اور کمرے میں آواز کی بازگشت جاری تھی۔ ''مسلمان جو کر بنے یا غلام، تو کیوں پریشان ہے؟ تو کیوں پریشان ہے؟''

(ناول 'اماوس میں خواب، حسین الحق، ص۔۹۵)

ناول میں جگہ بہ جگہ ایسے مناظر دکھائے گئے ہیں جن میں بہار کی سیاست موجود ہے۔ خاص کر لالو پرشاد کا وہ زمانہ جب وہ اقتدار میں تھے تو مسلمانوں کا بھی عجب حال تھا کئی وزراء مسلمان تھے یہاں تک کہ کیبنیٹ میں بھی مسلم وزراء کی دھاک تھی۔ لالو پرشاد کے ذریعہ دیا گیا نعرہ ''مائی'' یعنی 'مسلمان' اور 'یادو' جب مل کر ایک

پلیٹ فارم پر آتے ہیں تو دیگر پارٹیوں کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ اور مسلمانون کا ساتھ ہندو لوگ بھی دیتے ہیں۔ ناول میں اس صورت حال کو حسین الحق نے بہت عمدگی سے قصّہ بنایا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''وہ زمانہ ہی کچھ عجب تھا، مسلمان نشے میں جھوم رہے تھے، اقتدار میں حصہ مل گیا تھا، کیبنٹ میں ایک دو نہیں، پورے پورے سات منسٹر، وزیر اعلی مسلمانوں کے ہر دُکھ درد میں شریک تھے، مزار پر قوالی ہو تو وزیر اعلی موجود، خانقاہ میں عرس ہو تو وزیر اعلی چلے آ رہے ہیں، کباب کے بڑے شوقین تھے، ایک کباب بنانے والے کو اسمبلی میں لے آئے، مسلمان غنڈوں تک کو عزّت دیتے تھے، مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے، اور بہت سے قبرستانوں کو بھی چمکا دیا تھا، بھارتیہ جنتا پارٹی کو تو ایسی کھری کھری سناتے تھے کہ کیا مسلمان سنائے گا۔''

(ناول 'اماوس میں خواب'، حسین الحق، ص۔ ۹۵)

ناول کا مرکزی کردار اسمٰعیل مرچنٹ جب بھیونڈی میں تھا تو اس نے بڑی محنت اور ایمانداری کے ساتھ ایک پاورلوم شروع کیا تھا۔ جس طرح سے چڑیا تنکے تنکے جمع کر کے اپنا گھونسلہ بناتی ہے، اسمٰعیل مرچنٹ نے بھی بہت سارا سامان اور چیزیں جمع کر کے پاورلوم لگایا تھا۔ لیکن بھیونڈی کے بدلتے حالات (فرقہ پرستی کا زہر) نے اسے بھیونڈی چھوڑنے پر مجبور کیا اور وہ بہار میں عملی زندگی گزارنے کے لئے آ جاتا ہے۔ لیکن یہاں بھی فرقہ پرستی کا زہر لوگوں کے ذہن و دل میں سما جاتا ہے۔ عوام کا ایک بڑا طبقہ اس زہر سے متاثر ہوتا ہے، یہی نہیں بلکہ پولس والوں کے دل و دماغ میں بھی اس زہر کے جراثیم پھیل جاتے ہیں۔ حسین الحق نے اپنے ناول میں پولس والوں کے رویے پر بھی سوال اٹھایا ہے۔ ایک شریف آدمی کو کس طرح سے پریشان کیا جاتا ہے۔ ناول میں اس کی بہت اچھی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔

''بھیونڈی سے بہار تک.... صورت حال میں تبدیلی کیا آئی؟
شہر کی درجنوں سماجی تقریبات میں شرکت کی، ہندی انگریزی اخبارات میں تصویریں چھپیں اور اس جیپ میں بیٹھے دس آدمیوں میں سے ایک بھی مجھے نہیں جانتا؟ اس کا جی چاہا کہ وہ جیپ کے اندر موجود لوگوں کو بتائے کہ ''کم بختو! تم نے شہر کے ایک انتہائی شریف اور جانے مانے شہری کو بلا قصور گرفتار کر لیا ہے۔'' اس نے سوچا کہ ''وہ اس کی

اطلاع صوبے کے وزیراعلیٰ سے صدر جمہوریہ تک کو دے گا اور ان نالائقوں کو کٹگھرے میں کھڑا کر کے رہے گا۔''

''ارے سالا.... ائی سے کا دیکھ رہا ہے رے؟'' ایک سپاہی نے اس کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر اس کا بال پکڑ کر ایسا جھٹکا دیا کہ اس کا سر زمین سے ٹکرا گیا اور درد کی شدّت سے وہ بلبلانے لگا.... اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

(ناول 'اماوس میں خواب، حسین الحق، ص۔۲۰۲)

حسین الحق نے اپنے ناول 'اماوس میں خواب' میں بہار کی سیاست پر کھل کر لکھا ہے۔ بہار کی سیاست لالو اور نتیش کے درمیان رسہ کشی کا موجب ٹھہرتی ہے۔ کبھی لالو پرشاد یادو کو زمانہ تھا اور لالو اور نتیش کی دوستی مشہور تھی۔ اس کے بعد نتیش کا زمانہ آتا ہے۔ اقتدار نتیش کے پاس ہے اور لالو پرشاد یادو نتیش کی دشمنی اور اپنے کئے چارہ گھوٹالے کے سبب جیل جانے پر مجبور ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ نتیش کے زمانے میں بہار میں کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔ مگر بی جے پی والوں کے حوصلے بلند ہوئے۔ اور نفرت کا بازار خاص کر مسلمانوں کے خلاف اندر اندر سلگتا ہوا لاوا اکثریت کے ذہن و دل میں پکنے لگا۔ یہ الگ بات ہے کہ شروع شروع میں بی جے پی یا دوسری فرقہ پرست جماعتوں نے کھل کر مسلمانوں کے خلاف کھیلنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر ہندو مذہب کو ہندوتو کی طرف لے جانے کا کام انہوں نے ضرور کیا۔ ناول کا یہ حصّہ دیکھیں۔

''لالو پرشاد جیل جا چکے تھے۔ نتیش لالو کی دشمنی اپنے عروج پر تھی۔ بہار میں کہیں کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہو رہا تھا۔ فضا میں فرقہ وارانہ تناؤ بھی نہیں تھا، مگر بھارتیہ جنتا پارٹی والوں کے حوصلے بہت بلند تھے۔ اب ایک نئی چیز ''شیو چرچا'' شروع ہوئی تھی۔ ہر گاؤں میں پنچایت میں، کنارے کے محلوں میں شیو چرچا ہوتی، لوگ جوق در جوق جمع ہوتے۔ اس میں مسلمانوں کے خلاف کوئی بات نہیں کی جاتی مگر پراچین سنسکرتی کا خوب چرچا ہوتا، مسلمانوں کے خلاف کچھ نہیں بولا جاتا البتّہ وشو ہندو پریشد اور ہندو واہنی والے جب نہ تب گائے بھینس لے جاتے کسی آدمی کو پکڑ لیتے، اسے مارتے پیٹتے یا اگر مارتے نہیں تو پولس کے حوالے کر دیتے، پولس ان پر ایف آئی آر درج کر کے ان کو حوالات میں ٹھونس دیتی، جانور سب آزاد کرائے جاتے، کچھ جو پسند آتے وہ وی ایچ پی اور ہندو واہنی کے

رضا کار اپنے ساتھ لے جاتے، جو باقی بچتے گئو رسر کچھا سمیتی کے حوالے کر دیتے۔''

(ناول 'اماوس میں خواب، حسین الحق، ص۔۲۴۵)

نائلہ، رمیش کی محبت میں گرفتار ہو کر ایک ایسا قدم اُٹھا لیتی ہے۔ جو سماج میں بُرا سمجھا جاتا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب اسمٰعیل مرچنٹ اور ان کی بیوی شہسوار دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ نائلہ کا بھائی قیدار جے این یو کی فضاؤں میں آزادی کے نغمے گا رہا ہوتا ہے۔ نائلہ اور رمیش گھر سے بھاگ کر ممبئی پہنچتے ہیں۔ پہلے ایک دوست کے یہاں رہتے ہیں، پھر ایک چھوٹی سی کھولی میں پناہ لیتے ہیں۔ دونوں کے درمیان قربتوں کے فاصلے موجود ہیں، لیکن ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے آگ اور پانی الگ کیسے رہ سکتے ہیں۔ لہذا عین فطری طور پر نائلہ اور رمیش جسم کی دیواروں پر نقش بنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور دونوں کا وصال عمدہ طریقے سے حسین الحق نے اپنے ناول میں بیان کیا ہے۔ میری رائے ہے کہ حسین الحق رومانی لمحے کو بہت خوبصورتی کے ساتھ اچھے الفاظ میں ڈھالنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ یعنی یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ حسین الحق ایک رومان پسند ناول نگار ہیں۔ ان کی یہ خوبی ناول میں کئی جگہ آشکار ہوتی ہے۔ ایک نمونہ دیکھیں۔

''نائلہ اور رمیش دھواں کنڈ کی انتہائی کھائی میں گرتے نظر آ رہے تھے۔

چاروں طرف دھواں پھیلا ہوا تھا، مانس نین سامنے کا درشئے دیکھنے یوگی نہیں، ہر چیز دھند کی ایک گہری اور پر اسرار وادی میں گرتی محسوس ہوئی، ایسا لگا جیسے ہمالہ کی گپھاؤں میں کسی بدھ لاما کا اسرار خانہ ہے، چاروں طرف عود عنبر کی لپٹیں سی اُٹھ رہی تھیں، اور ایک سمفنی سی گونجتی تھی، نغمہ تھا مگر بے لفظ، سر تھا مگر نا قابل فہم، نائلہ تھی مگر یوں جیسے خواب میں کسی شئے کا وہم، رمیش تھا مگر یوں جیسے خلاؤں میں کسی لا شئے کا ہیولیٰ...... پہاڑی پُر شور ندی کا پانی ہزاروں فٹ گہری کھائی میں گر رہا تھا اور پانی کو ندی سے ملتے کوئی نہیں دیکھ پاتا..... گہری راتوں میں پہاڑوں کی چٹانوں پر..... یا مور کے پیروں کی بنی سیج پر آدم اور حوا کسی خیالی جنت کا خواب دیکھتے ہوئے۔''

نائلہ اور رمیش بستر پر بے سُدھ سو رہے تھے، جیسے جیسے آدم اور حوا سوئے ہوں گے۔''

(ناول 'اماوس میں خواب، حسین الحق، ص۔۲۸۳)

حسین الحق نے اپنے ناول میں جہاں اقلیتی ڈسکورس کی بازیافت کی ہے وہیں وہ مسلمانوں کے درمیان پنپنے والے فرقوں کے بارے میں بھی متفکر ہیں۔ وہ بار بار اس زمانے کو بھی یاد کرتے ہیں جو انگیریزوں کا زمانہ تھا کہ اس زمانے میں مسلمان ایک ہوتے تھے۔ صرف سنی اور شیعہ ہوا کرتے تھے، وہابی، سلفی، اہل حدیث یا

سید، انصاری یا دیگر برادریوں میں مسلمان بنٹا ہوا نہیں تھا۔ حسین الحق مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں بٹ جانے پر دکھی بھی ہیں اور غم زدہ بھی۔ ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''دیکھتے دیکھتے دیکھنے والوں کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

دیکھنے والا کیسے بتائے اور کس کس کو بتائے کہ یہاں صبحیں اور شامیں کبھی حسین بھی ہوا کرتی تھیں۔

یہ زمانہ کب کا تھا اور کیسا تھا، یاد کرو تو آنسو نکل آتے ہیں، تب مسلمانوں میں صرف سُنّی اور شیعہ ہوا کرتے تھے، نہ وہابی نہ سلفی، نہ اہل حدیث، ساری دنیا کے مسلمانوں پر ترکوں کی علامتی حکومت تھی۔ جمعہ کے خطبوں میں ترکوں کی تعریف ہوتی تھی اور مغلوں کو اپنی لولی لنگڑی حکومت کی آزادی تھی۔''

(ناول 'اماوس میں خواب، حسین الحق، ص۔۳۰۱)

نائلہ ابتداء میں وہ رمیش پر بھرپور اعتماد کرتی تھی۔ وہ کہاں جاتا ہے، کیا کرتا ہے، اور پیسے کہاں سے لاتا ہے یہ سب وہ کبھی سوچتی نہیں تھی۔ دن بھر کھولی میں اکیلے رہنا اور رات گئے تک رمیش کا انتظار کرنا، آنے پر اس کے لئے گرم گرم کھانا بنانا ہی اس کا روزمرہ تھا۔ لیکن ادھر رمیش کے رویے میں آئی تبدیلی نے نائلہ کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ اب رمیش اس کا محبوب یا بغیر شادی کا شوہر نہیں رہا تھا بلکہ ایک ظالم و جابر شخص بن گیا تھا۔ اس کا کام زنا بالجبر ہی رہ گیا تھا۔ وہ اب رمیش سے بہت ڈرنے لگی تھی۔ خاص کر جب ایک عورت کے ذریعہ اپنی سگی بیٹی کے ساتھ چار پانچ نوجوانوں کا زبردستی سیکس اور قتل کی خبر اخباروں میں آئی تھی۔ نائلہ کے دماغ میں بھی خوف نے زبردست طور پر پکڑ بنالی تھی۔ اب وہ رمیش سے ڈرنے لگی تھی۔ ناول کا یہ حصّہ دیکھیں۔ حسین الحق نے بڑے کمال کے ساتھ نہ صرف رمیش میں آنے والے بدلاؤ کا نقشہ کھینچا ہے بلکہ منٹو کے افسانے 'کھول دو' کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اور طنز کے طور پر آزادی کی سترویں سالگرہ کا ذکر کیا ہے۔

''وہ ہمّت کر کے آہستہ آہستہ سلنڈر کی طرف گئی اور کھانا بنانے لگی۔

سچ مچ رمیش سے اب اسے ڈر لگنے لگا تھا۔

وہ آیا، کھانا کھایا، دیر تک بلو فلم دیکھی، گندے گانے سنے اور اس کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، اس نے سکینہ کی طرح اپنا آزار بند کھول دیا۔

یہ آزادیٔ وطن کے بعد کی ستر ویں رات تھی۔''

(ناول 'اماوس میں خواب، حسین الحق، ص۔ ۳۲۸)

نائلہ نے جس پتے پر بھروسہ کیا،، وہی پتا ہوا دینے لگا۔ یہاں ناول نگار نے ممبئی کی اپنا بن کر زندگی سے کھلواڑ کرنے کی لوگوں کی عادت وخصلت کو آشکار کیا ہے۔

ناول 'اماوس میں خواب' دراصل مسلم اقلیتوں کے لئے پورے ہندوستان میں اندھیر کے مانند ہے اور اس میں مثبت کردار ادا کر رہے لوگ، ہلکی سی روشنی کی مانند میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ لیکن یہ روشنی کبھی کبھی آگ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جو اقلیتوں پر ہو رہے مظالم کا علامتی بیان ہے۔ ویسے ناول میں بہار، مہاراشٹر، اور یوپی میں حتی الامکان طور پر ہندو مسلم اتحاد دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن فرقہ پرست لوگ اور سیاسی جماعتوں کا کردار بھی ہندوستان میں امن وامان کے خلاف زہر بوتا ہوا نظر آتا ہے۔ ناول میں مسلم لیگ، تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی کا بھی ذکر موجود ہے تو دوسری طرف سی پی آئی، سی پی ایم، پی ایف آئی وغیرہ کا زور اور شباب دکھایا گیا ہے۔ تو روس کے ٹوٹنے کے ساتھ ان جماعتوں کا زوال بھی ناول میں بیان ہوا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ 'اماوس میں خواب' مسلم اقلیتوں کا ایسا بیان ہے جس میں فرقہ پرست طاقتیں مسلمانوں کے خلاف نئے نئے ہتھکنڈے اپنا رہے ہیں اور ہر طرح کے مظالم ان کے خلاف رواں رکھے جا رہے ہیں۔ وہ خواہ بابری مسجد کے انہدام کا معاملہ ہو یا مسلم پرسنل لا میں مداخلت کی بات ہو، یا پھر معاشی طور پر مسلمانوں کو تنگ اور پریشان کرنے کا ذکر ہو۔ کہا جا سکتا ہے کہ ناول میں حسین الحق نے اقلیتی ڈسکورس کو ہوا دی ہے۔ اور یہ ڈسکورس ناول کے مطالعے کے بعد قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

حسین الحق: چند یادیں چند باتیں

احمد صغیر

موبائل : 9931421834

حسین الحق ایک ایسے فنکار تھے جنہوں نے اردو فکشن کو وقار بخشا اور اپنے اسلوب کی وجہ سے اردو فکشن میں ایک الگ پہچان بنائی۔ پروفیسر حسین الحق 2 نومبر 1949 کو سہسرام میں پیدا ہوئے اور 23 دسمبر 2012 کو اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

حسین الحق نے افسانے سے شروعات کی جہاں تک مجھے یاد آتا ہے 1980 کا زمانہ تھا۔ میں خورشید حیات اور احسان تابش افسانے کی دنیا میں قدم رکھ چکے تھے۔ میں جب کسی ادبی نشست میں جاتا تھا وہاں حسین الحق کو افسانہ پڑھتے ہوئے دیکھتا ان کے پڑھنے کا جو طریقہ تھا ایسا لگتا تھا سارا منظر وہ افسانے کے ذریعہ دیکھانا چاہتے ہیں۔ میں ان سے بے حد مرعوب تھا۔ ان کے افسانے جب رسالوں میں پڑھتا تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا تب پروفیسر تاج انور سے مشورہ کرتا تو وہ سمجھا دیتے دھیرے دھیرے افسانے کی سمجھ آ گئی۔ ان کا اسلوب ہم لوگوں پر حاوی ہونے لگا کوشش کرتا ان ہی کی طرح افسانہ لکھوں لیکن وہاں تک پہنچنا اس وقت ناممکن تھا۔ ابھی افسانہ لکھنا شروع کیا تھا مطالعہ بھی بہت وسیع نہیں تھا۔

بتاتا چلوں کہ حسین الحق کا افسانوی مجموعے ''کرب ذات'' 1972، ''پس پردۂ شب'' 1980، ''صورتِ حال'' 1982، ''گھنے جنگلوں میں'' 1989، ''مطلع'' 1996، سوئی کی نوک پر رُکا لمحہ 2002 اور ''نیو کی اینٹ'' 2010 میں شائع ہوئے جبکہ ناول ''بولومت چپ رہو'' 1991 ''فرات'' 1994 اور ''اماوس میں خواب'' 2017 میں منظرِ عام پر آئے۔ ''اماوس میں خواب'' پر 2020 کا ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ بھی ملا۔

گیا میں رہنے کی وجہ سے حسین الحق سے ہمیشہ ملاقات ہوتی رہتی تھی پھر یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تو استاد کی حیثیت سے روز ملاقات ہوتی۔ مگدھ یونیورسٹی میں دو اساتذہ کی کلاس کبھی نہیں چھوڑنا۔ پروفیسر افصح ظفر اور حسین الحق۔ افصح صاحب تنقید پڑھاتے تھے اور حسین الحق فکشن۔ ان دونوں اساتذہ کی قربت مجھے اس لیے زیادہ حاصل تھی کیونکہ یہ جانتے تھے کہ میں لکھنے کی طرف مائل ہوں اور میرے افسانے رسالوں میں شائع ہوتے

ہیں۔ پی ایچ۔ڈی تک ان اساتذہ کے ساتھ رہا۔

ایک دن میں اپنا افسانہ ''انا کو آنے دو'' لے کر حسین الحق کے پاس گیا اور انہیں پڑھنے کے لیے دیا پڑھنے کے بعد ان کا ردِ عمل تھا کہ اب تک تم نے جو افسانے لکھے ہیں ان میں یہ سب سے اچھا افسانہ ہے۔اسی کے نام پر اپنے مجموعہ کا نام رکھ لو۔ میں نے کہا پہلا مجموعہ ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' تو چھپنے کے لیے چلا گیا ہے ہاں دوسرے مجموعہ کا نام اسی افسانہ کے نام پر رکھوں گا اور میرا دوسرا افسانوی مجموعہ ''انا کو آنے دو'' اسی نام سے 2000ء میں شائع ہوا۔ پہلا افسانوی مجموعہ ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' پر حسین الحق نے بھر پور تبصرہ کیا تھا جو ''زبان وادب'' میں شائع ہوا تھا انہوں نے اس مجموعہ کے کچھ افسانوں کی بے حد تعریف کی تھی۔

چوتھا افسانوی مجموعہ ''داغ داغ زندگی'' چھپنے سے پہلے میں نے حسین الحق کو پڑھنے کے لیے دیا۔ وہ سارے افسانے پڑھ گئے۔اس مجموعہ میں ایک افسانہ ''ہوا شکار'' ہے، یہ نام انہیں کا دیا ہوا ہے۔اس افسانہ کی انہوں نے بہت تعریف کی تھی اور جب مجموعہ شائع ہوا تو واقعی اس افسانہ کو بہت پسند کیا گیا۔علی احمد فاطمی نے بھی اس افسانہ کی تعریف کی اور صالحہ زریں نے تو اس افسانہ پر ایک طویل مضمون ہی لکھ ڈالا۔

حسین الحق کی تقریباً سبھی کتابیں میں نے پڑھی ہیں۔ان کے افسانے اور ناول کے حوالے سے لکھا بھی ہے۔ میں اس مضمون میں ان کے چند افسانوں پر ہی روشنی ڈالوں گا جو مجھے بے حد پسند ہیں۔ حسین الحق کا افسانہ ''نیو کی اینٹ'' کو سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ حسین الحق پر جدیدیت کا اثر تھا اور آخری وقت تک رہا۔شروع کے دو افسانوی مجموعے ''کرب ذات'' اور ''پس پردۂ شب'' کے افسانے پر جدیدت کا اثر ہے لیکن آہستہ آہستہ ان کا انداز بدلتا گیا اور شفاف بیانیہ کی طرف لوٹ آئے ''نیو کی اینٹ'' شفاف بیانیہ کا عمدہ مثال ہے۔ اس افسانہ تک ہر خاص و عام قاری کی رسائی با آسانی ہو جاتی ہے۔اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ ''نیو کی اینٹ'' حسین الحق کی پہچان ہے۔یعنی وہ ''نیو کی اینٹ'' کی وجہ سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔

''نیو کی اینٹ'' میں سلامت اللہ اور شیو پوجن دو ایسے کردار ہیں جن کے ارد گرد پورا افسانہ گھومتا ہے۔ شیو پوجن بابری مسجد کا ٹوٹا ہوا اینٹ لے کر آتا ہے اور اپنے گھر کے باہر پوجا شروع کرتا ہے۔ وہاں ایک بھیڑ سی لگ جاتی ہے۔سلامت علی جب شیو پوجن کے گھر سے گزرتا ہے تو بھیڑ دیکھ کر چونکتا ہے جب وہ گھر پہنچتا ہے تو اس کی بیٹی بتاتی ہے کہ شیو پوجن چاچا اینٹ لے کر آئے ہیں۔ سلامت اللہ شیو پوجن سے ملنے جاتا ہے کیونکہ دونوں ایک ہی دفتر میں ملازم تھے لیکن شیو پوجن اُسے گھر واپس بھیج دیتا ہے۔ رات بھر نعرے گونجتے رہتے ہیں سلامت

اللہ کا پریوار خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ سلامت اللہ بیوی کو مائیکے بھیجنا چاہتا ہے مگر وہ جانے سے انکار کر دیتی ہے کہ یہاں اور بھی مسلمان تو رہ رہے ہیں۔

لیکن جب شیو پوجن کو معلوم ہوتا ہے کہ پولیس کا چھاپا پڑنے والا ہے تو اینٹ سلامت اللہ کو تھما کر گھر سے پریوار کے ساتھ فرار ہو جاتا ہے۔

اس مختصر سی کہانی میں حسین الحق نے اس حالات کی روشنی میں دونوں قوموں کی ذہنیت کا بخوبی مطالعہ پیش کیا ہے۔ شیو پوجن اینٹ لاکر اور پوجا پاٹ کر کے ہیرو بن گیا ہے۔ سلامت اللہ کے آفس میں شیو پوجن ہی مرکز میں ہے۔

''شیو پوجن کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہے اور کیوں نہ ہو اس کو 47 جیسا تصادم تو مان ہی لیا گیا تو کل شیو پوجن مجاہد آزادی کا پینشن بھی لے گا۔ جو درشن کرتا ہے وہ دان بھی دیتا ہے اور پھر دھارمک سنگھرش کا ایک حصہ بن کر شیو پوجن راتوں رات دھارمک بھی بن ہی گیا۔''

اگر آج کے پس منظر میں اس اقتباس کو دیکھا جائے تو یقیناً آر۔ ایس۔ ایس اور بی۔ جے۔ پی کے لوگ مجاہدِ آزادی میں شمار ہونے لگے ہیں جو جتنی نفرت پھیلائے گا، جتنی آگ اگلے گا وہ ہندو مذہب کا ہیرو کہلائے گا اور کوئی ٹھکانہ نہیں کہ آنے والے دس برسوں میں ان لوگوں کو پینشن بھی ملنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ فنکار بہت دور تک سوچتا ہے۔ حسین الحق کو آنے والے وقت کا اندازہ تھا کہ جس نفرت کا آغاز ہو چکا ہے مستقبل میں ایک نیا روپ دھار لے گا اور آج یقیناً ایک نیا روپ دھار لیا ہے۔ جو ان کے نظریے کی حمایت کر رہا ہے وہ ہیرو اور جو مخالفت کر رہا ہے وہ ویلن۔ وہ جیل کی ہوا کھا رہا ہے یا مار دیا جا رہا ہے۔

سلامت اللہ کو جس طرح بے بس دکھایا گیا ہے آج ہندوستان کا ہر مسلمان اس سے بھی زیادہ اپنے آپ کو بے بس تصور کر رہا ہے اور مستقبل میں اس سے بھی برا وقت آنے والا ہے۔

سلامت اللہ کا درد صرف اس کا درد نہیں ہے آج کے ہر مسلمان کا درد ہے وہ رونا چاہتا ہے مگر رو نہیں سکتا۔

حسین الحق کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ افسانہ کو صرف موضوع تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ اس میں تاریخ، ادب اور اسلامی واقعات کو چند جملوں میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں، اس افسانہ میں بھی ایسا ہی کیا ہے۔ گلزار کی نظم کا ایک مصرعہ ''یہ زندہ بوند ہے بیٹی جہیز مانگے گی'' یا خسرو کے گیت کا یہ حصہ ''ارے لکھی بابل مورے'' یا

کربلا کا یہ منظر ''ظالمو! میرے گوہر نہ چھینو''۔

ان تین جملوں میں حسین الحق نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو وہ کہنا چاہتے ہیں۔

کہانی کے ایک مقام پر جب سلامت اللہ دفتر سے نو ہی بجے گھبرا کر گھر جانے کے لیے باس سے اجازت لینے جاتا ہے تو باس کہتا ہے ـــــ ''کبھی کبھی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے ہونے یا نہ ہونے پر اپنا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ ایسے میں آدمی کو تھوڑا صبر سے کام لینا چاہئے۔ ہر چیز ٹیمپوریری ہوتا ہے۔''

سلامت اللہ کے باس کا یہ جملہ اس وقت کے پس منظر میں تھا آج اگر اس کا باس کہتا تو یہ کہتا کہ ''اب آپ لوگوں کو اپنا ہر تاریخی مقام بھول جانا چاہئے اور اسے ہندوؤں کو دے دینا چاہئے۔''

حالات جس تیزی سے بدل رہا تھا اس کا اندازہ حسین الحق کو بخوبی تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے آخری ناول 'اماوس میں خواب'' میں وہ ساری چیزیں بیان کردی ہیں جو ''نیو کی اینٹ'' میں نہیں کر پائے تھے۔

کہانی کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جب شیو پوجن سلامت اللہ کو اینٹ سونپ کر فرار ہو جاتا ہے۔ یہاں دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ جس اینٹ کو لے کر شیو پوجن آیا تھا اور پوجا ارچنا کر کے ہیرو بن گیا تھا وہی اینٹ اس کے لیے مصیبت بن گئی تھی اور اس سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے اپنی مصیبت سلامت اللہ کو دے کر چلا گیا۔ یہاں مذہب کا سارا بھرم ٹوٹ جاتا ہے شیو پوجن اڈگ رہ کر مقابلہ کرسکتا تھا۔ اگر آج کے حالات ہوتے تو وہ کبھی نہیں بھاگتا اور پولیس کی بھی ہمت نہ ہوتی کہ اس کے گھر پر چھاپا مارتی۔ دوسری بات یہ کہ مذہب کس طرح جنونی کیفیت اختیار کرتا جارہا ہے اب تعلیم یافتہ انسان بھی اس افیوم کے نشے میں دھت ہے۔

سلامت اللہ کا یہ کہنا ''ارے اس کی حفاظت کرنا اور اسے بچانا ہمارا فرض ہے۔'' اس بات کی دلیل ہے کہ بابری مسجد کی اینٹ اس کے لیے بھی اہم ہے کیونکہ وہ نیو کی اینٹ ہے اور اس کی حفاظت کرنا اس کا فرض ہے۔ یعنی روایت کی پاسداری میں وہ خود کو مصیبت میں گرفتار ہونے کو بھی تیار ہے۔ لیکن اس کے بیٹے کا یہ کہنا کہ ''واجد علی شاہ کے وقت سے یہ ہمارے لیے مسئلہ بنی ہوئی ہے تو پھر ایک ایسی چیز جو ہر زمانے میں ہر آدمی کے لیے مسئلہ بن جاتی ہے۔ حد یہ ہے کہ اب شیو پوجن چاچا کے لیے بھی مسئلہ بن گئی اس اپنے سر منڈھ لینا کہاں کی عقل مندی ہے۔''

سلامت اللہ کا بیٹا نئے زمانے کا ہے اس لیے اس کی سوچ دوسری ہے۔ وہ مسئلے کا حل چاہتا ہے یا جو مسئلہ پیدا کر رہا ہے اسے اپنے گلے لگانے سے کیا فائدہ۔

حسین الحق کا افسانہ ''نیو کی اینٹ'' یقیناً شاہکار افسانہ ہے۔

اماوس میں خواب ۔ معاصر ہندستان کا استعارہ

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

موبائل : 9431152912

جدید اردو ناول نگاروں میں حسین الحق ایک اہم نام ہے مگر انہوں نے افسانے پر زیادہ توجہ دی اس لئے ان کے ناول کم اور طویل وقفے کے بعد آئے۔ حسین الحق نے اب تک تین ناول لکھے ہیں۔ پہلے ناول ''بولو مت چپ رہو'' (۱۹۹۰) کا موضوع پرائمری و مڈل اسکول کی تعلیم اور سکنڈری لیول پر ایجوکیشن افسر کی نوکر شاہی ہے جس میں اسکول لیول پر بہار میں تعلیمی بدنظمی اور تعفن زدہ تعلیمی نظام کو اکسپوز کیا گیا ہے۔ دوسرا ناول ''فرات'' (۱۹۹۲) نئی زندگی اور نئی Sensibility کا اچھا ناول ہے جس میں ہم عصر ہندوستان کی تہذیب کے مختلف رنگوں اور ان کے ٹکراؤ کو سلیقے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ طویل گیپ کے بعد حسین الحق کا نیا ناول ''اماوس میں خواب'' (۲۰۱۷) آیا جو ایک بڑے کینوس پر لکھا گیا ہے۔ اس میں آزادی کے بعد کی سیاسی، سماجی صورت حال بھی ہے اور مسلمانوں کی زندگی میں پیش آئے تغیرات وانقلابات بھی۔ تعلیم کی کساد بازاری بھی ہے اور سیاست کی عیاری بھی۔ اس میں بھیونڈی، مالیگاؤں، بھاگلپور، بابری مسجد، گجرات، لو جہاد، گئو رکچھا سب کچھ موجود ہے اور ان سب کو خوبصورتی سے قارئین تک پہنچانے کے لئے اسماعیل، قیدار، نائلہ اور رمیش جیسے مضبوط کردار بھی تراشے گئے ہیں۔ آزادی کے بعد سے اب تک کی ہندستانی تاریخ کو ایک سیکولر اور غیر جانبدار نقطہ نگاہ سے دکھانے کے لئے ایک بڑے کینوس اور ہزاروں صفحات کی ضرورت تھی مگر حسین الحق نے ایک ماہر فنکار کی طرح استعارے، تمثیل اور علامت کی زبان دے کر بڑی خوبی سے ۳۴۷ صفحات میں سمیٹ دیا ہے۔ یہاں ماضی اور اس کی قدریں، اسلاف کی تہذیب، مشترکہ ثقافت خواب کی صورت جلوہ گر ہوتی ہیں جسے تعبیر کی صورت میں اسماعیل سے نائلہ تک تین نسلیں پانا چاہتی ہیں، مگر کیا کیجے کہ ملک نے اپنے اوپر نفرت، سیاست اور دشمنی کے اماوس کی وہ چادر تان رکھی ہے کہ تعبیر کا چاند نکل ہی نہیں پاتا۔ حسین الحق نے اس ناول میں بیانیہ کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ اس کا ڈکشن استعارے اور تمثیل کو نئی جہتیں دیتا ہے اور بیانیہ کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔

۳۴۷ صفحات پر مشتمل اس ناول میں جیسا کہ میں نے کہا آزادی کے بعد سے آج تک کی ہندستانی تاریخ کے بین السطور کو پیش کرنے کوشش کی گئی ہے۔ آزادی کے بعد کا یہ عرصہ ملک کے لئے جیسے بھی تغیرات سے

بھرا رہا ہو، انسان کے لئے ذہنی انتشار، قلبی خلفشار اور فکری اضطراب کا عرصہ رہا ہے جس کا تعلق آج سے ہے اور آنے والے کل سے بھی۔ جمہوریت کے خوشنما لبادے میں قید فرد کی چھٹپٹاہٹ، بے چینی اور جھنجھلاہٹ مسلسل بڑھتی جارہی ہے۔ آج کا انسان جس کی زندگی آزادی کے بعد سے مسلسل عذاب کا شکار ہے، جس بے یقینی کا شکار ہے اور جن ناہمواریوں میں سانس لینے پر مجبور ہے اس کا تخلیقی اظہار اس ناول کا وصف ہے۔ اردو میں ہم عصر صورت حال پر ناول کم کم لکھے گئے ہیں۔ یہ ناول موجودہ سیاسی، سماجی، تہذیبی صورت حال کی عکاسی تاریخ کے بجائے تجربات کی روشنی میں کرتا ہے۔ اس میں ہر لحظہ بدلتی زندگی، ہر پل انقلاب سے دوچار معاشرے اور ہر گھڑی چونکانے والی حسیت کے اتنے مناظر سامنے آتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے ہم ناول کے بجائے وقت کے ساتھ سفر کر رہے ہوں۔ اپنے آس پاس کی صورت حال کو حسین الحق نے جس جذباتی قوت اور غیر معمولی حسی شدت کے ساتھ محسوس کر کے اپنے ناول کا حصہ بنایا ہے وہ اس ناول کو situation based novel کے ساتھ ساتھ عالمی صورت حال کا آئینہ بھی بنا دیتی ہے۔ دم توڑتی انسانیت، عصری سیاسی حسیت اور local قدروں کا بکھراؤ ایسے عناصر ہیں جو اگرچہ مقامی تناظر میں ناول کا حصہ بنے ہیں مگر بڑی آسانی سے قاری کے فکری منطقے کو عالمی صورت حال تک بھی پہنچانے کا وصف رکھتے ہیں۔

ناول کا انتساب ''مادر وطن ہندستان کے نام'' کیا گیا ہے اور نیچے شعر درج ہے:

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے　　　　وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

یہ شعر ہی ناول کی روح ہے۔ اسماعیل ایک استعارہ ہے اس سماج کا جو آزادی کے بعد سے مسلسل منزل کی تلاش میں پل صراط سے گزر رہا ہے مگر دوسرا سرا دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ اس سفر میں اس کے دل و دماغ میں ایک محشر بپا ہے۔ وہ گرتا ہے، زخمی ہوتا ہے، مگر ہمت نہیں ہارتا۔ شکست کھا کر بھی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ اسے وہ قرض اتارنے ہیں جو نہ ہوتے ہوئے بھی اس پہ واجب قرار دیئے گئے ہیں۔ دراصل گزشتہ نصف صدی کا عہد ہی قیامت جیسے انتشار اور افراط و تفریط کا ہے۔ اس عہد میں جنم لینے والی بیشتر ناہمواریاں مصنف کی نگاہ میں رہی ہیں اور وہ اپنے عہد کی ہر تصویر کا گواہ ہے۔ اس لئے سیاست، سماج، کرپشن، فساد، مذہب، فلسفہ اور عہد حاضر کے تمام تغیرات جب اس کے قلم کی زد میں آتے ہیں تو زندہ مناظر کی صورت سامنے سے گزرتے ہیں اور قاری کے لئے یہ مناظر صرف ماضی کی بازیافت نہ رہ کر موجودہ صورت حال اور اس کی معنویت کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ ناول سے کہانی اخذ کرنا مقصود ہو تو وہ چند سطروں میں بیان کی جاسکتی ہے کہ اسماعیل مرچنٹ

فسادات کے بعد دربدر بھٹکتا ہوا بالآخر جائے اماں کی تلاش میں 'بہار' پہنچتا ہے اور زندگی کی آزمائشوں سے جوجھتے ہوئے بم دھماکے کا شکار ہو جاتا ہے اور تقریباً یہی انجام اس کی اولاد کے ساتھ بھی پیش آتا ہے اور بس۔مگر کہانی کے ساتھ ماضی قریب سے حال تک کا تہذیبی اور معاشرتی سفر کرنا ہو تو بات چند سطروں سے نہیں بنتی ۔ پھر اس کا ہر صفحہ، اس کا ہر باب ایک نیا منظر لئے سامنے آتا ہے اور آپ کو مٹی کی محبت میں قرض اتارنے والے آشفتہ سروں کا سامنا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔اس منظر نامہ کو پیش کرتے ہوئے مصنف کی نگاہ عہد حاضر کے چھوٹے چھوٹے واقعات و حادثات پر رہی ہے ،اس لئے گاؤں سے ممبئی جیسے شہر تک کے مناظر اس سفر کا حصہ بنے ہیں۔ناول کے ابتدائی تین ابواب گویا قصہ کی تمہید کا درجہ رکھتے ہیں، جس میں اماوس کا اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور جس سے جوجھنے ،لڑنے اور باہر نکلنے کی چھٹپٹاہٹ ، بے چینی و اضطراب کی علامت۔مگر یہیں سے کسی فلم کی سین کی طرح مناظر دامن پکڑنا شروع کر دیتے ہیں۔آیئے کچھ دور ہم بھی ان سچویشنز کا سامنا کریں۔

پہلا منظر۔دربدر بھٹکتا ہوا اسماعیل جب بہار میں پناہ لیتا ہے تو اسے پٹنہ یونیورسٹی اپنے دامن میں پناہ دیتی ہے۔جہاں دوستوں میں ایک طرف فیضان رسول میرانی ہے تو دوسری طرف انیل شرما۔یہ وہ زمانہ ہے جب بہار میں ایم۔وائی کی جوڑی سیاست میں دھوم مچا رہی تھی۔ایک دن انیل شرما اور شوبھا کی لو اسٹوری میں رقابت کی جنگ ہوتی ہے اور وہ گوالا کے بجائے اپنے دوست انیل شرما کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔

''اِس سالے کو دیکھو، یہ میاں ہے سالا؟ یہ بھومیہار کا ساتھ دیتا ہے؟ سالا بھومیہار کا ساتھ دیتا ہے''

فیضان اُس وقت وہاں نہیں تھا، بعد میں پہنچا۔اسماعیل نے تفصیل بتائی تو وہ ہنسنے لگا۔اسماعیل پر جھنجھلاہٹ طاری ہو گئی۔'اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟

ارے یار! وہ سالا عشق کا معاملہ ہے، اس میں تم بلاوجہ کود گئے۔

مگر وہ لڑکا بھومیہار بھومیہار کیا کر رہا تھا؟

وہ لڑکا گوالا ہے، بہار میں مسلمان گوالوں کے ساتھ ہیں اور گوالا بھومیہار کے خلاف ہے۔اب تم گوالے کے خلاف جا کر اور بھومیہار کے ساتھ ہو کے لڑنے لگے تو اُس پر جھلاہٹ تو طاری ہونی ضروری تھی۔

یہ ایک نیا منظر نامہ تھا اور اسماعیل کو جگہ جگہ اس کا سامنا کرنا پڑا'' (ص۔۹۴)

یہ وہ منظر نامہ ہے جسے بہار کی حالیہ سیاست میں مرکزیت حاصل تھی۔ مسلمان اقتدار میں حصہ داری کے نشے میں جھوم رہے تھے۔ کالج کے ریزلٹ سے نوکری تک گوالوں کی حصہ داری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اور اس کے لئے جواز یہ دیا جا رہا تھا کہ جب تک برہمنوں، راجپوتوں اور بھومیہاروں کی چلی گوالوں کو تیسرا درجہ بھی نہیں دیا گیا، اب موقع ملا ہے تو کیوں نہ فائدہ اٹھائیں؟ اور رہی مسلمان کی تو وہ اسی میں خوش تھا کہ وزیر اعلیٰ اس کے بنائے کباب کھا رہے ہیں، بی جے پی کو کھری کھری سنا رہے ہیں اور خانقاہوں، مزاروں کی تقریبات میں ٹوپی پہن کر شریک ہو رہے ہیں۔ اس میں کوئی فرق نہ کر سکا کہ وہ ٹوپی پہن رہے ہیں یا پہنا رہے رہیں۔

دوسرا منظر: جو کاسٹ لائن گوالوں اور مقابل اعلیٰ ذات کے درمیان پیدا ہوئی تھی وہ بڑھتے ہوئے اس منزل تک پہنچ گئی کہ گوالہ گردی اور نکسل تحریک سے مقابلہ کے لئے سن لائٹ سینا، ایم سی سی اور گولڈن آرمی جیسی سینائیں وجود میں آگئیں۔ اسماعیل فیضان رسول کے ساتھ 'میران بیگہ' کا سفر کرتا ہے تو اس کے سامنے ایک اور دنیا آتی ہے جہاں ہندستان کی ۸۵ کروڑ جنتا دلت ٹولے میں ملتی ہے، شیو چرن سنگھ کا قتل چونکاتا ہے، ایم سی سی اور گولڈن آرمی میں پسماندہ بنام اعلیٰ نسب اقوام کا مقابلہ جنگ کی صورت اختیار کرتا ہے اور اس جنگ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے منہ میں زبان آجاتی ہے جو صدیوں سے گونگے تھے۔ اور اس طرح اپنا ہندستان بدل رہا تھا:

> ''کمیونزم کے بارے میں وہ سنی سنائی باتیں افصح صاحب پر پٹخنے لگا تو وہ بولے، دیکھو موجودہ منظر نامے کو تم صرف کمیونزم کے واسطے سے نہیں سمجھ سکتے۔ ہندستان میں کچھ اور فکری دھارائیں بھی زیریں لہر کی طرح کام کر رہی ہیں، لوہیا جی نے سماجی انصاف پر جو تھیوری پیش کی ہے اس میں انہوں نے بہت صاف صاف لکھا ہے کہ ہندستان میں طبقاتی جدو جہد کو کاسٹ اورینٹڈ ہونا ہی پڑے گا۔
>
> 'آپ کھلم کھلا ذات پات کی حمایت کر رہے ہیں'۔ اسماعیل نے بہت زور سے بدک کر کہا۔ تس پر وہ ہنسے اور بولے۔ 'گاندھی میدان کے ایک بڑے جلسے میں جے پرکاش نرائن نے کھلے عام کہا تھا۔'' سوال سماجی انصاف کا ہے، وہ جس راستے سے آسکے، اسی راستے سے اُسے لانا چاہیے۔''

تیسرا منظر: سیاست جب رنگ بدلتی ہے تو اس کے اثرات دور پا اور دیر پا ہوتے ہیں۔ بہار کی

سیاست نے جہاں سماج کو فکر سطح پر بدل دیا وہیں انتظامی سطح پر بھی تبدیلیاں پیدا کیں۔ ساتویں باب میں ناول نگار نے مثال کے طور پر تعلیمی اداروں میں پیدا ہونے والی صورت حال کا منظر نامہ پیش کیا ہے۔ حکومت نے ۱۹۷۰ سے پہلے کے قائم کئے ہوئے کالجوں کو کنسٹی چوینٹ کرنے کا اعلان کر دیا تو ایک طرف انتظامی مسائل پیدا ہوئے اور دوسری طرف رشوت خوری، اقربا پروری کا بازار گرم ہو گیا۔ صلاحیت کی بجائے طاقت، غنڈہ گردی، پیسہ اور سیاست نے آگ پکڑ لی۔ پچھلے دروازے سے تقرری، فرسٹ پوسٹ، سیکنڈ پوسٹ کی لڑائی میں رشوت دینے والے کی فتح، تنخواہ میں کٹوتی کی تلوار، پروفیشنل کورسز کو بڑھاوا دے کر پیسہ اگاہی کا راستہ بنانا اور دھیرے دھیرے کالجوں سے علم کا غائب ہو جانا، اس منظر نامے کے اہم حصے ہیں:

''اُس رات اسماعیل کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ پہلی مرتبہ اُس کو اپنے پیشے سے اکتاہٹ محسوس ہوئی۔ یہ کیسی نوکری ہے جس میں غنڈہ بدمعاش جاہل لفنگا سب گھس جاتا ہے۔ اگر اسی طرح لکچرر پروفیسر بنا جا سکتا ہے تو اتنی محنت، اپنے سبجکٹ کے بارے میں حاصل کی جانے والی مہارت، برسہابرس سے دن کا چین اور رات کا آرام حرام کر کے سارا شوق مار کر، کوڑی کوڑی بچا کر، اپنے سبجکٹ میں آنے والی نئی نئی کتابیں خریدنے کی اور گئی رات تک جاگ جاگ کر پڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟ سب محنت کرنے والے گدھے ہوئے، ارون بھاٹیہ جیسے لوگ ہی عقلمند ہوئے نا، کہ ہلدی لگی نہ پھٹکری رنگ آیا چوکھا۔'' (ص۔۱۳۹)

چوتھا منظر: ہم عصر ہندستان کو ایک نئے رنگ میں رنگنے والا خوفناک واقعہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو وقوع پذیر ہوا جب بھیڑ جمع کر کے بابری مسجد شہید کر دی گئی۔ یہ ایک زوردار جھٹکا تھا اُن لوگوں کے لئے جو ملک کی جمہوری قدروں کے امین تھے۔ مگر مصنف نے کمال فنکاری سے شہادت کا واقعہ بیان کرنے کے بجائے معاشرے کی فکری صورت حال پر توجہ دی ہے۔ ''ایسی فضا کو کیا کہا جائے جس میں حبس ہو نہ کشادہ ہو''۔ ایسی صورت حال میں کیا کیا جائے جب یہ ثابت ہو جائے کہ کچھ ثابت نہیں ہو سکتا۔'' یہ جمہوریت ہے یا جمورے کا تماشہ؟ کسی نے اسے مسلمانوں کی بداعمالی کا نتیجہ قرار دیا تو کسی نے مذہبی منافرت کے شعلوں کو ہوا دی۔ بات آستھا، عقیدے سے ہوتی ہوئی مذہب اور تصوف تک پہنچ گئی مگر نتیجہ یہی نکلا کہ نجات ۔۔ سیاست، مذہب، عقیدہ اور تصوف کے بجائے بھگتی اور تصوف کی آمیزش میں ہے جو بت پرستی اور خدا پرستی سے زیادہ انسان پرستی کی راہ دکھاتی ہے۔ اور

جو کہتی ہے۔

مجھ سے کہا جبریل جنوں نے، یہ بھی وحی الٰہی ہے   مذہب تو بس مذہب دل ہے، باقی سب گمراہی ہے۔ مگر کسی کو یہ بات آسانی سے کب سمجھ آئی ہے۔ عام آدمی نہ تالا کھلوانے سے فکر مند ہوا اور نہ دیواروں کے ٹوٹنے سے متاثر ہوا، پن چکی چلتی رہتی ہے۔ اور لوگوں کے پاس اپنے مسائل کم ہیں کہ وہ پیٹ بھرے نیتاؤں، واعظوں اور مقرروں کی طرح مذہب، زبان اور تہذیب کے نام پر اپنی روٹی سینکیں؟ وقت کے ساتھ سب بھول گئے اور صورت حال یہ ہے کہ:

''عمارت گری پڑی ہے، کچھ لوگ تو دب کر مر ہی گئے، باقی گرتے ہوئے ملبے سے چوٹ کھا کر زخمی ہوئے، اور بہت سارے عمارت کے گرنے سے دُکھی ہوئے، کچھ زخمی ابھی تک کراہ رہے ہیں، بہتوں کا ہاتھ عمارت کے نیچے دبا ہے، کچھ کا پیر پھنسا ہے اور کچھ کی املاک تباہ ہوگئی ہیں۔ مگر صورت حال جیسی تھی ویسی ہی ہے کیوں کہ مالکان اصلی اور کاشت کارانِ اصلی دونوں کو کسی نے سمجھا دیا تھا کہ عمارت کے نیچے خزانہ دفن ہے۔ اس لئے دونوں ہی اس عمارت کی ملکیت کے دعوے دار ہیں اور وہ منہدم عمارت، عمارت کے درجے سے آگے بڑھ کر ماں بن گئی ہے۔ حیات اللہ انصاری کی 'آخری کوشش' والی ماں!'' (ص۔۲۷۳)

پانچواں منظر: بہار میں انتخابات کا موسم بڑے برے موسم کے روپ میں شمار کیا جاتا ہے۔ دوسرے صوبوں میں ہوسکتا ہے یہ صورت حال نہ ہو اور لوگ بخوشی الیکشن ڈیوٹی کرتے ہوں، مگر بہار میں یہ عذاب سمجھی جاتی ہے اور پرائمری اسکول سے کالج کے پروفیسر تک سب اس کوشش میں لگ جاتے ہیں کہ دامے، درمے، قدمے، سخنے جیسے بھی ممکن ہو اس ڈیوٹی سے نجات حاصل ہو جائے۔ غیر تدریسی ملازمین کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ سارے کام ٹیچروں سے ہی کروا لیے جائیں۔ ڈیوٹی سے نام کٹوانے سے انتخاب کے بعد ووٹوں کی گنتی تک جتنے مراحل ہیں وہ پل صراط سے کم نہیں۔ حسین الحق خود پروفیسر رہے ہیں، اور دوران ملازمت انہیں اس جہنم زار سے گزرنا پڑا ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے الیکشن ڈیوٹی، ووٹ اور ملازمت کی مجبوریوں میں پھنسے ایک شریف انسان کی بے بسی، ذہنی کرب اور اذیت کو بڑے حقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے سیاست، ووٹ بینک اور بوتھ قبضے کے ذریعہ فتح حاصل کرنے کے سیاسی کھیل پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ ایک منظر دیکھئے:

''اسکول کے باہر لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ ہر پارٹی والے اپنے دو چار

> سور ماؤں کے ساتھ موجود تھے۔ رکشہ والے عورتوں کو اور کبھی کبھی بوڑھوں کو بھی لے کر آتے اور اسکول سے ذرا دور پر اُتار کر پھر محلے کے اندر چلے جاتے۔ اسماعیل کو یاد آیا کہ پارٹی والوں کی طرف سے ووٹروں کو آنے جانے کی یا کسی قسم کی سہولت دینا اب الیکشن کمیشن کی طرف سے غیر قانونی قرار دیا جا چکا ہے۔ مگر اسماعیل دیکھ رہا تھا کہ رکشے آ جا رہے تھے اور کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ تھا۔۔۔۔۔ وہ ایک پولنگ ایجنٹ سے پرچی بنوانے لگا۔ اچانک اسکول کے اندر سے پہلے تڑاتڑ لاٹھی چلنے کی آواز آنے لگی، اور پھر ہوائی فائر ہوا۔'' (ص۔۲۰۴)

بوتھ کیپچرنگ، قتل و غارت گری، گالی گلوج یہاں الیکشن کے لازمی عناصر ہیں جن کے درمیان عام انسان، شریف انسان خاموشی کے ساتھ پِستا رہتا ہے۔ یہ منظر اشارہ ہے اُس صورت حال کا جس میں زباں بندی کا غیر اعلان شدہ حکم جاری ہو چکا ہے۔ آدمی کتابی، قانونی اور اصولی باتیں دماغ میں دہرا تو سکتا ہے، زبان پر ہرگز نہیں لا سکتا۔

> ''میں اسماعیل رضا ولد ابراہیم رضا بابری مسجد کے گرنے پر کچھ نہیں کر سکتا۔ شاہ بانو کیس کی بے معنویت پر اپنے ہم مذہبوں سے کوئی مکالمہ نہیں کر سکتا، الیکشن (ووٹ) دیتے ہوئے بلاوجہ گرفتار کر لینے پر اور دن بھر کے لئے حراست میں ڈال دینے پر کچھ نہیں کر سکتا۔ یہاں اجماع چاہئے۔ بھیڑ، جاہلوں کی یا ایسے پڑھے لکھے لوگوں کی جنہیں جاہلوں کی بھیڑ پڑھا لکھا مان لے۔ یہاں ایک آدمی کی تنہا رائے کا کوئی معنی نہیں بنتا۔ جمہوریت وہ طرز حکومت ہے۔۔ (ص۔۲۰۶)

چھٹا منظر: یہ منظر وہ ہے جو ہمارے مشاہدے اور تجربے کا حصہ بن چکا ہے۔ رشوت خوری، اقربا پروری اور فرقہ پرستی سرکاری دفتروں اور وہاں کی ہر فائل سے جونک کی طرح چمٹ کر رہ گئی ہے۔ گپتا جی ہوں یا یادو جی، سنگھ صاحب ہوں یا اسماعیل صاحب، سب اسی جونک کا شکار ہیں۔ دفتروں میں معمولی سی فائل بھی بغیر چائے پانی کی آگے نہیں کھسکتی۔ جسے چاہا اور جب چاہا، حکومت نے پروموشن دے دیا اور جب چاہا جسے چاہا ڈیموٹ کر دیا یا برطرف کر دیا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ مگر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ حکومت اور سیاست نے مداری اور اس کے کھیل کی شکل اختیار کر لی۔ کانگریس کی مخالفت کے بعد اقتدار کی ہوس نے جگلروں کو پیدا کیا جنہوں نے مذہب اور فرضی ہندو مسلم تہذیب و تشخص کا شوشہ چھوڑ کر تمام

ہندستانیوں کو الگ الگ خانوں میں بانٹنے کا ایسا کھیل شروع کیا جس نے سماج میں ایک خوفناک اور بھیانک صورت حال پیدا کر دی۔ ایسے میں زندگی سے انسان کا سروکار صرف جینے کی حد تک رہ گیا اور وہ اسی میں مطمئن ہے کہ کم از کم غیر فطری موت سے تو دور ہے:

''سیماب نے اسی جوکھم کا ذکر کرتے ہوئے توفیق کی وہ بات بھی دہرائی تھی کہ ''اب یہاں ہندو مسلم فساد نہیں ہوتا''۔ اور اس بات پر اسماعیل کو ممبئی کا وہ ملنگ دوست یاد آیا، جس نے بہار لوٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''بہار ایک پرسکون صوبہ ہے۔ وہاں فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوتا''۔ کیا انسانی سروکار میں سب سے بڑا عنصر جینا ہے؟ پاگل، مفلوج اور مند بدھی والے بھی تو جیتے ہیں۔ (ص۔۲۱۸)

اور اس مفلوج اور مند بدھی سماج میں اگر کوئی اپنا سروکار ذہن و فکر سے قائم کرتا ہے تو اسے اس قسم کے سوالات پریشان کرتے ہیں۔ کیا زندگی کا مقصد صرف سانس لینا ہے؟ کیا انسان کی منزل صرف روٹی ہے؟ کیا کسی ایک ہی پھول سے باغ بن جاتا ہے؟ کیا آدمی کو رنگ برنگے پھولوں کی اب کوئی ضرورت نہیں ہے؟ کیا سچ مچ کسی ایک پھول اور خوشبو کے علاوہ باقی سارے پھول اور خوشبوئیں صرف باہر سے برآمد کی ہوئی ہیں؟ کیا اس رویے کے بغیر بھی جینے کی کوئی راہ ہے؟ مگر موجودہ صورت حال کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس نے ایسے سوالوں سے جوجھنے والے ذہنوں کو قید کر لیا ہے۔

ساتواں منظر: اس منظر کے کئی شیڈز ہیں جو ہمارے معاشرے کی مذہبی، تعلیمی اور سیاسی صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں۔ زوال روس کے اثرات، مذہبی جماعتوں کے فروغ اور مدارس کے دقیانوسی نظام تعلیم وغیرہ پہ مصنف نے نہ صرف بحث کی ہے بلکہ اس سے وابستہ قوم کی ذہنی و معاشی پسماندگی سے بھی روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ مدرسے میں عام طور پر غریب طبقہ تعلیم حاصل کرتا ہے، جو وہاں نہ جاتا تو پاکٹ ماری، چوری چکاری کرتا یا رکشہ چلاتا، بیڑی بناتا اور مزدوری کرتا۔ یہاں خوش حال طبقے کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ صدیوں پہلے فٹ بال کا کھیل وہاں بچوں کی تفریح کا سامان تھا، وہ اب بھی ہے ٹھیک ویسے ہی جیسے صدیوں سے ان کا نصاب تعلیم۔ کرکٹ، بیڈمنٹن وغیرہ سے وہ اب تک کیوں متعارف نہ ہو سکے؟ بہار سے مہاراشٹر تک پورے ہندستان میں ایک ہی طرز تعلیم کیوں ہے؟ سالہا سال سے اس میں تبدیلی کی کوئی ضرورت کیوں نہیں محسوس کی گئی؟

''اسے درخت یاد آئے جو ہر سال اپنی چھال بدلتے ہیں، پرندے یاد آئے جو اپنے پر

جھاڑتے ہیں، جاندار جسم یاد آیا جو اندر سے باہر تک لگاتار اپنے کو ادلتا بدلتا رہتا ہے۔
مگر یہ لوگ؟ اسے شتر مرغ یاد آیا، جو ریت میں سر چھپا کر سمجھتا ہے کہ طوفان ٹل گیا۔
یا وہ مینڈک جو کنویں میں رہتا ہے اور کنویں کو ہی سمندر سمجھتا ہے۔'' (ص۔۲۴۴)

آٹھواں منظر: یہ منظر آج کا ہے جس میں نتیش مودی کی دوستی، سوشاسن بابو اور بی جے پی کی حکمت عملی، پردھان منتری کی آمد، گاندھی میدان کا بم دھماکہ، افضل گرو، جے این یو، موب لنچنگ، اخلاق کی موت اور وہ سب کچھ ہے جو ہماری زندگی، سماج اور ملک کے بدلتے منظرنامے کی علامت ہے۔ ۴اویں باب سے ۲۳ویں باب یعنی اختتام تک ناول ہمیں اپنے آپ سے ملواتا ہے۔ یعنی آج کے موجودہ منظرنامے سے جہاں پٹنہ، بہار اور ملک کی صورت بدل چکی ہے۔ بے روزگاری منہ بائے کھڑی ہے، نوجوان باہر بھاگ رہے ہیں، فارورڈ بیک ورڈ اور ریزرویشن نے معاملہ اور پیچیدہ کر دیا ہے، فرقہ وارانہ عصبیت شہر سے بڑھتے ہوئے گاؤں کی مسجد، خانقاہ اور قبرستانوں تک پہنچ گئی ہے، ذات پات کی لعنت نے غیر مسلموں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، نکسل موومنٹ میں پسماندہ مسلمان بھی شامل ہو رہے ہیں اور بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اب گاؤں میں ان کی میٹنگیں بھی ہو رہی ہیں۔ اور اس سب کے درمیان ایک نعرہ امید کی طرح شہرت حاصل کر رہا تھا کہ اچھے دن آئیں گے۔ مگر اچھے دن کے لئے جو راستہ اختیار کیا گیا اس سے معلوم ہوا کہ وہ نعرہ عوام کے لئے نہیں خود کے لئے لگایا گیا تھا۔ عوام کو تو اُس آگ میں جھونک دیا گیا جس کا شکار اسماعیل، فیضان، اخلاق اور جنید جیسے لوگ ہوئے۔

''گئو رکچھا۔۔ وندے ماترم۔۔ رام مندر۔۔۔ انہی آوازوں میں کچھ اور آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔۔۔ اسلام واحد راہ نجات۔۔۔ کافروں سے قتال کار ثواب۔۔۔ پھر فضاؤں میں جھنڈے لہراتے ہیں۔ ہندو واہنی۔۔۔ بجرنگ دل۔۔۔ گئو رکچھا سمیتی۔۔۔ شیو سینا۔۔ آر ایس ایس۔۔ جھنڈوں کے چیختے چلاتے رنگوں میں۔۔۔ بیچ بیچ سے کچھ مدھم ہم رنگ سر اٹھاتے۔۔۔ مجلس اتحاد المسلمین۔۔۔ سیمی۔۔۔ انڈین مجاہدین۔۔۔ قیدار ایک طرف سے نظر چراتا تو دوسری سمت کچھ ایسا تھا جو راستہ روک کے کھڑا ہو جاتا۔۔۔ ہر طرف اونچی اونچی دیواریں۔۔۔ ہر دیوار پر جھنڈے۔۔ ہر دیوار کی ہر اینٹ سے گندا خون اُچھلتا کودتا باہر آتا۔ (ص۔۲۶۹)

صورت حال پہلے بھی خراب ہوئی تھی مگر اُس زمانے میں خون خرابے کی نوبت کم آتی تھی، دلوں

میں دیواریں قائم نہیں کی جاتی تھیں ۔ جنگ کے بعد بھی دل ملے رہتے تھے یہاں تک کہ رشتے داریاں قائم ہو جاتی تھیں ۔ ہولی، دیوالی سے مسلمان اور شب برات محرم سے ہندو الگ کب اور کیسے ہو گئے یہ کوئی محسوس نہ کر سکا۔ صورت حال کے بھیانک پن میں اضافہ ہی ہوتا گیا، یہاں تک کہ تاریخ ،تہذیب اور عشق کی ساری داستانیں بدل دی گئیں ۔

مذکورہ بالا مناظر سے سب سے پہلے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ مصنف نے گذشتہ پچاس برسوں کے دوران ہمارے عہد اور معاشرے کو متاثر کرنے والی بیشتر ناہمواریوں پر گہری نظر ڈالی ہے۔ کبھی تجربے کی صورت میں اور کبھی مشاہدے کا سہارا لے کر انہوں نے صوبہ بہار کے ان چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی ناول کا حصہ بنایا ہے جن کا تعلق ہمعصر علاقائی صورت حال سے تو ہوسکتا ہے، قومی یا عالمی تاریخ سے قطعی نہیں۔ مثلاً کالجوں کا کنسٹی ٹیوینٹ ہونے کا معاملہ، رنجن یادو کا سیاسی عروج، کوچنگ کلاسز کا کھیل، بوتھ کیپچرنگ، الیکشن ڈیوٹی کی بوالعجبیاں اور شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی کی منتقلی وغیرہ ۔مگر ناول محض ان واقعات کا بیان نہیں۔ یہ مصنف کے گہرے سماجی، سیاسی اور تہذیبی شعور کا عکاس بھی ہے۔ یہ اُس قوم کی داستان بھی ہے جو گذشتہ کئی دہائیوں سے نفرت، فرقہ پرستی اور دشمنی کا عذاب جھیل رہی ہے۔ وہ عذاب جو اُس پر صدیوں سے شکلیں بدل بدل کر نازل ہوتا رہا ہے کیوں کہ محبت اور نفرت، ظلم اور رحم میں ازل سے جنگ جاری ہے، بس ان کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد عذاب کی ایک اور صورت سامنے آئی اور اس نے محبت کرنے والوں کے لئے زمین تنگ کر دی۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ اس صورت حال کو انہوں نے تاریخ کے بجائے فلسفے کی زبان دی ہے جو فکشن کو بڑا بناتی ہے اور بلیغ علامتوں، استعاروں اور اشاروں کے سہارے فلسفۂ حیات کی سفاکیوں اور نزاکتوں کو دل پذیر انداز میں پیش کرتی ہے۔

مرکزیت بہار اور مسلمان ہونے کے باوجود اس ناول کو علاقائی یا مخصوص معاشرے کا ناول نہیں کہا جا سکتا۔ صرف اس لئے نہیں کہ اس میں بھیونڈی، ایودھیا اور ممبئی کا بھی ذکر ہے یا مرکزی کردار اسماعیل، فیضان ،قیدار اور نائلہ ہیں۔ ان کے ساتھ بہت سارے کردار اپنے تفاعل کے ساتھ موجود ہیں۔ مبشر رجائی، میاں والا، بنسی دھر، رمیش، رکمنی، دلبیر سنگھ، انیل شرما، مجمدار، ٹوپو اور شوبھا وغیرہ سب کے سب ناول کا ناگزیر حصہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ اسماعیل، فیضان، قیدار اور نائلہ کے ساتھ ساتھ ان میں سے بھی اکثر اپنے فکر و عمل کے ذریعہ ایک اچھا ہندستان بنانے میں مصروف ہیں۔ اس لئے یہ ہندستانی معاشرے اور معاشرت کا ناول ہے۔ اس ہندستانی معاشرے کا جس کی معاشرت کو آزادی کے ستر سال کے بعد اس طرح بے جان کر دیا گیا ہے کہ اس کی

حالت منٹو کے افسانہ' کھول دو' کی سکینہ جیسی ہوگئی ہے۔ یہ دردناک مگر بلیغ علامتی منظر دیکھئے:

''وہ آیا، کھانا کھایا، دیر تک بلو فلم دیکھی، گندے گانے سنے اور اس کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔اس نے سکینہ کی طرح اپنا ازار بند کھول دیا۔ یہ آزادیٔ وطن کے بعد کی سترویں رات تھی'' (ص۔۳۲۸)

اس معاشرے میں انسانوں کے انسان پر مسلط ہونے اور اقتدار پانے کا جنون ہے جس نے اسے وحشی بنا دیا ہے۔وحشی انسان طبقاتی ٹکراؤ، مذہبی شدت پسندی اور تاجرانہ ذہنیت کا سہارا لے کر سماج پر راکشش کی طرح حاوی ہو گیا ہے، جس کے نیچے انسانیت، عشق، دردمندی، محبت دبی کراہ رہی ہے۔

''اماوس میں خواب'' موضوع کے علاوہ اپنے بیانیہ کی وجہ سے بھی قابل توجہ ہے۔اس کا بیانیہ بہت عام ،سپاٹ اور سادہ نہیں ہے۔کہیں شعری بیانیہ متاثر کرتا ہے تو کہیں استعاراتی اسلوب دامن دل کھینچتا ہے۔کبھی تجریدیت ملتی ہے تو کبھی سفاک حقیقت نگاری ہیجان پیدا کرتی ہے۔ناول کا اسلوب ابہام اور صراحت کا آمیزہ ہے۔شروع سے ہی ناول نگار دو متوازی بیان لے کر آگے بڑھتا ہے۔ایک بیان عشق کا ہے اور دوسرا تاریخ و سیاست کا۔کبھی ایک میں آگے بڑھتا ہے اور دوسرے میں پیچھے،کبھی ایک کو چھوڑتا ہے اور کبھی دوسرے کو۔مگر وہ رکتا نہیں ہے۔کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو بات چھوٹ گئی وہ شاید ادھوری رہ گئی،مگر دوسرے یا تیسرے باب میں جا کر اس کا سرا مل جاتا ہے اور بیانیہ کے ساتھ پلاٹ کا ادھورا پن بھی تکمیل کی جانب گامزن ہو جاتا ہے۔یہ بیان کا انوکھا انداز ہے جو مطالعے کے لئے ذہین قاری کا تقاضا کرتا ہے۔مثلاً یہ اقتباس دیکھئے:

''اور پھر تمکنت جس نے مرنے سے پہلے خط لکھا تھا، مجھے کینسر ہو گیا ہے، میری کیموتھیراپی ہوئی ہے، میرے سب بال اڑ گئے ہیں۔۔۔مجھے بھولنا چاہتے ہو تو ایک بار آ کے دیکھ لو۔۔۔کہتے ہیں پہلا پیار اور آخری پیار سانس ٹوٹنے تک ساتھ نبھاتا ہے۔کانگریس ہندستانی مسلمانوں کا پہلا پیار ہے، کانگریس بھی جانتی ہے کہ ہندستانی مسلمان لاکھ بدکیں مگر جائیں گے کہاں۔انہیں بھی شاید یقین تھا کہ اسماعیل نامی شخص اُن سے چھوٹ کر زندہ نہیں رہ سکے گا۔اور سچ بھی یہی تھا،وہ تو ساری زندگی ان کے ناز سہتا رہا۔غیر کانگریسیوں نے تو مسلمانوں کو کانگریس کی داشتہ تک کہہ دیا۔اور تمکنت؟ جو مر گئی۔اور پاکستان جو صرف مرا نہیں،اس کی لاش کو بیچ سے دو ٹکڑے کر دیا گیا۔(۲۳)

مگر مکمل ناول اس ایک بیانیہ پر منحصر نہیں ہے۔ واقعات جس صورتحال سے گذرتے ہیں، بیانیہ بھی اسی کے مطابق بدل جاتا ہے۔ آزادی کے بعد سے بھیونڈی کے فسادات تک چونکہ اسماعیل فکری اور عملی دونوں اعتبار سے اضطراب، کشمکش اور بے یقینی کی صورت حال سے گزرتا ہے اس لیے بیانیہ بھی پیچیدہ اور پریشان کن ہے، مگر جیسے ہی اسماعیل پٹنہ پہنچ کر مطمئن ہوتا ہے بیانیہ بھی سادہ، پرسکون اور عام فہم ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے ناول کے ابتدائی ۷۵ صفحات سے گزرنا آسان نہیں، اور اگر اس سے گزر گئے تو پھر اسے چھوڑنا ممکن نہیں۔ اسی طرح تمکنت، شوبھا اور نائلہ کے عشق کے مناظر بھی بیانیہ کے مختلف رنگ پیش کرتے ہیں۔ شعری بیانیہ کی ایک مثال دیکھئے

> ''وہ آ رہی ہیں۔۔۔ ایک وہم سا ہوا۔۔۔ کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ آ رہی ہیں۔ برف یا روئی کے گالے سے تیار کی ہوئی فضا میں سنہرے گل بوٹے ٹکے ہوئے تھے اور جگنوؤں کو حکم دیا گیا تھا کہ تم سارے میں جگمگاتے پھرو اور چاند نے منادی کی تھی کہ ابدالآباد تک میں اس فضا پر چاندنی بکھیروں گا اور غیب الغیب سے ایک فرمان جاری ہوا تھا کہ سورج اپنی تپش کو اس جلسے سے دور رکھے۔ الٰہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے، جہاں حوران بہشتی کا مجمع دف پر گا تا تھا۔۔۔ چوں پردہ برافتد۔۔۔ چوں پردہ برافتد۔۔۔ اور پردہ ابھی اٹھا نہیں تھا۔ حریری پردوں کی نرم سرسراہٹ نرم بھی تھی اور ریشم جیسی کومل بھی، پردے ساکن نہیں تھے، مگر اُٹھ بھی نہیں جا رہے تھے۔ اہتمام یہ تھا کہ کچھ چھپا بھی رہے، کچھ جھلملاتا بھی رہے، ایسے ستر پردوں کے پرے وہ ساعد سیمیں ایک مستانہ سی بوجھل اور سرشار کیفیت میں مکیف ہوئیں کہ ماتھے پر ان کے شکنیں صف تشنگاں تھیں اور بھویں طلب کی آگ میں جل کر زلف زلیخا کی مانند سیاہ اور آنکھوں کی پتلی میں سیاہی تھی، سفیدی تھی، شفق تھی، ابر باراں تھا۔'' (ص۔۳۱)

اس ناول میں جہاں موجودہ زمانے کی حسیت یعنی روح عصر ہے وہیں وہیں بھرپور جذباتیت اور مادیت و روحانیت کے درمیان پھنسے ہوئے فرد کی چھٹپٹاہٹ بھی ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان سے ناول نگار کا مخصوص نقطۂ نظر سامنے آتا ہے کہ زندگی کو جذباتیت، حقیقت، عصریت، علمیت، فلسفہ یا کسی قسم کے نظریے کی ضرورت نہیں۔ اسے صرف ہم سفر کی ضرورت ہے جو عشق سے حاصل ہوتا ہے۔ گویا عشق زندگی کی طرح اس ناول کا سرچشمہ ہے۔

آزادی کے بعد کا عرصہ واقعات و حادثات کے اعتبار سے ہنگامہ خیز رہا ہے۔ ہر دن نیا سورج

اور ہر شب نئی تاریکی کے ساتھ آئی ہے۔ حسین الحق کا حوصلہ قابل قدر ہے کہ انہوں نے حالات کو نظر انداز کرنے کے بجائے اس کی سچائی سے ہمیں روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ مذہب، تصوف اور ترقی پسندی جیسے تمام نظریات و افکار کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے قاری کو جو دعوت فکر دی ہے وہ فوری طور پر اثر پذیر ہو یا نہ ہو ،اسے غور وفکر پر ضرور مجبور کر دیتی ہے۔اور اس لحاظ سے یہ ناول ہم عصر فکشن میں اپنا انفراد و امتیاز قائم کر لیتا ہے۔

اوپر جو مناظر پیش کئے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناول کا کینوس بہت وسیع ہے اور شاید پورے ہندستان کا احاطہ کرتا ہے۔ناول نگار نے مالیگاؤں، بھیونڈی، دہلی، ممبئی اور پٹنہ کا ذکر کر کے اس کے کینوس کی وسعت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔ازموں کا ٹکراؤ، ذات پات کی جنگ، مذہبی تفریق اور سیاسی ریشہ دوانیاں کسی ایک جگہ تک محدود بھی نہیں۔مگر ناول کا بڑا حصہ صوبہ بہار کی عکاسی کرتا ہے۔لالو پرساد کا عروج، کالجوں کے حالات، الیکشن کے مناظر، الیکشن ڈیوٹی کی دہشت، کالجوں میں ریگولر کلاسز کا نہ ہونا، کوچنگ کی طرف توجہ کا بڑھنا، پٹنہ کالج اور ساحلِ گنگا کے مناظر، دربھنگہ ہاؤس، کالی مندر اور پٹنہ کے مختلف علاقوں کا تفصیلی ذکر اور شعبۂ اردو کی منتقلی وغیرہ اس طرح ناول میں در آئے ہیں کہ بین الاقوامی تہذیب و فلسفہ یا کم از کم قومی تغیرات کے پس منظر میں لکھے گئے ناول کے کینوس کو کچھ حد تک محدود کر دیتے ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ مقامیت آفاقیت میں پوری طرح تبدیل نہیں ہو پاتی اور پرسنل اُس طرح امپرسنل بن کر نہیں آپاتا جیسا حسین الحق کے ماقبل ناول 'فرات' میں سامنے آیا تھا۔مگر کسی بھی عہد کے تہذیبی، ثقافتی، مذہبی اور سیاسی مزاج کی تلاش کے لئے ارضی حوالہ تو ضروری ہے۔ غالباً مصنف نے سہولت کے کے لئے اپنی دیکھی اور بھوگی ہوئی زمین کو منتخب کیا ہے۔اسی طرح روشنی سہائے اور قیدار بن اسماعیل کی یکجائی اس بات کا اشارہ ہوسکتی ہے کہ مصنف کی نظر میں ہندستان کے محفوظ و خوبصورت مستقبل کے لئے ہندو مسلمان کے درمیان محبت یا کم از کم رواداری کا رشتہ ہی راہ نجات ہے مگر نائلہ اور رمیش سے وابستہ میلوڈرامائی واقعات کی پیش کش کا جواز کیا ہے؟ نائلہ کا دردناک انجام بھی تو اسے نمونۂ عبرت نہیں بنا سکا۔شاید یہاں مصنف کا منشا یہ بتانا ہے کہ اس پرخطر راہ میں ہر مسافر قیدار بن اسماعیل اور روشنی سہائے ہو یہ ضروری نہیں۔

مختصر یہ کہ 'اماوس میں خواب' دورِ حاضر کا منفرد اور نمائندہ ناول کہا جائے گا کہ اس میں آزادی کے بعد سے آج تک کی ہر لمحہ تغیر پذیر تہذیب تحریک اور ہر طرح کے بے معنی تماشوں کا مکمل منظر نامہ تخلیقی انداز میں موجود ہے۔اس میں سیاست، مذہب، دانشوری، تصوف، نظریات اور جبر کی قید میں پھنسے آج کے انسان کی چھٹپٹاہٹ اور ہم عصر صورت حال کی وہ چلتی پھرتی تصویر پیش کی گئی ہے جسے ہم معاصر ہندستان کا استعارہ یا آئینہ کہہ سکتے ہیں۔

سوئی کی نوک پر رُکا ہوا لمحہ: ایک جائزہ

شعیب نظام

موبائل : 6386179990

حسین الحق نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز اس دور سے کیا جب افسانے میں نئے نئے تجربات ایک فیشن بن چکا تھا علامت نگاری کا بول بالا تھا اور تجریدیت افسانے کا مخصوص موضوع و طرز بن چکا تھا۔ حسین الحق بھی ماحول کے اس اثر سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ انھوں نے بھی افسانے لکھنے کے لیے اسی طرز کو اپنا لیا لیکن اس طرز کو انھوں نے بہت سلیقے سے اپنایا اور جدید فکشن نگاروں میں اپنا مخصوص مقام حاصل کیا۔ ان کے افسانوں پر وجودیت کے سائے لرزاں ہیں۔ ہربرٹ ریڈ کے مطابق ایک سچا فن پارہ اپنی اصل ماہیت میں ہمیشہ وجودی ہوتا ہے۔

'سوئی کی نوک پر رکا ہوا لمحہ انھی جدید اثرات کے تحت لکھا گیا افسانہ ہے۔ پورا افسانہ تجرید اور علامت کی شکل میں ہے۔ لیکن افسانہ نگار کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ جو کہنا چاہتا ہے وہ قاری تک پہنچ گیا۔ کہانی کو ڈرامے کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ جس کا منظر کچھ اس طرح ہے کہ:

> ''تین شخص اسٹیج پر بیٹھے ہیں۔ اسٹیج کی کیفیت کچھ یوں ہے کہ یا تو کھلا آسمان ہے اور آسمان کے نیچے کچھ بھی نہیں ہے۔ یا چاروں طرف سے بند ایک ایسا ہال ہے جس میں آنے جانے کے لیے بھی کوئی سوراخ نہیں، یا شاید ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسری کیفیت ہو''۔

جس مقام کا تذکرہ ہے وہاں سامعین کے بیٹھنے کی جگہ سب کرسیاں الٹی پڑی ہیں میزیں الٹی ہیں اور تمام الٹی کرسیوں اور میزوں کا رخ اسٹیج کی مخالف سمت میں ہے۔ تینوں کردار ایک دوسرے کی پشت سے پشت ملائے ایک دوسرے کی مخالف سمت میں بیٹھے ہیں۔

افسانے کا موضوع وجودیاتی تشویش ہے اور یہ منظر جدید دور کے انسان کی زندگی کے انتشار اور المیہ کی علامت ہے۔ ہر انسان اس نفسی نفسی کے عہد میں ایک دوسرے سے مخالف سمت میں خود کو پانے کی جستجو میں سرگرداں ہے۔ اور یہی اس کی تمام تر الجھنوں کا سبب ہے۔ دوسرے منظر میں افسانہ نگار اسی نفسی نفسی اور وجودیاتی تشویش کو اس طرح بیان کرتا ہے:

بعض اوقات غفلت کی نیند سوتے ہوئے معاشرے کے چاروں طرف پھیلی ہوئی بے حسی انسان کے

حوصلے کو پست کر دیتی ہے۔

بھرتن تاو: چونک کر اور گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور شتمپیر کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے چیختا ہے۔۔۔تم۔۔تم کہیں تم وہی تو نہیں؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟ شتمپیر کو گلے سے پکڑ کر جھٹکا دیتا ہے) تم ہمارا باطن کھرچنا چاہتے ہو؟

سائیکرٹوفل جلدی سے دونوں کے بیچ آ جاتا ہے۔۔۔۔۔

یہ نہیں۔۔۔ یہ نہین۔۔۔۔۔۔ابھی اس کا موقع نہیں۔۔۔ہم سب ایک ہی کشتی پر سوار ہیں۔۔۔

شتمپیر سرگوشیوں میں بدبداتا ہے: ''اس کا قصور نہیں۔۔۔کوئی قصور نہیں۔۔۔حالات۔۔۔حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔۔۔ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔۔۔۔کچھ بھی نہیں۔۔

بھرتن تاوتاؤ ابھی تک ہانپ رہا ہے اور سرگوشی میں بول رہا ہے:

''ہاں میرا واقعی کوئی قصور نہیں۔۔۔ہم میں سے کوئی کسی کے بارے میں بھی یہ سوچ سکتا ہے۔۔۔تم اگر ہو تو میرے اعتراف یا انکار سے بے پروا ہو کر جب جو چاہو جیسے چاہو کر سکتے ہو۔۔۔کیسا گھناونا ہے یہ سب کچھ۔۔۔تعفن زدہ۔۔۔قابل نفرت۔۔۔۔وقت اپنی ساری بے حیائی کے ساتھ اپنے آپ کو کتوں اور سوروں کی کوکھ سے جنمانے میں مصروف۔۔۔فیصلوں کا یہ مضحکہ خیز ڈرامہ۔۔۔۔۔

افسانے کے یہ تینوں کردار جدید دور کے مشینی و صنعتی جبر کا شکار ہیں۔ یہ افسانہ عہد حاضر کے کرب و اضطراب کا استعارہ ہے۔ظلم جبر و استحصال جس کا سامنا اپنے اپنے طور پر ہر فرد کر رہا ہے اس اذیت کو افسانہ نگار نے کہانی میں ڈرامے اسٹیج اور تین کرداروں کے ذریعے علامتی انداز میں بیان کیا ہے۔

یہ افسانہ حالات حاضرہ کے سیاسی سماجی اور معاشرتی منظرنامے پیش کر رہا ہے۔جس کی آنچ شعور کی جلد پر محسوس کر سکتے ہیں۔اس احساس کو افسانے کے کردار کی زبانی حسین الحق نے اس طرح بیان کیا ہے:

بھرتن تاو: اب روشنی ہونی چاہیے

سائیکرٹوفل: کیا روشنی نہیں ہے؟

شتمپیر: شاید ہے یا شاید نہیں ہے

بھرتن تاو: اب ہوش میں آ جاؤ۔ فیصلے کی گھڑی قریب آ پہنچی، ٹامک ٹوئیاں مارنا تاریخی جرم ہے۔

''کل ایک لڑکا صرف اس لیے غضب کا شکار ہوا کہ اس نے محلے میں بجباتے پیخانوں اور نالیوں میں

لڑتے ہوئے سوروں کی لاشوں اور موتریوں کے تعفن سے بھرپور راستوں کا تذکرہ اپنے گھر سے باہر کردیا۔‘‘

زیر بحث افسانہ اپنے نفسیاتی مفاہمانہ کرب و اضطراب کے ساتھ عصری حسیت کو سموئے ہوئے ہے۔ یہاں compulsive مفاہمت میں احتجاج کا ایک شرارہ ہے۔ ایک دبی دبی سی چنگھاڑ ہے جس نے مطابقت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے:

سائکر ٹوفل: نوکروں کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟

بھرتن تاو: ان کا تذکرہ بہرحال فضول ہے۔ انھیں بھر پیٹ کھانا مل رہا ہے اور اب رستہ چلتے کوئی ان کا کھانا نہیں چھینتا کیا اتنا کافی نہیں ہے؟

سائیکر ٹوفل: کھانے کے علاوہ کوئی اور ضرورت؟

نوکر حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیتا ہے۔۔۔ جی۔۔۔ جی۔۔۔ جی؟؟

بھرتن تاو کا چہرہ غصے سے سرخ ہوتا ہے اور چیخ اٹھتا ہے

نیچ کمینے بے حس دور ہو جا۔۔۔ گیٹ آوٹ

شتمبیر: چہار سمت پھیلے ہوئے معصوم جنھیں تم نیچ کہتے ہو' یہی در اصل ریڑھ کی ہڈی ہیں نیو کی اینٹ۔۔۔ محل کے کنگورے کی سلامتی ان کے وجود کی احسان مند۔۔۔۔ اس سورج کے نیچے پھیلی ہوئی اس بھری پری کائنات میں مختلف رنگوں زبانوں اور اوہام کے اسیر۔۔۔۔ یہ وہ شاہکار ہیں جو 'نہیں' ہو کر بھی 'ہے' کے دائرے کے مرکزی نقطے کے ناز کا سبب۔۔۔ مگر روز ازل سے یہی شعور سے محروم۔۔۔ کچھ محدود لوگوں نے ہمیشہ بھیڑ بکریوں کو جدھر چاہا ہانکتے رہے۔۔۔ ہانکتے رہے۔۔۔ ہانکتے۔۔۔

اچانک سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے، چہرے پر شدید اندرونی کرب کی علامات، جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔۔۔ جیسے کچھ چاہ کر بھی کہنے پر قادر نہ ہو۔۔۔ رنگوں کی مختلف لہریں۔۔۔ چہرہ بدلنے لگتا ہے۔۔۔ کبھی ازل سے صلیب پر چڑھے کسی جھریوں بھرے بوڑھے کا عکس۔۔۔ کبھی خون کی طرح سرخ آفتاب کی تمازت کے نقوش۔۔۔ کبھی کبھی۔۔۔ کبھی کچھ۔۔۔

حسین الحق نے ایک نئے تجرباتی انداز میں زندگی کے تلخ رویوں مجبوریوں اور بے چینیوں کو افسانے کے تار و پود میں سمو دیا ہے۔ سچے اور آنکھوں دیکھے کرب ناک تجربوں کو علامت کے پیکر میں افسانوی قالب میں منتقل کرنا بڑا کٹھن مرحلہ ہے جسے افسانہ نگار نے کامیابی کے ساتھ طے کیا ہے۔ انسان نے اپنی مجبوریوں اور بے بسی کے

باعث جو بے حسی اختیار کی ہے اس کا بیان حسین الحق نے اس طرح کیا ہے:

سائیکرٹوفل :اس طرف منہ کر کے کھڑا ہے جدھر اگر سامعین ہوتے تو بیٹھتے۔اچانک سائکرٹوفل بولنے لگتا ہے:

یہ واقعی تمہارے اسٹیج پر سے غائب ہونے ہی کا عہد ہے' تمہارا وجود کیا معنی رکھتا ہے؟ آلسی بے شرم، انپڑھ، بے حس، بے عقل،۔۔۔کل جب تم تھے تب بھی تم نہیں تھے، تمہارے دماغ میں تو ہمیشہ سے بھونسہ بھرا رہا۔۔۔۔تم جو نہیں ہو' سن سکو تو سنو کہ یہاں ایک تو اپنے ہی جذبات کی شدت کا شکار ہے' اس کی جذباتیت کا صدا یہی عالم رہا کہ یہ شروع تو ہوتا ہے پوری طاقت، توجیہ، تیقن اور دلیل کے ساتھ لیکن کچھ ہی دور چل کر رنگوں کا قیدی بن جاتا ہے۔یہ اس کی پوری قوم کا المیہ ہے۔۔۔یقین کا فقدان، دلیل کا بحران، تشکیک کی بہتات۔۔۔یہ بڑھ ہی نہیں سکتا۔"

حسین الحق اپنی علامتوں کا انتخاب سامنے کی چیزوں سے کرتے ہیں اور پھر اپنے ذہنی تجسس سے ان میں تہہ داری پیدا کرتے ہیں۔ان کا یہ افسانہ جدید انسان کے فکری سفر، اس کے ذہنی کرب، تنہائی اور اس کے تہذیبی قدروں کے معاشرے سے کٹ کر علاحدہ رہ جانے اور استحصالی طاقتوں کے خلاف شدید احتجاج اور ان کے ساتھ compulsive مفاہمت کی روداد پیش کرتے ہیں۔

بعض اوقات غفلت کی نیند سوتے ہوئے معاشرے کے چاروں طرف پھیلی ہوئی بے حسی انسان کے حوصلے کو پست کر دیتی ہے:

بھرتن تاؤ کچھ دیر تک سائیکرٹوفل کو دیکھتا رہتا ہے' پھر اس پر تھوک کر آگے بڑھ جاتا ہے اور ناقدین کی گیلری کی طرف مخاطب ہو کر زور زور سے کہتا ہے:

پچھلی متعدد گہری اندھی راتوں سے یہی تماشا جاری ہے، آج جو کچھ ہوا، اس میں سے کچھ بھی نیا نہیں ہے ۔۔۔تم گدھوں کی اولاد۔۔۔تم کو نہ کل کچھ معلوم تھا نہ آج۔۔۔۔نعرہ لگا کر گھر میں گھس جانے والے بزدلو! ایک مثال نہیں کہ ان نے جو آج باہر نہیں ہیں' اور ان نے جو آج باہر ہیں، کسی نے بھی سامنے آ کر مقابلہ کیا ہو، تم بھی مقابلے پر نہیں آسکتے۔۔۔

شتمبیر :یہ گیلری کب تک خالی رہے گی؟

بھرتن تاو: جب تک یہ مزحکہ خیز ڈراما جاری ہے

شتمبیر :یا جب تک یہ کہانی ہے، یہ مضحکہ خیز ڈراما جاری رہے گا؟

شتمبیر آہستہ آہستہ قدم آگے بڑھاتا ہوا اسٹیج سے نیچے اتر کر دیکھنے والوں کی گیلری کی طرف بڑھ رہا ہے

،،بھرتنن تاو پھٹی پھٹی آنکھوں سے شتمبیر کی طرف دیکھ رہا ہے...... چہرہ اندرونی کرب کا مظہر......ایسا لگتا ہے جیسے وہ کچھ کرنا چاہتا ہے مگر اپنے اعمال پر خود قادر نہیں.... شتمبیر کی طرف رخ کر کے منھ کھولتا ہے مگر آواز نہیں نکلتی..... پورا منھ پھاڑ دیتا ہے لیکن منھ سے آواز غائب...... بڑی مشکل سے پھنسی پھنسی دبی دبی آواز نکلتی ہے...... شتمبیر''

شتمبیر آگے بڑھتے بڑھتے رک جاتا ہے پھر بھرتنن تاو کی طرف دیکھتا ہے اور مسکرا کر کہتا ہے:

ایک بے چین سور ایک پرسکون سقراط سے بہتر ہے بھرتنن تاو''

پھر آگے بڑھ جاتا ہے........کچھ دور چل کر پھر رکتا ہے اور پلٹ کر کہتا ہے:

فیصلے کی گھڑی آ پہنچی، ٹامک ٹوئیاں مارنا تاریخی جرم ہے۔''

افسانہ پڑھتے وقت ذہن لاشعوری طور پر کافکا کے metamorphosis کی طرف منتقل ہو جاتا ہے ۔جہاں Gregor samsa اپنے بدلے ہوئے قالب کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے آخر مر جاتا ہے۔مگر وہ چاہ کر بھی اس قالب سے باہر نہیں آپاتا۔وہ مجبور ہے بے بس ہے وہ کرنے کے لیے جو اس کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔وہ اپنا وجود کھو چکا ہے اور اپنے اصل وجود کو تلاش کرتے کرتے آخر ختم ہو جاتا ہے۔افسانہ وجودیت کی اسی تلاش پر مبنی ہے۔جہاں کردار اس لایعنی دنیا میں بے بسی اور مجبوری کے عالم میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔بظاہر وہ ہنس رہے ہیں مگر اس ہنسی کے پیچھے ان کا کرب چھپا ہوا ہے۔حسین الحق نے بھی افسانے میں اپنے کردار کے ذریعے انسان کی اس بے بسی کو دکھایا ہے.

دراصل حسین الحق نے اسٹیج کو بطور علامت پیش کیا ہے یہ علامت اس دنیا کو پیش کرتی ہے جہاں انسان محض ایک کردار کا رول پلے کر رہا ہے۔اسے جو کرنے کے لیے کہا گیا ہے وہ بس ایک کٹھ پتلی کی طرح اسے کرنے کے لیے مجبور ہے۔یہاں وجود کو تلاش کرنے کی تڑپ، باطنی اضطراب اور زندگی کی معنویت کی تلاش ہے۔افسانے کے کردار جدید دور کے افراد ہیں جو آج کے نامساعد حالات میں اپنے باطن سے اپنی زندگی کی معنویت سے غافل ہیں جو بس ایک مشینی زندگی گزار رہا ہے لیکن جب اس لایعنیت کا احساس دل میں ابھرتا ہے وہ مضطرب ہو جاتا ہے۔

یہ افسانہ لفظوں پر مشتمل نثر میں رنگوں کی ایک آرٹ گیلری کی طرح ہے۔جس میں تخلیقی زبان کی جدت و ندرت کے نئے نمونے ہیں موضوعاتی تنوع کے رنگ برنگے پیکر ہیں۔جسے نئے نقوش کو اظہاری اسلوب کے ساتھ آمیز کر کے ایک نیا جہان حسن معنی اور حسن فکر دونوں کی ایک امتزاجی کیفیت پیدا کر دی گئی ہے۔حسین الحق کا یہ افسانہ معاشرے میں پھیلی گھٹن اور اضطراب کو سامنے لاتا ہے۔

سوئی کی نوک پر رکا ہوا لمحہ حسین الحق کا عمدہ اور فن کاری سے بھر پور افسانہ ہے۔ ناسٹیلجیا سے گزرتے ،سوئی کی نوک پر رکے یہ لمحات آج کے انسان کی روداد ہے۔ یہ کہانی اپنے آپ سے گزر کر زمان و مکان کا احاطہ کرنے میں کامیاب ہے۔ حسین الحق اپنی اکثر کہانیوں میں تاریخ کو گواہ بناتے ہیں۔ علامتوں ،استعاروں کا خوبصورتی سے ستعال کرتے ہیں۔ زبان و بیان پر انھیں قدرت حاصل ہے۔

حسین الحق ان افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جہاں بیان کی ارفع سطح سے علامتیں چھن چھن کر قاری کے ذہن کو اپنے قابو میں لے لیتی ہیں۔ یہ حسین الحق کے کہانی بیان کرنے کا طلسم ہے کہ وہ موجود سے لامحدود زمانے کے سفر کو اپنے تجربات اور اظہار و بیان کے سلیقہ سے سہل پسند بنا دیتے ہیں۔

یہ کہانی آج کی لایعنی زندگی کا استعارہ ہے۔ کہانی کے یہ تینوں کردار آج کے انسان کی لایعنی زندگی کا استعارہ ہیں جہاں انسان محض اسٹیج پر ایک کردار کا رول پلے کر رہا ہے۔ اس کا اپنی زندگی پر کوئی اختیار نہیں۔ ۔۔۔''بظاہر ہنس رہا ہے مگر چپکے چپکے رو رہا ہے''

انسان کی بے بسی اور اس کے باطنی کرب کا استعارہ ہے۔

فن کی سطح پر حسین الحق سماجی حقیقت نگاری کو علامتیں بنا کر زندگی کے ایسے عکاس بن جاتے ہیں کہ ان کی رواں دواں نثر کو پڑھتے ہوئے قاری کو لطف آتا ہے۔ زندگی کی ہیبت ناک حقیقتوں کے اظہار میں مشکل کیوں پیش آتی ہے۔ ایک ایسی حقیقت جو کاغذی نہیں ہمارے اندر بستی ہے۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ایسے پابند اظہار یا ذریعے کی تلاش کا رہا ہے جو ہماری زندگیوں کی حقیقت کو قابل یقین بنانے میں ہماری مدد کر سکے۔

حسین الحق نے زندگی کی ہیبت ناک حقیقتوں کے اظہار کے لیے علامت کا پیکر استعمال کیا ہے۔ حسین الحق کا شمار اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کے توسط سے جدید افسانے کو نئی فکر اور انوکھے طرز اسلوب سے مالا مال کر دیا۔

یہ افسانہ آج یعنی 2022ء کے حساس افسانوں کے کرب کو اور ان کی ذہنی کیفیت کو پوری فنکاری کے ساتھ بیان کرتا ہے جبکہ شاہ کار پبلی کیشن نے اس کتاب کو 1997ء میں شائع کیا تھا یہ اس سے بھی خاصہ پہلے کا ہے اسے میں نے پہلی بار شب خون یا جواز میں پڑھا تھا تب بھی شاید شافع قدوائی سے رات ہوٹل میں اس پر لمبی گفتگو ہوتی تھی۔ آج بھی یہ افسانہ اتنا ہی معنی خیز ہے جتنا پہلی بار پڑھنے پر لگا تھا بلکہ اس سے کچھ زیادہ۔ آج کی بے حسی، بے سمتی اور ذہنی انتشار اسے آج کی کہانی بنا دیتا ہے یہی فن کار کا کمال بھی ہے۔ اسی میں حسین الحق کی عظمت کا راز بھی پوشیدہ ہے۔

گزرے دنوں کی یاد میں: پروفیسر حسین الحق

ڈاکٹر سید اشہد کریم (گیا، بہار)

23دسمبر کو ڈاکٹر قسیم اختر (ابجد پورنیہ) سے موبائل پر بات کرتے ہوئے یکا یک ان سے یہ پتہ چلا کہ مشہور و معروف فکشن نگار پروفیسر حسین الحق کا پٹنہ میں انتقال ہوگیا، وہ وہاں بیماری کی شدت کے سبب زیر علاج تھے۔ ویسے ان کی بیماری اور صحت کی خرابی کی خبر ادھر ایک دو برسوں سے اردو کے ادبی حلقوں میں تیزی سے گشت کر رہی تھی اور عقیدت مندوں و محبت کے ماروں کے بار ہا دست دعا دراز بھی ہو رہے تھے۔ جہاں جہاں شفایابی کی امیدیں تھیں وہاں وہاں انہیں لے کر بال بچّے اور عزیز و اقارب دوڑ بھی رہے تھے۔ مگر بیماری دل کے کام تمام کرنے کی گھڑی نہیں آئی تھی کیونکہ اس دوران انہیں ساہتیہ اکادمی کے انعام یافتہ ہونے کی خوش خبری بھی سُنّی تھی اور کوڈ۔۱۹ کے دلدوز مناظر کی افسوسناک خبروں کے درمیان جینا بھی تھا اور کینسر کے موذی مرض سے کچھ سانسوں کی جنگ بھی لڑنی تھی۔ بہر حال اس کے بعد تو وہ گھڑی بھی اپنی راہ دیکھ رہی تھی جسے میر تقی میر نے ''دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا'' سے منسوب کیا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!!!

محبیؔ قسیم اختر کی باتوں سے یقین تو ہوگیا تھا مگر اصول تحقیق نے احمد صغیر اور نوشاد ناداں و ندیم جعفری صاحب کی طرف بھی فوراً میرے دماغ کو متوجہ کیا اور عین تابش صاحب کو اس لئے مناسب نہیں سمجھا کہ پہلے گیا کے دیگر ادبی احباب سے پتہ کرلوں۔ بھائی احمد صغیر اور نوشاد ناداں سے بات ہوگئی اور خبر کی تصدیق کے ساتھ ساتھ تجہیز و تکفین کا پروگرام بھی کچھ کچھ سمجھ میں آگیا۔ فیس بک کی برقی دیوار بھی دعائے مغفرت کے الفاظ سے بھرنے لگی تھی میں نے بھی اخلاقاً ایک رسمی پوسٹ اپنی وال سے لگادی اور یہ سوچ کر خوش بھی ہوگیا کہ چلو حق شاگردی ادا ہوگئی۔ یا الرحم الرّاحمین یارب العالمین!!!

اس دن میں بھھوا کے جگ جیون اسٹیڈیم میں ویرکنور سنگھ یونیورسٹی کے ماتحت کالج کرکٹ ٹورنامنٹ کے فائنل میچ کی دیکھ ریکھ اور پرائز بانٹنے کے اختتامی سیشن کی ذمہ داریوں میں مصروف تھا کیونکہ پرنسپل صاحب نے مجھے منچ سنچالن کے لئے منتخب کیا تھا۔ میرے کالج نے فائنل میچ جیت لیا تھا اور کالج کے لوگ خوشی میں شرابور تھے اور میں حسین صاحب کی یادوں کو ذہن و دل کے پردے پر ٹانگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے

جگ جیون اسٹیڈیم انعامات کی تقسیم کے بعد خالی ہو رہا تھا اور فوٹو سیشن کے بعد اراکین میرے انداز گفتگو اور نظامت کی تعریف کر رہے تھے مگر میں میدان سے سیدھے اپنے کمرے کی طرف گھر لوٹنے کی دھن میں تھا۔

اب گھر آ کر ساری باتیں صاف ہو چکی تھیں کہ مرحوم حسین الحق صاحب کی میّت گیا آئے گی اور صبح آٹھ بجے غسل اور مکمل تجہیز و تکفین کی تیاری کے بعد نماز جنازہ گیا میں ہوگی اس کے بعد سہسرام کے لئے لوگ روانہ ہو جائیں گے اور جمعہ کی نماز کے بعد دوسری بار یہاں بھی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور آبائی قبرستان میں ان کی تدفین ہوگی۔ میں کشمکش میں تھا کہ کیا کروں؟ سہسرام جاؤں یا گیا؟ کام کی نوعیت نے میرے قدم گیا کی طرف صبح سویرے کھینچ لئے!!!

راستے میں میرے کانوں کے اندر استاد محترم کا ایک جملہ کسی کی موت پر کہا گیا رقص کر رہا تھا کہ ''مرنے والے کے متعلق کہے گئے جملوں پر اگر غور کیا جائے تو ایسا لگے گا کہ آج تک دنیا میں کوئی برا آدمی پیدا ہی نہیں ہوا'' میں سوچ رہا تھا کاش ایسا ہی ہو اور بالخصوص پروفیسر حسین الحق کے ساتھ اللہ تعالیٰ رحم و کرم کا یہی معاملہ رکھے کیونکہ پرنٹ میڈیا سے لے کر الیکٹرونک میڈیا تک اور لوگوں کے بے شمار تاثرات میں دعائے مغفرت نے جنت ہی جنت کی بشارت دی۔ یقیناً اتنی ساری صدائیں نامراد نہیں ہوں گی۔ اللہ رحیم و کریم ہے اس سے اچھی امیدیں وابستہ کرنا چاہئے (آمین)

پروفیسر حسین الحق صاحب کو میں نے کب دیکھا اور کب جانا یا ان سے تعارف کیسے ہوا کوئی ایسا واقعہ فی الحال ذہن میں یاد نہیں آ رہا ہے جو کہ پہلی ملاقات اور تعارف کا ایک خاص سبب ہو۔ ہاں میرے مگدھ یونیورسٹی کے اندر شعبۂ اردو میں قدم رکھنے سے پہلے میری ملاقات گیا کی ادبی نشستوں میں ان سے دو چار بار ہو گئی تھی۔ گریجویشن کے وقت تو شاعری کا بھوت سوار تھا اور کالج کے استاد مکرمی تاج انور صاحب کی باتوں نے مجھے ابھی نصابی افسانوں میں ''کفن'' ، ''گرہن'' اور ''انوکھی مسکراہٹ'' وغیرہ تک ہی محدود رکھا تھا۔ دوسرے اساتذہ کرام میں محترمی حسن امام صاحب نے کچھ کچھ میر و غالب کی غزلیہ شاعری کے حوالے سے میرے شعری ذوق میں اضافہ کیا تھا۔ مگر اس زمانے میں کہاں میں اور کہاں میر و غالب!!! اپنی شاعری کا جنون اور جوش کچھ الگ ہی ہوا کرتا ہے۔ اس وقت یہی میرا ادبی سرمایہ اور یہی میری دنیا تھی۔

یونیورسٹی آ کر نظر وسعت تلاش کر رہی تھی اور مگدھ یونیورسٹی کے اساتذہ کرام میری معاونت کر رہے تھے ان میں پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر حسین الحق، پروفیسر محفوظ الحسن، پروفیسر فصیح الزماں، پروفیسر منصور عالم، پروفیسر سلمان بلخی وغیرہ کے نام نمایاں تھے۔ ساتھ ہی ساتھ سبکدوشی کے بعد بھی پروفیسر ثنا رضوی اور پروفیسر افصح ظفر صاحب کی نگاہ کرم کے دروازے میرے لئے ہر وقت کھلے ہوئے تھے۔

اب میں پوسٹ گریجویٹ کے بعد ریسرچ کی دشوار گزار منزل بھی طے کر چکا تھا جسے میرے نگراں پروفیسر علیم اللہ حالی نے اپنی بے لوث محبت اور شفقت سے آسان کر دیا تھا۔ کالج کے استاد تاج انور صاحب سے بھی میرے مراسم بہت اچھے تھے ان کے مفید مشوروں نے مجھے پکی روشنائی کی طرف راغب کیا اور لگاتار مضامین لکھنے پر زور دیا بعد میں جسے پروفیسر افصح ظفر کی صحبتوں اور قربتوں کی آنچ نے کندن بنانے کا کام کیا۔ شاعری کی سوجھ بوجھ تو پروفیسر عنوان چشتی اور فرحت قادری کی مرہون منت رہی تھوڑی بہت پروفیسر علیم اللہ حالی نے بھی اسے نکھارنے کی سعی کی لیکن ان سب کے علاوہ پروفیسر حسین الحق سے بھی میرا رابطہ بنا رہا اور فکشن پر گفتگو کچھ نہ کچھ ہو جایا کرتی تھی۔ کلاس کے علاوہ ان سب کے گھر کے دروازے بھی کھلے ہوئے تھے۔

اب میرے پاس علم تھا، ڈگری تھی، محنت تھی مگر نوکری نہیں تھی ...... یہ بڑا ہی مشکل اور صبر آزما مرحلہ تھا اس مقام پر میں نے افصح ظفر صاحب سے زیادہ ہمدرد یا تسلی بخش انسان کسی اور کو نہیں پایا ویسے محبت اور ہمدردی کے بول اور میرے لئے فکرمند تو سب ہی تھے مگر پتہ نہیں مجھے ان سے قریب ہوتے ہوتے اتنی انسیت کیسے ہو گئی اس کی ایک خاص وجہ یہ رہی کہ گیا میں مجھے ان کے پڑوس میں رہنے کا شرف حاصل تھا اور اس وقت مُنیٰ صاحب بھی پاس میں ہی رہتے تھے پھر ان کے انتقال کے بعد شاہد اختر کے ساتھ افصح صاحب کے یہاں مسلسل اٹھنے بیٹھنے لگا۔ جہاں تک روزگار میں امکانات یا رہنمائی کا معاملہ ہے وہ پروفیسر طارق سعید صاحب کی کاوشوں سے فیض آباد تک پہنچا۔ حالانکہ ایک بار حسین الحق صاحب نے مجھ سے کہا تھا مجھے بھی اتنا ہی قریب سمجھنا اور میرا بھی تم پر اتنا ہی حق ہے۔ میں نے کہا بے شک!!!

ذہنی ہم آہنگی افصح صاحب کے ساتھ میری اس قدر ہو گئی تھی کہ میں تمام باتیں ان سے شیئر کرتا رہتا تھا اور وہ مجھے مفید مشوروں سے نوازتے رہتے تھے دیگر اساتذہ کرام کے ساتھ ایک رشتۂ محبت ضرور تھا لیکن اس میں استاد و شاگرد کی ایک دیوار کھڑی تھی افصح صاحب کی نگاہ عنایت نے اس احساس کو جنم ہی نہیں لینے دیا۔ وہ چائے سے پانی تک خود ہی بلا تکلف پلایا کرتے تھے۔ وہ انسان کی اس تخلیقی قوت پہ نظر رکھتے تھے جو ذرا سی کاوش سے نکھر سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ میں اور احمد صغیر ان کے اخیر عمر تک اُن سے جُڑا رہا۔ ویسے ان کے شاگردوں میں پروفیسر حسین الحق، پروفیسر مظہر حسین، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر شہزاد انجم جیسے نہ جانے کتنوں کے نام نامی آتے ہی وہ استاذ الاساتذہ تھے اور شہرت کی دھوپ سے دور سادہ مزاج انسان بھی۔

اب یاد آیا غالباً سب سے پہلے میں نے میران بیگھہ کی خانقاہ میں پروفیسر حسین الحق صاحب کو محفل سماع میں جھومتے جھامتے ہوئے دیکھا تھا میرے پھوپھی زاد بھائی اشتیاق رسول اشرف میرانی عرف لڈو

جو مجھ سے عمر میں اچھے خاصے بڑے ہیں انہوں نے وہاں ان کا تعارف کرایا تھا۔ وہ اس وقت پوسٹ گریجویٹ کے طالب علم تھے اور حسین الحق صاحب یونیورسٹی میں استاد کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ انہیں صوفی ازم کی وجہ کر ایک خاص لگاؤ تھا کئی افسانوں اور ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ناول ''اماوس میں خواب'' کے اندر لڈّو بھائی کی شخصیت کو رکھ کر کردار تراشے گئے ہیں۔ پھر بزم راہی کی ایک دو نشستوں میں حسین الحق صاحب کو میں نے شعر پڑھتے ہوئے سنا جہاں میں خود بھی بحیثیت شاعر موجود تھا۔ وہائٹ ہاؤس کی ایک نشست یاد آرہی ہے جہاں انہوں نے شرکت کی تھی اور کلیم اختر کی غزل کو بے انتہا داد سے نواز رہے تھے۔ ایک اور نشست یاد آرہی جو مرزا غالب کالج میں تھی۔ اس وقت میرا حال یہ تھا کہ غزل پڑھنے کے علاوہ کچھ کہنا میرے بس سے باہر تھا۔ ترقی پسندوں کی بھیڑ جمع تھی ہندی اور اردو کے بہت سارے ادباء وشعراء شریک تھے اس میں ستندر کمار نے بڑی عمدہ اور جامع تقریر کی تھی ان کے بعد حسین الحق صاحب مائک پر آئے اور اپنی بات کو انہوں نے جدیدیت اور صوفیت کے سہارے اچھا خاصا موضوع کا رخ موڑ دیا تھا۔ یہ بزم ندیم جعفری صاحب کی کاوشوں کا حصہ تھی یا جناب مسعود منظر کی کوششوں کا نتیجہ یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ شاہد نظامی میرے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے میرے کان میں دھیرے سے کسی کا نام لیا کہ وہ رہتے تو ان کی باتوں کو بھی بے اثر کر ڈالتے مگر محفل حسین الحق صاحب نے جذباتی تقریر سے لوٹ لی تھی۔

اکثر و بیشتر گیا کی ادبی محفلوں میں مجھے شرکت کا موقع ملتا اور وہاں حسین الحق صاحب کی شرکت بھی ہوا کرتی۔ کبھی کبھی دونوں بھائیوں یعنی عین تابش صاحب کے ساتھ دیکھتا اور دونوں کی دوسرے کے تئیں محبت اور لگاؤ کا وہ جذبہ بھی دیکھنے کو ملتا کہ کس قدر دونوں ہم خیال ہیں اور ایک رائے مگر ایسا نہیں کہ بازی ہر بار ان کے ہاتھ ہی لگتی۔ ادبی چشمک، نظریاتی اختلاف ذاتی پرخاش، علمی رعب، ترقی پسندیت، فاروقیت ، نارنگیت سب کچھ محفل میں روا تھا مگر وہاں شائستگی اور تہذیب کی فضا بھی تھی جس میں محبت کی عجب چاشنی رہتی تھی۔ ہائے وہ محبت دار اب لوگ کہاں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوں گئیں۔

فصیح ظفر صاحب کے دو شاگرد رشید دو چھور پر تھے ایک طرف پروفیسر حسین الحق تھے تو دوسری طرف پرنسپل مظہر حسین تھے۔ دونوں کی الگ الگ راہیں تھیں الگ الگ نظریے تھے۔ پروفیسر حسین الحق نے اپنی عالمی وادبی شناخت قائم کی تو وہیں پرنسپل مظہر حُسین نے سیاسی شعور کی بنا پر دبے کچلے خاندان میں پرنسپل ہو کر ایک اچھی مثال قائم کی۔ فصیح ظفر صاحب کے سامنے دونوں اپنی اپنی حُسینیت اور حق پرستی کا دعویٰ کرتے رہتے تھے۔ باقی لوگ لطف لینے کے سوا کیا کرتے۔ شاہد اختر کے بے تکلف جملے محفل کو زعفران زار بناتے رہتے ،مبین بھائی کی

پٹھانی معصومیت کی شکار ہوتی رہتی ۔اب نہ بھاسکر جی کی گرجدار آواز ہے اور نہ عبدالمنان انصاری کی بے تکی بحث اور نہ مظہر صاحب کی حُسینیت اور نہ حسین الحق کی صوفیت نہ شاہد احمد شعیب رہے نہ مثنیٰ رضوی رہے اور نہ وہاب اشرفی صاحب کی بات صرف شاہد اختر کا جملہ اک شرابی کی میّت ہے لوگو جو پئے وہی کاندھا لگائے کی دانت کھسوڑتی صدا جو کسی کی موت پر انہوں نے گرہ لگا دیا تھا اور شاید اب تک فضا میں آواز لہرا رہی ہے ۔ پرنسپل مظہر حسین کا مگدھ یونیورسٹی کے دو استاذ پروفیسر حسین الحق اور پروفیسر منصور عالم کا تجزیاتی تبصرہ بھی قہقہے بلند کر رہا ہے .... آخر کیا ہوا کہ نماز جنازہ میں بھی پروفیسر منصور عالم شامل نہیں ہوئے حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!!!

پروفیسر منصور عالم اور پروفیسر حسین الحق دونوں اپنی ذات کے عجیب وغریب نمائندہ بنے رہے اور فکری شدت پسندی کے ساتھ ہی رہتے ۔ دونوں کی مذہبی سوجھ بوجھ کا رنگ بھی جدا جدا رہا شعبۂ اردو کی رقابت بھی دیدنی تھی یہ میری رائے نہیں ہے بلکہ یہاں کے ادبی حلقوں کے خیالات ہیں منصور عالم صاحب کے کچھ لوگ علمی مباحث کے قائل تو ہوئے لیکن انہیں ادبی دنیا میں وہ شہرت نصیب نہ ہو سکی جو حسین الحق کا حصہ بنی ۔ مذہبی فکر میں حسین الحق صوفیت کے علم بردار تھے جبکہ منصور عالم صاحب جماعت اسلامی نظریے کے قریب دکھائی دئے ۔شاہد اقبال کو یہ یقین تھا کہ شاید حسین صاحب کے انتقال کی خبر کے بعد منصور صاحب کا وہ جذبہ نرم ہو جائے گا لیکن پتہ نہیں کیا مجبوری آن پڑی کہ محبت کی راہ نکل نہیں پائی اور سوال کا ایک گوشہ تشنہ رہ گیا .... حالانکہ دیکھا جائے تو میں بھی جنازے کی نماز سے محروم رہ گیا اور بھی بہت سارے لوگ مرحوم کے شناساؤں میں اس ثواب دارین سے بے نیاز ہی رہ گئے ۔لیکن کچھ لوگوں کی نگاہ صرف منصور عالم صاحب کو تلاشتی رہی ۔

ایک بار استاذی محترم پروفیسر منصور عالم سے میں ملنے اس وقت گیا تھا جب وہ مگدھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ہوئے تھے انہوں نے کہا کہ حسین نے اپنی ساری کتابیں یہاں معاون کتب میں لگا دی ہیں اور تمہاری بھی لگا دی ہے میں نے انہیں نکال دیا ہے تمہارے پاس تو ابھی بہت وقت ہے اس کی کیا ضرورت ہے ۔میں ان کی بات کا کیا جواب دیتا خاموش رہا۔ میں نے ”مشام کا وہ شمارہ بھی دیکھا جہاں گیا کے تمام شعراء کی غزلیں موجود تھیں ان میں شاعر متشاعر کا کوئی لحاظ نہیں تھا ہاں اس فہرست سے میرا نام غائب تھا۔ مجھے کوئی حیرت نہیں تھی ۔مزہ تو اس وقت آیا جب مرغوب اثر فاطمی نے اپنے شعری مجموعہ میں انھیں استاد گردانا اور انہوں نے بھی پیش لفظ میں اپنے مزاج کی روایات کو بھلا کر شاگرد رشید کو بے شمار داد وتحسین سے نوازا لیکن یہ لمحہ حسین الحق صاحب پر کتنا گراں گزرا ہوگا!!! اسے مرغوب اثر فاطمی ہی بتا سکتے ہیں؟ اللہ توبہ!!! کیا کیا ستم شعار باتیں یاد آ جاتی ہیں

----استغفر اللہ! استغفر اللہ! استغفر اللہ----

ایک بار محرم کے زمانے میں عاشورہ کے روز میں اور میرے دوست ڈاکٹر عبدالمنان انصاری (جواب مرحوم ہو چکے ہیں) استاذ محترم حسین الحق صاحب سے ملنے ان کے گھر پر گئے شام کا وقت تھا مغرب کی گھڑی تھی غالباً اذاں ہو چکی تھی وہ روزے سے تھے اور ان ایام میں انہوں نے بتایا کہ روزہ رکھا کرتے ہیں پھر انہوں نے ہم لوگوں سے پوچھا کہ فاتحہ کا ملیدہ کھانا پسند کریں گے ان کا افطار یہی تھا۔ ہم لوگوں نے کہا ہمیں کھانے پینے میں کوئی عذر نہیں ہے ہاں کسی رسم ورواج کے اسیر نہیں ہیں کچھ کچھ چیزوں پر ہم لوگ عمل کرلیا کرتے ہیں باقی خاموشی ہی بہتر ہے کافی دیر کربلا کے واقعات پر باتیں ہوتی رہیں اور اس درمیان کچھ دیگر حال احوال کا ذکر بھی ہو جایا کرتا تھا۔ پھر ہملوگ اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔

استاذ محترم کے ساتھ تقریباً 30 برسوں سے زیادہ کا ساتھ رہا اور اس درمیان بے شمار ادبی وشعری محفلوں میں ان کا ساتھ رہا انہیں دیکھنے سننے اور سمجھنے کا موقع ملا مگدھ یونیورسٹی کا وہ سمینار بھی یادگار تھا جب میں نے اپنا مقالہ عظیم شخصیتوں کی موجودگی میں پڑھا تھا اور لوگوں نے میری تحریر کو کافی پسند کیا تھا پھر خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی کی وہ شام یاد آ رہی ہے جہاں دن بھر سمینار کے سیشن کے بعد شام میں ایک شعری نشست استاذ محترم کی صدارت میں پروفیسر شفیق اشرفی صاحب نے رکھی تھی اور نظامت کے فرائض وہاں کے ایک پروفیسر عالم صاحب انجام دے رہے تھے۔ شعراء کرام کی ایک طویل فہرست نپٹاتے ہوئے کچھ تنگ آ کر ناظم نشست نے مجھے بھول کر صدر کی اجازت کے بغیر نشست کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔

فخر عالم صاحب نے حسین الحق صاحب کو صرف فکشن نگار ہی سمجھا اور مجھے سمجھا کہ یوں ہی شعر گوئی کا لبادہ پہن لیا ہے عدم واقفیت انسان کے لیے کبھی کبھی مصیبت بن جاتی ہے منتظمین کے روح رواں پروفیسر شفیق اشرفی نے ناظم کی بے وقوفی کو فوراً سمجھ لیا اور مائک پر آ کر سامعین سے گزارش کی کہ پروگرام کا خاتمہ ابھی نہیں ہوا ہے صدارتی خطبہ باقی ہے اور حسین الحق صاحب کے اندر ایک شاعر بھی چھپا ہوا اسے ہملوگ سننا چاہتے ہیں ایک دو شعراء کرام اور باقی رہ گئے ہیں ان کا کلام بھی اہمیت کا حامل ہے یہ اعلان کر کے مسئلہ کو حل کیا اس کے بعد میرے علاوہ ایک دو اور شعراء نے جو باقی بچ گئے تھے اپنا کلام سنایا۔ حسین الحق صاحب نے صدارتی خطبہ سے پہلے اپنا کلام پیش کیا اور اس نشست نما مشاعرے کو لوٹ لیا۔ داد وتحسین تو میرے حصے بھی اچھی خاصی آئی مگر حسین صاحب نے جو غزل پڑھی وہ وقت کی آنچ پر اس گھڑی کھری اتری اس کا ایک مصرعہ مجھے اب بھی یاد ہے:

میرا نام یوں تو حسین ہے میرے دل میں کتنے یزید ہیں

اپنے نام کے سہارے انہوں نے آج کے انسان کے ظاہر اور باطن کی دورنگی پر گہرا طنز کیا اور کردار و عمل کے تضاد کو روشن کیا۔ غزل کے بعد فضا بھی صدارتی خطبے کے لئے سازگار ہوگئی تھی نشست کے بعد حسینیت سامعین کے ذہن و دل پر چھا گئی۔

رات کھانے کے بعد ان کے پان کا اسٹاک ختم ہو گیا تھا وہ میرے کمرے میں آئے اور مجھے کہا کہ اشہد کہیں سے پان کی گنجائش نکالو میں نے وہاں شاداب اکمل سے شاید کہا اور انہوں نے کسی کے ذریعہ انتظام کرا دیا۔ حالانکہ رات کے گیارہ سے زیادہ بج چکے تھے۔ پھر بھی بانک سے کہیں نہ کہیں سڑک کنارے پان گمٹی مل ہی جاتی ہے۔ پروفیسر صاحب علی سے وہیں ان کے مراسم گہرے ہوئے اور ممبئی یونیورسٹی میں سمینار میں شرکت کے لئے جلد ہی انہیں دعوت بھی ملی۔ اخبار کے ذریعہ استاذ محترم کے ممبئی سفر کی خبر ملی۔

زندگی کے آخری حصے میں قدرت مہربان تھی اس لئے تقدیر نے جلد ہی دو بڑے انعام لکھ دئے۔ ایک غالب اکیڈمی کا غالب ایوارڈ اور دوسرا ساہتیہ اکادمی کا انعام اور یہ اعزاز سرمایۂ حیات بن گیا۔ حسین الحق نے تین ناول تحریر کیے۔

(۱) بولو مت چپ رہو 1990 (۲) فرات 1992 (۳) اماوس میں خواب 2017

افسانوی مجموعوں کی فہرست یوں ہے:

(۱) پس پردہ شب 1981 (۲) صورت حال 1982 (۳) بارش میں گھرا مکان 1984 (۴) گھنے جنگلوں میں 1989 (۵) سوئی کی نوک پر رکا لمحہ 1997 (۶) مطلع 1996 (۷) نیو کی اینٹ 2010

حسین الحق صاحب کی شخصیت کے یوں تو کئی گوشے ہیں۔ انعامات کے لحاظ سے ان کی ناول نگاری سبقت لے گئی سچ تو یہ ہے کہ افسانہ نگاری میں ہی ان کی تخلیقی قوت کی توانائی ابھری ہے۔ بقیہ سارے گوشے بھی بہت اچھے ہیں مگر زیب داستاں کے لئے ان کی شخصیت میں اضافی صورت رکھتے ہیں انہوں نے اپنا ادبی نقش کچھ ایسا ہی انتخاب بھی کیا۔ شاعری تو کی مگر شوق کو جنون کی حد سے دور رکھا تنقید میں بھی زور آزمائی کے لئے فکشن کی لکشمن ریکھا کو غنیمت جانا۔ صوفی ازم وارثت کے طور پر قبول کیا اور وہاں بھی اعتدال کی صورت برقرار رکھی تحقیق کا جامہ جامعاتی سطح پر درس و تدریس کی ضرورتوں تک ہی دراز کیا۔ وعظ و پند و نصیحت کی دنیا کو ایک مخصوص حلقے میں آباد کیا ہاں مگر ارجن کی طرح ایک آنکھ سے نشانہ صرف اردو فکشن پر سادھے رکھا۔ یہی سبب کہ ایک کامیاب فکشن رائٹر کے طور پر اپنی شخصیت کی

گہری چھاپ چھوڑ گئے ۔ویسے ان کے اندریوں تو اللہ نے بہت سارے صفات دیئے تھے مگر انہوں نے فکشن کی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانا مناسب نہیں سمجھا۔قدرت نے معاونت کی اور انہوں نے خواہشات کو بے لگام ہونے نہیں دیا۔ یک در گیر محکم گیر کے عمل کو اپنایا۔میرے یہ خیالات ان کے فکشن کی فنّی کدو کاوش کی روشنی میں ہیں۔

آزادی کے بعد کا ہندوستان حسین الحق کے افسانوں میں رچا بسا ہوا ہے۔انھوں نے خاندان اور سماج کے دکھ سکھ کو اپنی کہانیوں میں بہت خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے۔تہذیبی اقدار کی شکست وریخت ان کا موضوع ہے لیکن حق وباطل کی کشمکش کو کربلائی فکر سے جوڑ کر عہد جدید کا مرثیہ پیش کیا ہے جہاں انصاف پرست ایماندار آدمی کے لئے کل بھی جینا بہت مشکل تھا اور آج بھی بہت مشکل ہے انہیں خیال کو اپنی تحریر کا مرکزی رنگ بنایا ہے۔سچائی کی راہ دشوار گزار ضرور ہے مگر ذلت آمیز اور شکست خوردہ نہیں حسین کا نیزے کی نوک پر ہی سر بلند ہوا کرتا ہے۔

اسمٰعیل کا کردار ''اماوس میں خواب'' کے اندر زندگی کے ایک ایسے المیہ سے دوچار ہے جہاں اس کا تاریخی تارکٹ گیا ہے اور تہذیبی شناخت بدل چکی ہے۔نیوکی اینٹ کا سلامت اللہ سالامتلا میں تبدیل ہوگیا ہے وقت کی یہ مار ''مور پاؤں'' کی طرح حسن کا زاویہ بدل چکی ہے۔اکیسویں صدی کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا یہ بڑا اہم سوال ہے؟ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' سے ''نیوکی اینٹ'' تک محبت اور زندگی کی کشاکش نے کئی رخ بدلے ہیں۔

ان کا جو کام ہے ارباب سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

محبت کے اس پیغام پر حسین الحق نے اپنے افسانوں کی بنیاد رکھی۔گنگا جمنی تہذیب کے سہارے ہی شیو پوجن اور سلامت اللہ کی دوستی قائم رکھنی چاہی۔محبت کی وارثت میں تہذیب کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنے کی سعی کی۔

پروفیسر حسین الحق نے ایک بھرپور زندگی جیا اور آخر کے دنوں میں ان اعزازات سے نوازے بھی گئے جس کی تگ ودو قلمی سفر سے جاری تھی۔دو نومبر 1949 کو طلوع ہونے والا یہ ادبی ستارہ آخرش 22 دسمبر 2021 کو پٹنہ کے میدانتا اسپتال میں غروب ہوگیا۔'' آمداڑی ہاؤس'' کی مضطرب فضائیں سوگوار ہوگئیں اور جدید اردو کہانی کا ایک باب بند ہوگیا۔

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
وہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

تعزیتی قطعات

حُسین الحق (متوفی 21-12-23)

مرغوب اثر فاطمی
موبائل نمبر۔9431448749

ہم حُسین الحق بہت مغموم ہیں
باخدا، نادار ہیں مظلوم ہیں
سرنگوں ہے رونقِ بزمِ ادب
ہم ضیائے مہر سے محروم ہیں

☆

ہاں علیٰ معیارِ فکشن کر دیا
صنفِ شعری کو بھی روشن کر دیا
ہو وہ عنوانِ تصوف یا کہ نقد
تم نے جس کو چھو لیا، فن کر دیا

☆

کاوشوں کا تھا یہی لُبِّ لباب
چپ رہو، حاصل کرو تعبیرِ خواب
موج میں آکر فُراتِ زندگی
فکر میں بھر دے گی آبِ انقلاب

چاکِ دامانِ خرد سی کر گئے
زہرِ دقیا نوسیت پی کر گئے
سرفرازی پاؤں سے لپٹی رہی
تم مکمّل زندگی جی کر گئے

☆

ناز ہو تم پر لحد کی خاک کو
یعنی پاکر صاحبِ ادراک کو
خیریت لیتا رہے خُلدِ بریں
اور تسلّی ہو اثرؔ غم ناک کو

عشرت ظفر اردو کا ایک نخل ثمر آور

ضیا فاروقی

موبائل : 9406541986

عشرت ظفر کی شخصیت کانپور کے افق پر ہمیشہ اختر تابندہ کی رہی ہے۔اردو فارسی ادب کے جتنے دیار ہیں وہ سب تقریباً ان کے دیکھے بھالے ہیں۔انھوں نے بحر ادب میں غواصی ہی نہیں کی بلکہ ان جزیروں کو بھی فتح کیا جو ادھر چھ سات دہائیوں میں لفظ و معنی کے اس سمندر میں ڈوبتے ابھرتے رہے ہیں۔ان کی تحویل میں شعر و ادب کا جو اثاثہ ہے وہ لسانی اعتبار سے قیمتی تو ہے ہی اس کے ساتھ ہی وہ عصر حاضر کی ایک شفاف اور واضع تصویر بھی پیش کرتا ہے۔

کہتے ہیں خلافت بغداد کے ڈوبتے سورج کی روشنی میں جب بغداد میں پہلا با قاعدہ مدرسہ قائم ہوا تو ماورالنہرؔ کے علماء نے مجلس ماتم برپا کی کہ آج سے میدان علم میں آزادانہ فکر و جستجو کے دروازے بند ہوئے اور اب ایک استاد اپنے شاگرد کو وہی پڑھائے گا جو اس نے اپنے استاد سے پڑھا ہے۔اس حکایت کو بیان کرنے کا میرا مقصد یہ ہے عشرت ظفر کا جو بھی علم تھا وہ ان کے ذاتی مطالعہ اور مشاہدے کو ثمرہ تھا نہ کہ کسی کالج یا یونیورسٹی کی ڈگری کا مرہون منت۔انھوں نے لڑکپن سے ہی مطالعہ کو اپنا رہبر بنایا اور اسی کی روشنی میں اپنا سفر تمام کیا۔ان کی پیدائش بارہ بنکی کا قصبہ رسولی کے ایک دیہات ترکانی میں 24اپریل 1944 کو ایک دیندار گھرانے میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم مدرس؟ مدینۃ العلوم رسولی میں ہوئی۔ابھی نو سال کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا اور والد نے گاؤں کی رہائش ترک کر کے لکھنو کو اپنا مستقر بنایا۔چنانچہ یہ بھی مدرسے کی آدھی ادھوری تعلیم چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ لکھنو میں ان کی تعلیم کا بندو بست کیا ہوا لیکن جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں یہ کان؟ پور آ گئے اور معاش کے ساتھ ساتھ اکتساب علم و ادب کو بھی جاری رکھا۔اس وقت کانپور شعری ادبی لحاظ سے روشن ہی نہیں بیحد تابناک بھی تھا۔ثاقب کانپوری۔نشور واحدی۔ندرت کانپوری۔رشید قمر لکھنوی۔کوثر جائسی۔فنا نظامی جیسے شاعروں سے شعری محفلیں ہی نہیں بلکہ یہاں کے چائے خانے بھی آباد تھے جہاں ہر طرح کے ادبی موضوعات پر بحث مباحثہ ہوتا رہتا۔اس کے علاوہ ستر کی دہائی تک کانپور کے تقریبا ہر محلّہ میں سرکاری یا پراویٹ چھوٹی بڑی لائبریریوں کے ساتھ ساتھ ادبی کتابوں کی وہ دکانیں بھی ہوتی تھیں جہاں سے کرایہ پر اردو

کتب ورسائل پڑھنے کومل جاتے تھے۔کئی بڑی لائبریریاں ایسی تھیں جن کی تحویل میں بشمول اردو فارسی کے ہر طرح کی کتابوں کاایک بڑاذخیرہ تھااورجن کے ریڈنگ ہال باذوق قارئین سے بھرے رہتے تھے۔نوجوان عشرت ظفر جن کے خمیر میں ذوق مطالعہ موجود تھاانھوں نے اس موحول سے بھرپوراستفادہ کیا۔اوراپنی فکرکوصیقل کرتے رہے۔اس درمیان ان کے دوست زبیراحمد فاروقی نے روزنامہ انوارقوم کی بناڈالی چنانچہ یہ اس سے وابستہ ہوگئے بعد میں یہیں سے ماہنامہ خرام کااجراء ہواجس کوبحیثیت مدیرعشرت ظفر نے ایک وقارعطا کیا اوراہل قلم کے درمیان مقبول بنایا۔

تخلقی سطح پرعشرت ظفر کی تقریباڈیڑھ درجن کتابیں ہیں جن میں پانچ شعری مجموعے تین ناول ایک خودنوشت سوانح اورباقی تنقید وتحقیق کے تعلق سے ہیں۔اس کےعلاوہ کانپورکی ادبی شخصیات پروہ کتابچے ہیں جن کی تعداداچھی خاصی ہے جیسے کہ فنانظامی۔شارق ایرایانی وغیرہ۔کساد بازاری کے اس دورمیں جب ہرکس و ناکس اپنی شہرتوں کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے اپناتا ہے عشرت ظفر اس تماشے سے کوسوں دور تھے بلکہ ان میں انانیت کہیں یاخودشناسی ایسی تھی کہ انھوں نے خودکواپنے ہی بنائے ہوئے گنبد میں تاعمرقید رکھا۔ویسے وہ بہت پرخلوص اورمحبت کے انسان تھے۔ہرایک سے خنداں پیشانی سے ملتے۔ملک اوربیرون ملک کے مقتدراہل قلم سے ان کے مراسم تھےاورخط وکتابت رہتی۔وہ برسوں جگراکادمی چمن میں بیٹھتے رہے جہاں کتنے ہی شاگردوں کوانھوں نے خودکفیل بنایا۔افسوس کہ اپنے مزاج کاتنہااردوکایہ سپاہی 16اکتوبر 2019 کواپنے مالک حقیقی سے جاملا۔اور دوسرے دن کانپورکے مچھریاقبرستان میں سپرخاک کردیا گیا۔۔ شائداسی موقع کے لئے انھوں نےکہا تھا

آں غبارم کہ ہمہ نکتہ شناسان ادب

بر خطوط کف ایام نویسند مرا

ان کے انتقال کے بعدان کےایک لائق شاگرد جاوید ساحل نے "عشرت ظفرفاؤنڈیشن" بنا کران کی یادوں کوروشن رکھااورانکے تمام غیرمطبوعہ اثاثے کی اشاعت کویقینی بنارہے ہیں۔

عشرت ظفر کاحافظہ قوی اورمطالعہ وسیع تھاخصوصاتقابلی مطالعہ میں ان کاقلم بہت رواں تھاکسی شعری اثاثے کاجائزہ لیتے ہوئے وہ ہم معنی اردو فارسی کے اشعارروانی سے پیش کرتے چلے تھے۔۔احتساب۔حرف بازیاب۔نقش امروزیااستفہام جیسی کتابوں میں اس کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔

جہاں تک شعری سروکارکاتعلق ہے عشرت ظفر کے کلام میں فکرکی تازگی بھی ہےاورالفاظ کوبرتنے میں

جذت بھی۔ دراصل وہ جب اس میدان میں آئے تو برصغیر کا ایک بڑا طبقہ شب خون اور سوغات جیسے رسائل کا اسیر نظر آیا۔ کانپور میں بھی زیب غوری۔ ابوالحسنات۔ محمد احمد رمز۔ اور زبیر شفائی جیسے شاعروں کا کارواں اس راہ پر گامزن تھا۔ عشرت ظفر بھی اس سے متاثر ہوئے لیکن لفظوں کی نشست و برخاست میں اپنی راہ الگ بنائی اور جیسا کہ کہا گیا ہے کہ اردو کے ساتھ ساتھ ان کو فارسی زبان اور اس کے کلاسیکی شعری اثاثے سے خصوصی لگاؤ تھا چنانچہ ان کی اردو شاعری میں بھی جا بجا فارسی تراکیب اور اضافتیں موجود ہیں۔ مثلاً یہی اشعار دیکھئے۔

جاگ اٹھے شعلۂ تخلیق کی آواز سے ہم
سو رہے تھے لفظ کے نخل ثمر آور میں ہم

طویل ہجر کی راتوں نے انتساب کیا
چراغ اشک کو دہلیز انتظار کے نام

میں ہوں مصروف سفر اور مرے چاروں طرف
اڑ رہا ہے خس و خاشاک جوانی میرا

رقم حکایت آئینہ ہر چراغ میں ہے
سنا رہا ہے ہر آئینہ داستان چراغ

شفق سحاب ستارے شرار شبنم و گل
مقیم ہے مری مٹھی میں خاندان چراغ

مندرجہ بالا اشعار میں شعلۂ تخلیق۔ نخل ثمر آور۔ چراغ اشک۔ خس و خاشاک جوانی اور حکایت آئینہ جیسی تراکیب میں جو ندرت اور معنی آفرینی ہے اس کے پیچھے عشرت ظفر کا فارسی ادب کا گہرا مطالعہ بول رہا ہے یہی نہیں کہ انھوں نے شاعری میں اس طرح کی تراکیب کو برتا ہے بلکہ نثر میں بھی ان کا یہی انداز ہے۔ اس کی ایک بڑی مثال اس کا پہلا ناول " آخری درویش " ہے۔ اسی طرح ان کے شعری مجموعوں کے نام میں بھی ندرت ہے جیسے کہ " نوشتہ ٔ ہفت پرکار۔ ام شب۔ سفال۔ پیچاک وغیرہ۔ عشرت ظفر نے جہاں عام اور رواں دواں موضوعات کو شعری قالب میں ڈھالا ہے وہاں بھی اپنے لہجے کی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے

چشمۂ آب رواں ہے جو سراب جاں میں
اس کی ہر لہر میں رقصاں ہے ترحم تیرا

جہت سے تا بہ جہت اور ازل سے تا بہ ازل
رقم میں کرتا ہوں لمحوں کا ماجرا کہ میں ہوں
وہ قتل کرکے مجھے جونہی تیغ اٹھاتا ہے
میں اس کے کان میں کہتا ہوں سن ذرا میں ہوں!
تم پتھر ہو میں تنکا ہوں میں خوار و خراب سہی لیکن
پتھر تو غذا ہیں پانی کی تنکے غرقاب نہیں ہوتے
شعور تیشہ زنی موج آب کو دے کر
لکھا چٹانوں پہ افسان ؟ ہنر اس نے
کام آئی میرے چھاؤں ہی میرے وجود کی
پورا کبھی نہ دشت میں خواب شجر ہوا
وہ بھی دریا مری آنکھوں نے کئے ہیں تعمیر
راستہ کاٹتی ہے جن کی روانی میرا
مٹی کے پاس بھی نہیں اب جس کے خد و خال
وہ شخص اب بھی میری شباہت میں ہے مقیم
مرقوم ایک عہد ہتھیلی پہ ہے مری
اک داستاں جبیں کی عبارت میں ہے مقیم

بہرکیف یہ ایک مختصر سا جائزہ ہے جو میں نے عشرت ظفر کی شخصیت اور ان کے شعری سروکار کے حوالے سے یہاں پیش کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کا یہ پیش بہا خزانہ جسے وہ آنے والی نسل کے لئے چھوڑ گئے ہیں نسل نو نہ صرف یہ کہ اس سے استفادہ کرے گی بلکہ اس کے تحفظ کو بھی یقینی بنائے گی۔

اکیسویں صدی میں نثری نظم ۔۔ایک جائزہ

ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی

موبائل : 9945462187

ادب میں کوئی بھی صنف آناً فاناً وجود میں نہیں آجاتی ہے اور نہ اس کے وجود میں آتے ہی ہر کوئی اسے سر آنکھوں پر بٹھا لیتا ہے، کم و بیش یہی سب کچھ نثری نظم کے ساتھ بھی ہوا۔ جب کہ یہ نہ تو کوئی اتفاقی تخلیقی وقوعہ کے طور پر سامنے آئی تھی اور نہ وجدانی حادثہ کے طور پر سرزد ہوئی تھی اور نہ محض تجرباتی تخلیقی حربہ کے طور پر پیش کی گئی تھی ۔اگر مرزا غالب کے تنگنائے غزل کے شکوہ اور خواجہ الطاف حسین حالی کے شاعری کو قافیہ ردیف کی قید سے آزاد کرنے کی خواہش کو ذہن میں رکھیں اور پھر غزل کی ریزہ خیالی کے تناظر میں اسے نیم وحشی صنف سخن قرار دیے جانے کے جواز پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور اختر الایمان کے روایتی شعری زبان اور بالخصوص غزل کی کلاسک زبان سے شعوری طور پر اور شدید طور پر انحرافی رویے پر توجہ کریں اور ن م راشد اور میرا جی کے شعری لسان کو بھی اس میں شامل کرلیں تو اندازہ ہوگا کہ اردو کے تجربہ پسند اور ذہین فنکار بہت دنوں سے ایک ایسی صنف شاعری کے خواہاں تھے جو ان کی تخیل کی پرواز اور تخلیقی بے پناہی کا دور تک ساتھ دے سکے۔اسی پس منظر نے نثری نظم کے تجربے کا جواز فراہم کیا مگر اس کے وجود میں آتے ہی ادب کے بیشتر ثقہ حضرات اس کے مخالف ہو گئے ۔اور قدیم شعری اصناف اور رائج اصناف سخن کے تناظر میں اس میں پائی جانے والی کئی طرح کی خامیوں کی نشاندہی کر کے اسے اپنے طور پر رد کر دیا۔مگر بعض تجربہ پسند فنکاروں اور آزادہ روی کے حامل قلمکاروں نے حالات کی تمام تر سنگینی کے باوجود اس کا دامن نہیں چھوڑا اور جہاں تک ممکن ہو سکا اس کی آبیاری میں لگے رہے۔ کچھ دیر تک تو لوگ اس انتظار میں خاموش رہے کہ ممکن ہے کہ آزاد غزل کی طرح یہ صنف بھی لوگوں کی نظر سے اتر جائے۔مگر جب دیکھا کے چراغ سے چراغ جلنے کا سلسلہ طویل ہوتا جا رہا ہے اور نثری نظمیں کہنے والے شاعروں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے تو وہ لوگ جو اس صنف کے ناکام ہونے کا انتظار کر رہے تھے اور وہ لوگ بھی جو اس صنف سے شدید ترین پرخاش رکھتے تھے آہستہ آہستہ نرم پڑتے گئے ۔ پھر ایسی فضا بن گئی کہ دانشوران شعر و سخن اس صنف کے تمام ابعاد پر گفتگو کرنے پر مجبور ہو گئے ، چنانچہ پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمس الرّحمان فاروقی ، باقر مہدی ، احمد ہمیش ، وزیر آغا ، انیس ناگی ، مخدوم منور ، پروفیسر عتیق اللہ، ظفر اقبال اور بلراج کومل وغیرہ نے اس صنف کے صنفی تخصیصی

لوازمات اوراس کی تشخیص وتشکیل کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی اور پھراس صنف کی تحدید وتاسیس اور تخلیقی اظہار کے نئے امکانات سے متعلق اپنی خوش گمانی کا بھی اظہار کیا اس طرح یہ صنف ایک اہم ادبی صنف کی حیثیت سے اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوگئی۔

نثری نظم جو سن ساٹھ عیسوی میں وجود میں آئی تھی مختلف مرحلوں، تجربوں اور تبدیلیوں سے گذر کر آج ایک ثروت مند صنف بن چکی ہے۔ اس لیے اب اس کے ردو قبول اور صنفی اعتبار سے اس کی اختصاصی شناخت پر گفتگو کرنے سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ اس کے سرمایہ پر گفتگو کی جائے اور ان لوگوں کی خدمات کا جائزہ لیا جائے جنہوں نے اس صنف کو پروان چڑھانے میں حصّہ لیا اور اپنی بہترین تخلیقی صلاحیتوں سے کام لے کر اس کے سرمایہ میں اضافہ کیا۔ اور ہاں ایسا کرتے وقت کسی قسم کی رعایت سے بھی کام نہ لیا جائے کیوں کہ یہ صنف پالنے میں پڑی کوئی بچی نہیں ہے کہ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر یہ سمجھ لیا جائے کہ ہم نے اپنی شفقت کا حق ادا کر دیا۔

یاد رہے کہ جن شعرا اور قلمکاروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے وہ اپنے عہد کے اہم قلمکاروں اور شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ سو انہیں بھی یہ بات گوارہ نہ ہوگی کہ کوئی ان کے کلام پر مشفقانہ نظر ڈالے اور تعین قدر کے لیے ایسا لہجہ استعمال کرے جیسے رعایتی نمبر دے رہے ہوں۔ ظاہر ہے کہ اعجاز احمد، صلاح الدّین محمود، انیس ناگی، حمید الماس، احمد ہمیش، خلیل مامون، پروفیسر صادق، حمید سہروردی، صفیہ اریب، شبنم عشائی، سارا شگفتہ، ذی شان ساحل، ابہام رشید، جینت پر مار، صدیق عالم، جمیل الرّحمان، ابرار احمد، خورشید اکرم، مشرف عالم ذوقی، نصیر احمد ناصر، علی محمد فرشی، تابش کمال، شائستہ یوسف، شمیم قاسمی، شہناز نبی، اوم پر بھاکر، علی ظہیر، ساجد حمید، نسرین انجم بھٹی، خالد عبادی، فاطمہ حسن، اور سہیل اختر وغیرہ اس قسم کے شاعر اور فنکار نہیں ہیں کہ انہیں ادب میں اپنا مقام پانے کے لیے کسی کے رعایتی نمبر کی ضرورت پڑے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ وہ شعرا ہیں جو آج خالص غزل اور پابند و آزاد نظم کے کئی اہم شعرا سے زیادہ مضبوط پہچان رکھتے ہیں۔ غالباً انہیں شاعروں کی خود اعتمادی کا نتیجہ ہے کہ کل تک جو لوگ نثری نظم کے مخالف تھے آج نہ صرف یہ کہ اس کی حمایت میں کھڑے ہیں بلکہ خود بھی نثری نظمیں کہہ رہے ہیں۔ ایسے لوگوں میں وزیر آغا سے لے کر جمال اویسی اور نعمان شوق تک کئی شاعروں کے نام شامل ہیں۔ جب کہ نثری نظم اور نثری نظم نگاروں کے مطالعے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کرنے والوں میں بزرگ ناقدوں کے ساتھ آج کئی نئے ناقد بھی سرگرم نظر آرہے ہیں۔ ایسے ناقدوں میں جمیل الرّحمان، ابرار احمد، مشرف عالم ذوقی، خورشید اکرم، ناصر عباس نیر اور عبدالسمیع کے نام کافی جانے پہچانے ہیں۔

یہاں اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ بعض لوگ جو نثری نظم کو کمتر ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ نثری نظم کے سرمایہ سے چند کمزور نظمیں لے کر اسے اپنی باتوں کی تائید کے طور پر پیش کر دیتے ہیں۔ جو سراسر انصاف کے خلاف ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہر عہد میں جتنی شاعری کی جاتی ہے اس میں سے دس فیصد شاعری ہی معیاری شاعری کی کسوٹی پر کھری اترتی ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ بقیہ نوے فیصد شاعری لائق اعتنا نہیں ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہم اس نوے فیصد شاعری کا مطالعہ کیے بغیر دس فیصد شاعری کا انتخاب نہیں کر سکتے ہیں۔ اور نہ اس نوے فیصد شاعری کی عدم موجودگی میں دس فیصد شاعری کا معیار متعین کر سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں بہر حال پوری شاعری کے مطالعے کا جوکھم اٹھانا پڑے گا۔ کیوں کہ ہم پوری شاعری کا مطالعہ کیے بغیر یہ کبھی نہیں جان پائیں گے کہ وہ کون سے شعرا ہیں جنھوں نے وقت کی نبض پکڑ کر ہوا کی سلوٹوں پر اپنے تخلیقی دستخط ثبت کیے ہیں۔ اور اپنے تخلیقی تجربات کے اظہار کے لیے لفظوں کے درمیان بالکل نئے رشتے دریافت کیے ہیں۔ فی الوقت یہ کام میں بھی نہیں کر سکتا کہ یہ کام بہت سنجیدہ مطالعہ اور کافی وقت چاہتا ہے۔ اس وقت جو لوگ نثری نظمیں لکھ رہے ہیں ان میں تین نسل کے قلمکار شامل ہیں۔ اور بہت سے قلمکار ایسے ہیں جو محض منہ کا مزہ بدلنے کے لیے نثری نظمیں لکھ رہے ہیں۔ جب کہ کچھ ایسے قلمکار بھی ہیں جو اپنی ساری توجہ نثری نظم پر مرکوز کیے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے کثرت سے نثری نظمیں لکھی ہیں یا وہ لوگ جنھوں نے صرف نثری نظمیں لکھی ہیں۔ یا وہ لوگ جنھوں نے نثری نظم کے تئیں اپنے والہانہ عشق کا اظہار کیا ہے وہی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں ابھی کئی شعرا کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ناجیہ احمد، اکرام خاور، یعقوب راہی، عقیل شاداب، گلزار، اور شاہد لطیف وغیرہ یہ فہرست بھی ظاہر ہے کہ مکمل نہیں ہے جب کہ ایسے شعرا اور فنکار جنھوں نے وقتاً فوقتاً نثری نظمیں کہنے میں اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے اور کم نظمیں کہہ کر بھی اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے ان میں خورشید الاسلام، منیر نیازی، بلراج کومل، باقر مہدی، افتخار جالب، عادل منصوری، وزیر آغا، محمد سلیم الرّحمان، لطف الرّحمان، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، صلاح الدّین پرویز، پروین شیر، افتخار نسیم، وحید احمد وغیرہ کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ہم انہیں نثری نظم گو شعرا کی پہلی صف کے شعرا بھی قرار دے سکتے ہیں۔ کیوں کہ ان لوگوں کے بعد بھی دو ایسی نسلیں بساط ادب پر اپنی موجودگی درج کرا چکی ہیں جنھوں نے نثری نظمیں کہنے میں اپنی دلچسپی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ مگر ان تمام شاعروں کا ذکر یہاں ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی جہاں تک ممکن ہو سکے گا ہم ان کا ذکر ضرور کریں گے۔

احمد ہمیش کو نثری نظم میں یوں بھی اوّلیت کا حق حاصل ہے کہ وہ خود کو نثری نظم کا موجد بتاتے تھے۔ ان

کے دعویٰ کو قبول و رد کرنے کی بحث میں پڑے بغیر کہ کیا واقعی وہی اس صنف کے موجد تھے یا نہیں؟ اس بات کے اعتراف میں کوئی تکلف نہیں ہونی چاہیے کہ احمد ہمیش نے نثری نظم کے فروغ کے لیے خوب کام کیا۔ ایک طرف انہوں نے نثری نظم پر گفتگو کا ماحول بنایا اور اپنے رسالے کو ایک پلیٹ فارم کی طرح استعمال کیا تو دوسری طرف انہوں نے بہت ساری نثری نظمیں بھی کہیں اور جہاں تک ممکن ہو سکا تمام تر موضوعات پر نظمیں کہنے کی روایت قائم کی اور نثری نظم کی زبان کو نثر کے بہت ہی قریب رکھنے کی بھی کوشش کی۔ گویا انہوں نے اس بات کی تائید نہیں کی کہ نثری نظم آزاد نظم اور معرا نظم کا امتزاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود انہوں نے جو نظمیں کہی ہیں ان میں انہوں نے بہت شاعرانہ قسم کی ترکیب بندی سے بھی گریز کیا ہے۔ ہاں چھوٹے چھوٹے نثری جملوں سے اپنی نظم کی اس طرح تعمیر کی ہے کہ ایک باطنی آہنگ اور خیال کی یکسوئی کا احساس بیانیہ پن کے ساتھ قاری کے ذہن میں ضرور رچ بس جاتا ہے۔ مثلاً؛

جس جہاں میں میری آواز نے مجھے چھوڑا تھا

وہ اب میری ساعت سے پرے ہے

مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا

مشکل یہ ہے کہ آدمی بہت کچھ سن سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے

پھر بھی شاید کچھ ایسا ہی ہوتا ہے کہ

کسی بھی مرنے والے آدمی کی

آنکھوں کی لگار پر جب اس کی

جان ٹھہر جاتی ہے

تو اس کے نام کا پرندہ

اسے اچانک اڑا لے جاتا ہے

یہ موت ہوتی ہے۔ (سفر ایسا ہے کہاں کا)

احمد ہمیش کی تقریباً تمام نظموں میں بیانیہ کا احساس زندہ رہتا ہے۔ غالباً وہ ایسا شعوری طور پر کرتے ہیں، کیوں کہ اگر ابہام و اجمال اور جدلیاتی لفظوں ہی سے کام لینا مقصود ہوتا تو پھر اس کے لیے غزل کی صنف کون سی بری تھی جو نثری نظم کا تجربہ کرنے کی ضرورت پڑتی۔

احمد ہمیش جس زمانہ میں نثری نظم کے فروغ کے لیے ہر طرح کی مخالفت کے باوجود جم کر کام کر رہے

تھے اسی زمانہ میں ہندوستان میں پروفیسر صادق بھی نثری نظمیں کہنے میں پیش پیش نظر آ رہے تھے اور اپنی نثری نظموں کو غالباً شعوری طور پر ن،م، راشد کی شاعری کی زبان سے دور اور عوامی ذہن ولسان کے قریب رکھنے کے لیے نہایت آسان زبان استعمال کر رہے تھے جس میں عام بول چال کا سا انداز تو پایا ہی جاتا ہے روزمرہ استعمال ہونے والے ہندی لفظوں کا بھی بے تکلف استعمال نظر آتا ہے۔

بوڑھے کہتے تھے
ایسا بھی ایک دن داخل ہوگا بستی میں
جس کی شکل اور حلیہ جدا ہوگا
اس کی آنکھوں کے سورج کوئلہ ہوں گے
رک جائیں گے لفظ شمار
گیت اور لوریاں
سینے بنتے چلے جائیں گے ریگ زار
سوچتا تھا کتنا عجیب ہوگا وہ دن
حقیقت، سان وگمان میں نہ تھا
کہ تیرا گھر سے چلے جانا
بستی کے بوڑھوں کی زبان میں
اس دن کا آنا ہے۔ (بوڑھے کہتے تھے)
جو سوچو تو کچھ الگ نہیں
سب سوکھی اور ہری شاخیں
سب پریم کرونا دیا دھرم
استھان پتن
جو سوچو تو کچھ الگ نہیں
اس جنگل میں (اس جنگل میں)

اگر نثری نظم اردو شاعری کی اس زبان کے دائرے کو توڑنے میں کامیاب ہو جائے گی جس نے غزل

تہذیب اور غزل زبان کو آئیڈیل زبان کا درجہ دے رکھا ہے اور جسے اشرافیہ طبقہ کے لوگ حرز جان بنائے ہوئے ہیں تو یقیناً اردو شعری لسان کا دائرہ وسیع ہوگا۔ اور اردو زبان پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ عوامی حسیت اور لوک ادب اور عوامی زبان سے دور ہو کر ایک محدود دائرے میں سمٹ گئی ہے اس کی بھی تردید ہو جائے گی۔

پروفیسر صادق کے علاوہ بلکہ ان سے بڑھ کر جس شاعر نے ہندوستان میں نثری نظم کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا اور اپنی نثری نظموں کی وجہ سے اپنی شعری شخصیت کو مستحکم بنایا اسے ہم خلیل مامون کے نام سے جانتے ہیں۔ خلیل مامون چوں کہ ایک بہت پڑھے لکھے اور وسیع المطالعہ شاعر ہیں اس لیے ان کی نظمیں بھی بہت ہی تہہ دار اور ایک بالکل نئے آہنگ کی حامل ہیں۔ خلیل مامون جہاں سادہ زبان میں معمولات زندگی کے موضوعات کو نثری نظم کے پیرائے میں گہری بصیرت کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہیں وہ زندگی کے بہت ہی پیچیدہ مسائل اور تجربے کو بھی فلسفیانہ رمز کے ساتھ نثری نظم میں سمونے کا ہنر جانتے ہیں، ان کی نظمیں بہ ایک وقت تخیل کی پرواز تفکر کے عمق اور تصوّف کے گہرے نیلے آکاش کے ساتھ اس دھرتی پر سفر کرتی محسوس ہوتی ہے جہاں ہم سب بستے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی طویل نظموں کا آہنگ بار بار ٹوٹتا اور جڑتا محسوس ہوتا ہے اس کے باوجود نظم کی تاثیر میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کی خلیل مامون کی نظمیں بالخصوص طویل نظمیں اپنے ٹوٹتے آہنگ اور لہریے خیالات کے ہلکورے سے ایک بالکل الگ اور نئے قسم کے آہنگ کو جنم دیتی ہے تو غلط نہ ہوگا، مگر اسے بیان کرنا آسان نہ ہوگا؛

لفظوں کو توڑنا نہیں آیا
خوابوں سے منہ موڑنا نہیں آیا
خونخوار ہواؤں میں
گرتے رہے کالی نوکیلی چٹانوں پر
سمندر کی بھری ہوئی لہروں پر
بوند بوند ریزہ ریزہ بہتے رہے (ایک بے کار نظم)

حمید سہروردی بھی نثری نظم نگاروں کی پہلی صف کے شاعر ہیں۔ انہوں نے خلیل مامون کی طرح آزاد اور معرا نظموں کے درمیان نثری نظم کے التزام سے گریز کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثری نظمیں بہت عام فہم نہ ہوتے ہوئے بھی نثری نظم کے اس طویل سفر میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔ اور اپنی سادگی میں بھی ایک

نوع کی دبازت سے آگاہ کرتی ہیں؛

کتنے چہرے
مل کے تیرے چہرے سے
پاش پاش ہو گئے
مدعا کے لاحصول ہی رہا
جسم کے اندھیرے کنویں میں
چاند تارے ڈوبتے چلے گئے

ہم جانتے ہیں کہ ہر عہد کے اپنے اپنے مطالبے اور تقاضے ہوتے ہیں جس کی تکمیل کے لیے ادب کو بھی بدلنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ادب میں تبدیلی کبھی اندر سے آتی ہے تو کبھی باہر سے، کبھی یہ تبدیلی لہجے، اسلوب اور موضوعات کی سطح پر رونما ہوتی ہے تو کبھی ہیئت اور شعریات کی بدلتی جمالیات کی سطح پر۔ ظاہر ہے کہ ان تمام صورتوں میں تخلیقی اظہار کا پیرایہ بھی بدلتا ہے اور بسا اوقات تخلیقی اظہار کے لیے کسی نئی صنف کی آرزو بھی کی جاتی ہے جسے کچھ لوگ تو فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ مگر بیشتر لوگ ایک طرح کے کشمکش میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ یہیں سے نئی ادبی صورت حال اور تخلیقی اظہار کے نئے پیرائے اور نئی صنف کے وجود پر بحث و تمحیث کا دور شروع ہوتا ہے، جو عام طور پر ادبی جمود کو توڑنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

گذشتہ زمانوں اور صدیوں کی بہ نسبت اکیسویں صدی کچھ زیادہ ہی ہوش ربا مطالبات کی صدی ثابت ہوئی ہے اور ہونیوالی ہے۔ اس لیے اس صدی میں نئے جمالیات کی تشکیل ایک فطری عمل ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ نئے جمالیات کو نئی شعریات میں ڈھالنے کے لیے کلاسک اصناف ادب کی جگہ کسی نئی صنف کا تجربہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں تخلیقی سطح پر ہر طرح کے چیلنجوں کو قبول کرنے کی سب سے زیادہ صلاحیت نثری نظم میں ہے اس لیے اسے اکیسویں صدی کی اہم ترین صنف کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ کیوں کہ یہی وہ صنف یا تخلیقی اظہار کی ہیئت ہے جس میں زرعی عہد کی جمالیات کے اندر پیدا ہونے والے بدلاؤ سے لے کر صنعتی عہد کی جمالیات کے تقاضوں اور خلائی عہد کی جمالیات اور شعریات کو انگیخت کرنے کی صلاحیت اور پھر اسے تخلیقی پیرائے میں پیش کرنے کی کشادگی اس صنف میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ نثری نظم کے تازہ کار شعرا اس معاملے میں دوسروں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی کامیاب ہیں۔ یہاں

اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ نثر میں شعری جمالیات کا سب سے طاقتور اسلوب وہ ہے جسے ہم کتب مقدسہ میں دیکھتے ہیں یہ وہ اسلوب ہے جو ہر دور میں رائج رہا ہے اور بہت منفرد قسم کے تخلیقی فنکاروں نے اس سے تھوڑا بہت فائدہ بھی اٹھایا ہے اور اپنی انفرادیت کا احساس بھی دلایا ہے۔ نثری نظم کے تناظر میں دیکھیں تو ایسے لوگوں میں صلاح الدّین محمود سب سے ممتاز نظر آئیں گے۔ البتہ ہم اس تسلسل میں محمد اظہار الحق، ثروت حسین، افضال احمد سید، قمر جمیل، حمیدہ معین رضوی اور جاوید ندیم وغیرہ کا نام بھی لے سکتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ اس موضوع پر اختصاصی انداز میں یہاں گفتگو ممکن نہیں ہے۔

نثری نظم کی دوسری صف کے شعرا میں محمد اظہار الحق، ثروت حسین، افضال احمد سید، عبداللہ کمال، ذی شان ساحل، عبدالاحد ساز، مصحف اقبال توصیفی، عین رشید، شاہد عزیز، احتشام اختر، ارتضیٰ نشاط، ریاض لطیف، گلزار، فیاض رفعت، رفیعہ شبنم عابدی، شبنم عشائی، اور شہناز نبی وغیرہ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ ذی شان ساحل کو نثری نظم میں ایک آئیڈیل شاعر کی سی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے جس کثرت اور عمدگی سے نثری نظمیں کہی ہیں اور اسے زندگی کے سچے سلگتے واقعات کا پیکر بنایا ہے، وہ انہیں کا حصہ ہے۔ ان کی نظمیں فنی اعتبار سے بھی نثری نظم کی کسوٹی پر کھری اترتی ہیں۔ یاد رہے کہ جس طرح پابند نظم میں کسی مصرع میں کسی حرف کے گرنے سے یا بڑھ جانے سے مصرعہ بحر سے خارج ہو جاتا ہے اسی طرح نثری نظم میں کسی مصرعہ کے موزوں ہو جانے سے نثری نظم کے بیانیہ کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور بجز ذی شان ساحل کے بہت کم لوگوں کی نثری نظمیں اس کسوٹی پر کھری اترتی ہیں۔ ان کے احتیاط کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی نثری نظم میں نثر کے بھی کسی ایسے ٹکڑے کا استعمال نہیں کرتے ہیں جو ان کی نثری نظم کے بے تکلف بہاؤ میں بادھا ڈالے۔ جب کہ ان کی نظموں میں پایا جانے والا عدم انفعالیت کا احساس بھی خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ اپاہج جیسی زندگی گذارنے پر مجبور اس شاعر کے حوصلے کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی کہ وہ ساری زندگی موت سے لڑتے اور لمحہ لمحہ موت کو قریب ہوتا دیکھتے رہنے کے باوجود کبھی منفعل نہیں ہوئے اور نہ ان کی نظموں پر کسی طرح کی قنوطیت کا رنگ چڑھا۔ ایسا با حوصلہ اور زندگی سے ٹوٹ کر پیار کرنے والا شاعر ہر عہد میں معدودے چند ہی ہوتا ہے۔ اس کے حوصلوں کی اڑان یوں تو ان کی تمام نظموں میں نظر آتی ہے مگر ان کی نظمیں ''امریکہ''، ''ایک خود کش نظم''، ''کاش کوئی''، ''نجیب محفوظ کو کوئی نہیں جانتا'' اور ''چڑیوں کا شور'' وغیرہ اس نوع کی نظموں میں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی نظم ''وہ خدا'' آگ اور شعلے اور شدید ترین نفرت کے درمیان محبت کے جذبے کو پروان چڑھتا دکھاتی ہے۔ جو انسان کی ازلی خواہش ہے؛

وہ خدا جسے کوئی پسند نہیں کرتا

ایک عرب ہے اور خیمہ میں رہتا ہے

وہ تیل فروخت نہیں کرتا

اور خودکش حملے نہیں کرتا

اور سب کی مدد کرتا ہے

جب وہ شہر جاتا ہے

تو مرنے والوں کے جنازے

یا سرعرفات اور جنرل شیرون کی تصویریں

اور دیواروں پر نعرے دیکھ کے اس کے منہ میں

ریت بھر جاتی ہے

کسی کو نہیں معلوم

ایک یہودی عورت

اس سے محبت کرتی ہے

اور اسے اپنا خدا سمجھتی ہے

ذی شان ساحل کے علاوہ جن لوگوں نے کثرت سے نثری نظمیں کہی ہیں ان میں شبنم عشائی، شاہد عزیز ،اعجاز احمد، عین رشید، وغیرہ کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ خالص نثری نظموں کے حوالہ سے اپنی مستحکم شناخت بنانے والوں میں ان شعرا کا نام اپنے ہمعصروں میں ہی نہیں پیش روؤں میں بھی کافی نمایاں ہے۔ مگر یہ بھی درست ہے کہ بعض شعرا کم نثری نظمیں کہنے کے باوجود یاد کیے جاتے ہیں اور خوب یاد کیے جاتے ہیں۔ بالخصوص محمد اظہار الحق، ثروت حسین، افضال احمد سید، وغیرہ یاد رہے کہ یہ وہ شعرا ہیں جنہوں نے غزل میں ایک نئے آہنگ کو فروغ دیا اور اسلامی تہذیب وتمدن، معاشرت اور تاریخ کے زائیدہ الفاظ وتراکیب اور حسیت سے آسودہ لفظوں کے استعمال سے ایسا شعری آہنگ اور لحن اور رزمیہ لہجہ خلق کیا ہے جو آج اردو غزل میں داستانی اسلوب کا استعارہ سمجھا جاتا ہے، ان شعرا کے اس اختصاصی رنگ کے چھینٹے کسی نہ کسی شکل میں ان کی نظموں پر بھی پڑے ہیں جو ان کی نظموں کو بھیڑ سے الگ خاص طرح کی شناخت بخشتے ہیں۔ بالخصوص ثروت حسین اپنے ہمعصروں کی شعری لسانیات کے تناظر

میں یوں ممتاز نظر آتے ہیں کہ وہ دوسروں کی بہ نسبت لفظوں کے درمیان انوکھے رشتے دریافت کرنے کا زیادہ گہرا شعور رکھتے ہیں اور پھر اس سے اپنے تخلیقی اظہار کا ایسا دلکش پیرایہ تراشتے ہیں کہ پڑھنے والا مسرور و مبہوت رہ جاتا ہے، بقول قمر جمیل ایسا لگتا ہے وہ اپنی شاعری آب گہر سے لکھتا ہے اس کے سخن میں مٹی کی خوشبو اور محبوب کا بچن ہے اور یہی اس کی شاعری کا آب حیات ہے۔ ہجر ہو یا وصل وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہے اور جب ہم اس کی شاعری پڑھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کبھی ہم سندھ کا صحرا ہیں اور کبھی پاک پٹن کا گنداراس کے ہاں جائے نماز آپ کو ملے گی اور دور تک یہ آواز آپ کے سامنے گونج رہی ہوگی۔ اور جس جگہ سے تو نکلے منہ کی طرف مسجد حرام کے یہی تحقیق ہے تیرے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں تیرے کام سے اور جہاں سے تو نکلے منہ کر طرف مسجد الحرام کی طرف اور جس جگہ تم ہوا کرو منہ کرو اسی کی طرف کہ نہ رہے لوگوں کو تم سے جھگڑنے کی جا''

ثروت حسین ایک سحر کار شاعر تھے۔ وہ جس موضوع کو بھی برتتے تھے اسے اتنا دلکش اور دلپذیر بنا دیتے تھے کہ وہ براہ راست قاری کے دل میں اتر جاتا تھا۔ ان کے لیے نظم کا آغاز کرنا اور اسے انجام تک پہونچانا ایک دلچسپ تخلیقی عمل ہے۔ اسی لیے تو وہ کہتے ہیں کہ

ایک نظم کہیں سے بھی شروع ہو سکتی ہے
جوتوں کی جوڑی سے
یا قبر سے جو بارش میں بیٹھ گئی ہے
یا اس پھول سے جو قبر کی پائنتی پر کھلا ہے
ہر ایک کو کہیں نہ کہیں پناہ مل گئی
چیونٹیوں کو جائے نماز کے نیچے
اور لڑکیوں کو میری آواز میں

اردو کی دوسری اصناف کی بہ نسبت نثری نظم کی یہ انفرادیت ہے کہ اس کے یہاں تعداد کے اعتبار سے عورت اور مرد قلمکاروں میں بعد قطبین نہیں پایا جاتا ہے۔ ممکن ہے اس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ ہو کہ عورتیں جو مردوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی پابند زندگی جینے پر مجبور ہوتی ہیں، انہیں نثری نظم کی آزاد فضا ان کے اپنے مزاج اور ان کی اپنی آرزوؤں کا جہان معلوم ہوتی ہو۔ معاملہ کچھ بھی ہو مگر اتنا طے ہے کہ نثری نظم کے فروغ میں خواتین قلمکاروں نے خوب خوب حصہ لیا ہے اور اپنی انفرادی تخلیقی بصیرت اور فراست کے ساتھ ساتھ نجی تجربات کو بھی اپنی شاعری کا

حصہ بنایا ہے۔ شبنم عشائی، شہناز نبی، عذرا عباس، عذرا پروین، ناجیہ احمد، نسرین انجم بھٹی، فاطمہ حسن، حمیدہ معین رضوی، حمیدہ شاہین، آشا پربھات، بشریٰ اعجاز، نجمہ منصور اور شائستہ یوسف وغیرہ ایسی نثری نظم گو شاعرہ ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

شبنم عشائی خالص نثری نظموں کی ایک پختہ کار اور فنی اظہار پر کامل اختیار رکھنے والی ایسی شاعرہ ہیں جن کی نظموں میں فلسفیانہ رنگ کی آمیزش جا بجا دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ مگر وہ جدیدیت والی وجودیت پر اصرار کرنے کے باوجود دوسرے مسائل پر بھی توجہ کرتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ عام طور پر اپنے وجود سے پھوٹنے والی نرم گرم خوشبو اور دکھ درد کی لپک اور سماج و معاشرے اور گھر آنگن میں عورتوں کے کردار کو نظر انداز کرنے کے کرب کو اپنی شاعری کا موضوع بناتی ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری نسائیت کی ایک طاقتور آواز بن کر ابھرتی ہے۔ کبھی کبھی شبنم عشائی کی نظم بہت ہی شانت، خاموش اور ہر طرح کے ہیجان سے پاک محسوس ہوتی ہیں۔ مگر جب توجہ کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تہہ میں ایک اضطراب اور ایک طوفان کی آمد کا احساس موجود ہے، جو قاری کو بھی سراسمگی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور وجودیت کی قبر کا نوحہ اندر سے باہر تک گونج اٹھتا ہے۔

وجود کے جو حصے
وجود کی تلاش میں کھو جاتے ہیں
ان کا اندراج
زندگی کی کسی بھی فائل میں نہیں ملتا
ہاں ان نظموں میں
جو آنسوؤں کی روشنائی سے لکھی گئی ہوں
وہ حصے بستے ہیں
لیکن پھر ہمیں تاریکی کو
اپنا نشیمن بنانا پڑتا ہے
اس راز سے زندگی نہیں
وجود واقف ہے
اور ہم وجود نہیں

زندگی جیتے ہیں

شہناز نبی کی نظموں میں بھی نسائیت والی عدم اطمینانی کا احساس پایا جاتا ہے مگر ان کے یہاں سیاسی بصیرت اور سماجی سروکار کے موضوعات بھی راہ پاتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی واضح کردوں کہ شبنم عشائی اور شہناز نبی کے یہاں تانیثیت والے موضوعات کی سطحی گونج نہیں پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ عذرا عباس کے یہاں پائی جاتی ہے۔ یا قدرے مختلف سطح پر عذرا پروین اور سارا شگفتہ کے یہاں پائی جاتی ہے۔ شہناز نبی کے یہاں نسائی احساس رومانی انداز بیان اور سیاسی شعور کا رنگ آپس میں اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ ان کی نظمیں اپنی سطح سے کافی بلند معلوم ہونے لگتی ہیں۔

وہ اب تک سوکھے ہوئے پتوں کی مردہ نسیں ٹٹولتے ہیں

یہاں ہری کونپلوں سے سارا جنگل مہک اٹھا ہے

چڑیاں آسمان سر پہ اٹھائے گھوم رہی ہیں

سنگ بستہ پیکروں سے گفتگو کا عمل جاری ہے

کوئی رابطہ انہیں بھی تراشے گا

براہ راست گفتگو سے دوست ناراض ہو جاتے ہیں

ہم نے دشمنوں سے مکالمہ کیا

اور خوش گمانی سے نکلنے کا راستہ سامنے تھا　　　　(میرے دوست مجھ سے خفا ہو گئے)

اس میں شبہ نہیں ہے کہ شائستہ یوسف بھی ایک نہایت زرخیز شاعرہ ہیں۔ اور خوب نظمیں کہتی ہیں۔ خلیل مامون نے ان کی نظموں کو مضطرب روح کی پکار قرار دیا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ حالت اضطراب میں آدمی سے جو کچھ سرزد ہوتا ہے اس میں اس کے دلی کیفیت کا عکس پوری سچائی کے ساتھ چھلکتا ہے کیوں کہ اس میں اس کے حزم واحتیاط، ریا، اور فنکارانہ ہنر واحساس کو اتنا دخل نہیں ہوتا ہے جتنا اس کی ذہنی تربیت اور جہلّت کی عقوبت و عفونت کو سو یہ ساری چیزیں شائستہ یوسف کی نظموں میں بھی نظر آتی ہیں، جو ان کی نظموں کو متنوع بناتی ہیں اور رنگا رنگی کا احساس بھی جگاتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی نظموں کا بعض رنگ آنکھوں میں کھب جاتا ہے تو کچھ رنگ اور رنگوں کی آمیزش سے شاعری کا جہان دہک اٹھتا ہے۔ جبکہ نظموں میں سمویا سچا سلگتا جذبہ اور واقعہ اور اس کا اظہار بسا اوقات زبان کے کچے پن کی نمی کی وجہ سے قاری کے دامن دل پر نشان بھی چھوڑ جاتا ہے۔ مگر یہ اپنے باکرہ پن کا

احساس کبھی کبھی ہی دلا پاتا ہے۔ اس لیے ان کی شاعری کے مطالعے کے دوران قاری بھی ایک بے نام سی خلش اور اضطراب کا شکار ہو جاتا ہے۔ جسے ہم نظم کی قرأت میں قاری کی شمولیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

تیری محبت تیرے احساس اور تیرے لمس نے

مجھ میں چھپی نسا کے حقوق کا التماس کیا

پھر زمان اور مکان ہماری بند آنکھوں میں سما گئے

اچانک جزیہ وصول کرنے والے سپاہی آدھمکے

ہمارے دل سزا کے خوف سے لرز گئے

اس کو کوڑے لگائے گئے

ایک ایک کوڑا میری روح کو زخمی کرتا رہا

مجھ پر پتھر برسائے گئے

وہ سو کوڑے کھانے کے بعد

خون میں شرابور بدن لئے مجھ سے لپٹ کر

ہر پتھر کا وار سہتا گیا (سنگسار)

نصیر احمد ناصر نثری نظم کا ایک ممتاز نام ہے، یوں تو انہوں نے ہر نوع کی نظمیں لکھی ہیں اور زندگی کی تمام کروٹوں کو سمجھنے اور اپنی نظموں میں سمونے کی کوشش کی ہے مگر ان کی ''خواب سیریز'' کی نظموں کا اپنا مقام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی ان کی نثری نظموں کا ذکر ہوتا ہے ان کی ''خواب سیریز'' کی نظموں کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ ذوقی غالباً ان کی ''خواب سیریز'' والی نظموں ہی کی بدولت انہیں اپنا پسندیدہ شاعر قرار دیتے ہیں۔

ایک بار کسی کی تصویر کھینچتے ہوئے

کیمرہ میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا تھا

تب مجھے پتہ چلا

کہ خواب روشنی میں سیہ کیوں ہو جاتے ہیں

انہیں ایکسپوز کرنے کے لیے اندھیرے کا محلول کیوں ضروری ہے

روشنی تاریکی ہی میں نظر آتی ہے

بہتے پانی کی کوئی شکل نہیں ہوتی
شکلیں ہماری آنکھوں میں ہوتی ہیں

فاطمہ حسن نے کم عرصے میں نثری نظم میں بڑی مستحکم پہچان بنائی ہے۔ فاطمہ حسن کی نظمیں بھی نسائی احساسات کی حامل ہیں۔ مگر ان کے یہاں نسائیت کی اس زخمی روح کی تڑپھڑاہٹ اور بغاوت نظر نہیں آتی ہے جو مثلاً سارا شگفتہ، اور عذرا عباس وغیرہ کا امتیازی وصف سمجھا جاتا ہے۔ فاطمہ حسن نسائی احساسات کے اظہار کو ہی اپنی شاعری کا جوہر نہیں سمجھتی ہیں کیوں کہ وہ خود کو عورت ہونے سے پہلے ایک ہستی، ایک انسانی وجود سمجھتی ہیں اور اسی تناظر میں زندگی کو دیکھتی ہیں۔ بقول شاہدہ حسن؛

فاطمہ کی شاعری کا بنیادی احساس ایک کیفیت ملال ہے جس میں اس کی نا آسودگیوں خلشوں اور اندرونی انتشار کی ایک مہذب عورت سامنے آتی ہے اس کے ملال کے گرد ایک کبھی نہ ختم ہونے والی خوشی کے انتظار کی جو کیفیت ہے وہ اس کے دکھ کو اور گہرا کرتی ہے اور اپنے قاری کو تادیر اپنی ذات کی سچائیوں میں محو رکھتی ہے۔

ندی اب پہاڑوں کے جانب چلی ہے
جہاں ایک چشمہ چٹانوں میں تنہا کھڑا منتظر ہے
ندی اس کی آغوش میں گر کے سو جائے گی
اور رز میں دیر تک اس کی یادوں سے بھیگی رہے گی (نیا سفر)

وہاں بہت سے موتی تھے
میں نے سمیٹا ہار پرویا اور گلے میں پہن لیا
پھر مجھ کو معلوم ہوا وہ پتھر تھے
موتی میری آنکھوں میں تھا
جس کے عکس سے سارے پتھر چمک رہے تھے (اب پتھر صرف پتھر ہیں)

یہاں پر دوسری صف کے جن شاعروں کا اب تک ذکر ہوا ہے ان میں سے بیشتر شعرا کا تخلیقی سفر ابھی جاری ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نثری نظم کی پہلی صف کے شعرا میں سے بھی اس وقت کئی شعرا اتنے فعال ہیں کہ بعض تازہ کار شعرا بھی ان سے قدم ملا کر چلنے کی تاب نہیں رکھتے ہیں۔ مگر اچھی اور تسلّی کی بات یہ ہے کہ نثری نظمیں کہنے والے شعرا کے یہاں کسی قسم کی یکسانیت کا احساس نہیں پایا جاتا ہے اور نہ نثری نظم ادبی اور تخلیقی ہتھیاروں کے نت

نئے استعمالات سے محروم نظر آتی ہے۔ جبکہ زبان و بیان کی سطح پر بہت تنوع پایا جاتا ہے۔ اور نظم کی تشکیل کے لیے استعمال ہونے والے لسانی تفاعل کے رنگ بھی بہت دلکش نظر آتے ہیں۔

نثری نظم کی تیسری صف کے شعرا میں جو لوگ اپنی تخلیقی انفرادیت کی وجہ سے نمایاں نظر آتے ہیں، ان میں نصیر احمد ناصر، ابرار احمد، جمیل الرّحمان، خورشید اکرم، علی محمد فرشی، تابش کمال، جینت پرمار، ساجد حمید، خورشید اکرم، مشرف عالم ذوقی، صدیق عالم، اشہر ہاشمی، خالد عبادی، سہیل اختر، شارق عدیل، زبیر شاداب اور کوثر جہاں وغیرہ کا نام شامل ہے۔

خالص نثری نظمیں کہنے والے تازہ کار شعرا میں جو اہمیت صدیق عالم، خورشید اکرم اور علی محمد فرشی وغیرہ کو حاصل ہے وہی اہمیت نظم میں دلت شعور کو برتنے کے معاملے میں جینت پرمار کو حاصل ہے۔ وہ آزاد اور نثری دونوں نظمیں کہتے ہیں۔ مگر ان کی آزاد نظمیں بھی اپنے بیانیہ کے بہاؤ اور زبان کے دیہی سبھاؤ کی وجہ سے نثری نظم کے بہت قریب آ جاتی ہیں جبکہ ان کی نثری نظمیں اپنی سادگی اور حقیقت بیانی اور زندگی کی بہت ہی سچی تصویر کشی کی وجہ سے دل پر نقش ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ان کے بیانیہ میں جو ایک طرح کا تیکھا پن اور آنسوؤں میں لپٹے شعلوں کی تپش کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ان کے نجی تجربے اور گہرے مشاہدے کا عطیہ ہے۔ ان کے یہاں مختلف قسم کے پیکروں، منظروں اور تصویروں کا ایسا نگار خانہ آباد ہے کہ قاری دیر تک ان سے جدا ہونے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے۔ جو بہر حال ان کی نظم نگاری کی کامیابی کی دلیل ہے۔

سورج اگنے سے پہلے
جلا رہی تھی چولہا
دھواں سانس میں جاتے ہی
کھانس پڑا تھا چندا
چرپائی سے جاگ پڑا میں
کٹیا میں گھستے ہی دیکھا
چولہے میں لکڑی کی جگہ
ماں جلتی تھی (ماں)
منوا

اک نہ اک دن
گھر کے آگے
نیم کی شاخ پہ ننگا کر کے
لٹکا دوں گا تجھ کو منوا
تیری رگوں کو چیر پھاڑ کر دیکھوں گا
تو نے پیا ہے کتنا لہو
میرے بزرگوں کا

(منو)

جینت پرمار کی نظمیں ''دلت کوی'' سپنا دیکھنے والے ہاتھ، پیٹھ، منو تری قسمت ہے کالی، وغیرہ ہندوستان میں دلتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے اطوار کا عکس ریزہ ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ جینت پرمار کے یہاں دوسری نوعیت کی نظمیں نہیں ہیں۔ ہیں مگر ان کی نظمیں عام طور پر دلت حسیت سے آزاد نہیں ہو پاتی ہیں۔ ''میری بستی میں شام''، ''سورج کی بیاض'' اور بھی بہت ساری نظمیں ایسی ہیں جو دلت کلچر اور دلت ادب کا آئینہ معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ جینت پرمار ایک اچھے مصوّر بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ان کی نظمیں مختلف قسم کی تصویروں کا البم بھی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ جو بہر حال ان کی تخلیقی انفرادیت کو استحکام بخشتی ہیں۔

خورشید اکرم ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں، ان کو نثری نظم نگاروں میں اس وجہ سے انفرادیت حاصل ہے کہ وہ پہلے ایسے نظم نگار ہیں جنھوں نے خالص عشقیہ نظمیں کہہ کر اور محبت کی مختلف کیفیتوں کو اپنی نظموں میں ڈھال کر اور عشق کے بہت سے اندیکھے خوابوں کو حسی پیکروں میں بدل کر نثری نظم کے سرمایہ میں اضافہ کیا ہے۔ ان کی کتاب ''پچھلی پیت کے کارنے'' نثری نظم کی ایسی کتاب ہے جسے شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر دم لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ نثری نظموں کا اس قدر اثر انگیز ہونا کہ وہ قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لے فطری تخلیقی بیانیہ کا اعجاز ہے۔ نثری نظم کی اس طرح کی کامیابیوں نے ہی اس کے مخالفوں کو معاونوں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے اور اکیسویں صدی میں اس کے روشن مستقبل کی ضمانت دی ہے؛

میں نے تمرے ماتھے پہ
چاند کی بندیا ٹانکی

اور مری آنکھوں میں تم
آنسو بن کر چمکے

(چاند کی بندیا)

سرہانے
میری نیند پہ آنکھ جمائے
کون بیٹھا ہے
اچھا! تو یہ تم ہو
مرحبا! (بے یقین دنیا میں)

خورشید اکرم کی طرح علی محمد فرشی اور تابش کمال بھی غالباً خالص نثری نظموں کے شاعر ہیں۔ یا پھر یوں ہے کہ نثری نظمیں ان کی تخلیقی افتاد کی پہلی پسند ہے۔ علی محمد فرشی کی نظموں کی زبان گرچہ سادہ ہے اور بیانیہ کی خوبیوں سے بھی آراستہ ہے مگر ان نظموں کے باطن سے ایک عجیب دلکش شعریت اور جادوئی کیفیت کا احساس پھوٹتا محسوس ہوتا ہے، جو آپس میں گھل مل کر اتنے سارے پیکر خلق کر دیتے ہیں کہ ہم کسی اور ہی دنیا میں پہونچ جاتے ہیں۔ ان کی نظموں کے مطالعے کے دوران ہمیں یاد ہی نہیں رہتا ہے کہ ہم نظموں کا مطالعہ کر رہے ہیں یا رنگا رنگ قسم کی تصویروں کے نگار خانے کی سیر سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ کچھ یہی حال تابش کمال کی نظموں کا بھی ہے مگر نثری موسیقیت کا جو احساس علی محمد فرشی کی نظموں میں پایا جاتا ہے وہ تابش کمال کے یہاں خال خال دیکھنے کو ملتا ہے۔ البتہ امیجری کی تخلیق کے معاملے میں کوئی کسی سے کم نہیں ہیں۔

موٹے اونی کمبل میں
سورج کی لاش لپیٹے بیٹھی
گونگی بہری رات کی آنکھوں سے
مٹیالی ریت برستی ہے
بجریلے میدانوں میں قبریں اگنے لگتی ہیں
اور میں خوابوں کے کتبے
پڑھتے پڑھتے سو جاتا ہوں

اب تابش کمال کی نظم کا بھی ایک ٹکڑا دیکھ لیجیے

سرخ آنکھیں گھماتے ہوئے بھیڑیے رات کا حسن ہیں

سرسراتے ہوئے شاخچوں میں چھپے ماندہ پنچھی

مصلّے پر بیٹھے ہوئے ریش دار اہل باطن

پنگھوڑے میں کلکارتے نور چہرے

یہ بستر بدلتی ہوئی لڑکیاں

زہر اگلتے ہوئے سانپ

دیوار پر جست کرتے ہوئے سائے

لڑتی ہوئی بلیاں رات کا حسن ہیں

(قصہ شب)

اکیسویں صدی کے فعال شعرا میں ساجد حمید بھی توجہ کے حقدار ہیں، انہوں نے بھی بہت ساری نثری نظمیں کہی ہیں اور اپنی غزلوں کی طرح اپنی نظموں میں بھی لفظوں کو برتنے کے طریقے اور پرانے لفظوں سے اپنے نئے تجربوں کی ترسیل کا کام لینے کے سلیقے اور نئے آہنگ کی جستجو کی وجہ سے متاثر کرتے ہیں۔

گھٹنوں اور کہنیوں کے بل چلتے چلتے

جب سائے گھنے ہو جاتے ہیں

اور جنگل بولنے لگتا ہے

تب سانسوں کی سرسراہٹ سے بھی

جی لرزنے لگتا ہے

روشنی چرا کر اپنی مٹھیوں میں قید کرنے والے

جب قہقہے اچھالتے ہیں

اندھیرے اور گہرے ہو جاتے ہیں

رینگنا موقوف مت کرو

سفر جاری رہے۔

خالد عبادی نئی نسل کے بہت ہی ذہین اور خلاق شاعر اور قلمکار ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی غزلوں اور نظموں کی وجہ سے ایک خاص طرح کی انفرادیت رکھتے ہیں بلکہ اپنے فکر انگیز مضامین کی وجہ سے بھی ممتاز نظر آتے ہیں۔ کم سے کم لفظوں میں بہت کچھ کہہ جانے کا جو ہنر اور سلیقہ ان کے پاس ہے وہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ کچھ یہی خوبی ان کی نثری نظموں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ان کی مختصر نثری نظموں کے عواقب میں اتنا سب کچھ ہوتا ہے کہ اس کی تفصیل فراہم کرنے کی کوشش کی جائے تو گفتگو بہت طویل ہو جائے گی۔ اور اتنی بات تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ کم لفظوں میں بہت کچھ وہی لوگ کہہ پاتے ہیں جن کا مطالعہ، مشاہدہ اور تفکر بہت ہی طاقتور ہوتا ہے۔ ایک اور بات جو انہیں شعرا کی بھیڑ میں ضم ہونے سے بچاتی ہے وہ ان کے لہجے کی شائستگی میں چھپی ان کے اندر کی آگ ہے جو اندر ہی اندر ہڈیوں میں اتر جاتی ہے۔ یہ آگ کبھی بغاوت کا احساس دلاتی ہے تو کبھی ہماری اجتماعی بے حسی کے لیے آزمائش بن جاتی ہے، اور کبھی کبھی زندگی کی یافت کا بے پایاں حوصلہ بخش جاتی ہے۔

کون سے دن نہیں مارے جاتے تم
کہاں نہیں مچتا کہرام
یہاں ابھی چند گھنٹے پہلے
بھون ڈالے گئے ہیں دو معصوم
لاشوں پر رو رو کر ادھ موئی ہو چکی ہے ماں
باپ اس سرحد کی طرف دیکھتا ہے
جدھر سے آئے تھے دشمن
وہ رونا نہیں چاہتا
سنگینوں کو سہنے کے لیے
سینے کا پتھر ہونا ضروری ہے

(رونا نہیں چاہتا)

عبادی کی نثری نظموں کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ وہ نہایت تسلسل سے آگے بڑھتی ہے اور پوری شدّت تاثیر کے ساتھ اختتام کو پہنچتی ہے۔ مثال کے لیے ان کی نظمیں ''صاحبان'' اور ''نہ دیکھا نہ سنا'' اور بہت ساری وہ نظمیں دیکھی جا سکتی ہیں جو رسالوں میں بکھری ہوئی ہیں۔

صدیق عالم کے یہاں تاریخی رمزیت سے آسودہ بیانیہ رنگ بہت حاوی نظر آتا ہے، جو بسا اوقات ان کی نظموں کو دستاویزی اہمیت کا حامل بنادیتا ہے۔ جمیل الرّحمان اور ابرار احمد کے یہاں تخلیقی سطح پر ایک گہری بصیرت اور اس بصیرت سے پھوٹنے والی روشنی کا احساس بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ عام طور پر جمیل الرّحمان اور ابرار احمد کی نثری نظمیں نثری نظم کی تمام تر خوبیوں سے آسودہ ہوتی ہیں۔ یاد رہے کہ یہ دونوں صرف نثری نظم کے شاعر ہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ نثری نظم کے ناقد اور پارکھ کی حیثیت سے بھی یاد کیے جاتے ہیں۔

اشہر ہاشمی کی نثری نظموں میں کہانویت کا احساس نمایاں نظر آتا ہے۔ مگر یہ حکائی آہنگ کے ساتھ سامنے نہیں آتی ہیں۔ ہاں محبت کے رمز اور اس کی تاثیر سے پوری شخصیت کے بدل جانے کی کہانی ضرور بیان کرتی ہیں وہ بھی اس طرح کہ اس کے تقدس کا احساس بڑھ جاتا ہے۔

شارق عدیل کے یہاں زندگی کے گوناگوں مسائل کا عکس ہی نظم کی بافت کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں تخیل کی پرواز اور حقیقت کے التزام کے ساتھ زندگی کی ظاہری ہیت کذائی کا طواف کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

اکیسویں صدی میں نثری نظم کے فعال اور تازہ کار شعرا میں سہیل اختر خصوصی توجہ کے حقدار ہیں ان کی نظموں میں عام طور پر قدروں کی پامالی کے پس منظر میں زندگی کے زیاں کا احساس اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ شاعر کا دکھ اس کی نظموں کے بین السطور سے رسنے لگتا ہے اور قاری آج کی مادی زندگی کی کثافت میں لت پت سچے جذبوں کے قاتل اور تخلیقی حرمت کے منکر لوگوں کا چہرہ آسانی سے شناخت کر لیتا ہے، اس کے باوجود ان کی نظموں میں بہت کچھ ایسا بچ جاتا ہے جسے ماوراء گرفت کہا جاسکتا ہے۔ سہیل اختر کی نظموں کی زبان بھی اتنی سادہ پرکشش اور رواں ہوتی ہے کہ نظمیہ بیان پر کوئی حرف نہیں آتا ہے۔ وہ آج کی اس اشتہاری تہذیب کی خوگر دنیا میں اچھی قدروں کے گم ہونے پر جب اپنا شدید ترین احتجاج درج کراتے ہیں تب بھی وہ حد ادب سے باہر نہیں نکلتے ہیں۔ ہاں اپنے قاری کے دل میں ایک خلش ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔

میری نظم

اخبارات و رسائل اور کتابوں کی دنیا سے

بہت بدکتی ہے

پکی روشنائی میں چھپنا

اسے عریاں ہونے جیسا لگتا ہے

پکی روشنائی کی دنیا میں

نظموں کی تو صرف

عصمت فروشی ہوتی ہے

(میری نظم)

مشتاق صدف ایک ہمہ جہت قلمکار ہیں۔ وہ عام طور پر اپنی غزلوں کے لیے ہی یاد کیے جاتے ہیں۔ مگر انہوں نے جو نثری نظمیں کہی ہیں وہ بھی لائق توجہ ہے۔ ان کی نثری نظمیں عام طور پر جبر سے نجات کی کوشش اور پرسکون اور پسندیدہ گھر کی خواہش کی زائیدہ محسوس ہوتی ہیں۔ مگر وہ فنی طور پر ناقص نہیں ہوتی ہیں۔

چوکور دیواروں سے ہی نہیں

گول دیواروں سے بھی

بنایا جا سکتا ہے

سستا گنبد نما گھر

مجھے چھت نہیں

پورا گھر چاہیے

گول دیواروں والا گھر

(گول دیواروں والا گھر)

ظاہر ہے کہ اکیسویں صدی میں نثری نظم نے جتنے شعرا پیدا کیے ہیں ان تمام کا ذکر ممکن نہیں ہے۔ ذکر تو بڑی بات ہے ان تمام شاعروں کے نام کی فہرست فراہم کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ اس سے واضح ہے کہ آج اکیسویں صدی میں نثری نظم اپنے پورے قد کے ساتھ ادب کی بساط پر قائم ہو چکی ہے۔ ایک اور بات کی وضاحت کردوں کہ اس مضمون میں جتنے شعرا کا ذکر آیا ہے ان میں سے چند ایک مرحوم شعرا کے علاوہ سبھی فعال ہیں۔ اور اپنی عمر کی پختگی کے باوجود خوب خوب نثری نظمیں لکھ رہے ہیں۔ اس لیے بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اکیسویں صدی نثری نظم کی صدی ہوگی بھلے سے اسے کتنے ہی اوسر گھاٹی سے گذرنا پڑے۔

تحریک آزادی اور اخبار 'مدینہ' بجنور

ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی

موبائل : 9990121625

صحافت اور تحریک آزادی یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ بالالفاظ دیگر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ناگزیر ہے۔ ہندوستان میں صحافت بالخصوص اردو صحافت نے جب سے آنکھیں کھولیں ظلم وجبر، ہٹ دھرمی وناانصافی، انگریزی حکومت کی بربریت اور ان کے ناپاک ارادوں کے خلاف کبھی دبی تو کبھی واضح اور صریح لفظوں میں آواز بلند کی۔ ہندوستان میں صحافت کی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ تحریک آزادی یا انگریز دشمنی کو ہوا دینے میں اردو صحافت نے جو انتھک کوشش کی وہ دوسری زبانوں میں شائع ہونے والے ہندوستانی اخبارات کو نصیب نہ ہوسکا۔

تحریک آزادی میں اخبار ''مدینہ'' بجنور کی کارکردگی پر گفتگو کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اخبار کے متعلق چند باتیں گوش گزار کردی جائیں۔ یہ اخبار یکم مئی ۱۹۱۲ میں بجنور سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے مدیر اور مالک مولوی مجید حسن بجنوری تھے۔ یہ اخبار تقریباً چونسٹھ برس یعنی ۱۹۷۴ تک مسلسل ملک کی خدمت انجام دیتا رہا۔ اخبار 'مدینہ' بجنور کے مدیران کی فہرست پر نگاہ کی جائے تو وہ بھی تقریباً تیس تک پہنچتی ہے، جن میں آغا رفیق بلند شہری، حامد الانصاری غازی، ابوسعید بزمی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ضیاالحسن فاروقی، قاضی عدیل عباسی، عثمان فارقلیط اور امین احسن اصلاحی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اخبار 'مدینہ' بجنور (یکم مئی ۱۹۱۲ تا ۱۹۷۴) نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں ہر اعتبار سے بھرپور حصہ لیا۔ ابتدا تا آخر اس اخبار نے کبھی حق کی مخالفت یا باطل سے دب کر اپنے اصولوں سے روگردانی نہیں کی۔ البتہ بعض اوقات لہجے میں تبدیلی کو ضرور روا رکھا تا کہ انگریزی حکومت کے عتاب اور بندشوں سے بچ کر ملک وقوم کی بدستور خدمات انجام دی جاسکے۔ دخول ہند کے بعد انگریز اس حقیقت سے واقف ہوچکے تھے کہ یہاں کا قیام ہر اعتبار سے ان کے لیے سودمند ہے۔ لہٰذا ہندوستان کی سرزمین پر اپنے قدم جمانے کے لیے انھوں نے مختلف قسم کے حربے استعمال کرنے شروع کردیے۔ بالآخر جس کا خدشہ تھا ظاہر ہوا اور انگریزی حکومت اپنے پورے جبر وتشدد کے ساتھ ہندوستان پر قابض ہوگئی۔ ہندوستان کی اہمیت انگریزوں کی نگاہ میں کس قدر تھی اس کا اندازہ اخبار 'مدینہ'

بجنور کے درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''ہندوستان کا رقبہ اور وسعت سلطنت انگلشیہ کے واسطے بڑی کا آمد ہے۔اس کی حالت مثل محراب کے درمیانی پتھر کی ہے۔...ہم گورنمنٹ سے باادب عرض کرتے ہیں کہ اگر ہندوستان واقعی محراب کا درمیانی پتھر ہے تو اور زیادہ دست کرم کو دراز فرمایئے اور ہماری خواہشات پر نظر توجہ ڈال کر شاد کام بنایئے۔'' [1]

مندرجہ بالا اقتباس کے ذریعہ اخبار 'مدینہ' نے ایک جانب ہندوستانیوں کو ان کی اہمیت اور قدر و قیمت سے متعارف کرایا تو دوسری طرف دبی زبان میں حکومت کو بھی اس سے آگاہ کردیا کہ اگر واقعی ہماری اہمیت اور ضرورت آپ کی نگاہ میں مسلم ہے، تو ہماری خواہشات اور ضروریات پر توجہ فرمائیں، ورنہ ہوسکتا ہے یہی رعایا جو اب تک خاموش بیٹھی ہے دوبارہ آپ کے لفظوں میں ''بغاوت'' پر آمادہ نہ ہو جائے۔لیکن حکومت تو اپنے زعم میں تھی۔اسے رعایا کی فلاح و بہبود سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ان کا اولین مقصد دولت اور صرف دولت سمیٹنا تھا۔اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے جس طرح کے رویے اختیار کر رکھے تھے اس کی شہادت سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔الغرض یہ کہ حکومت کی طرف سے جبر و تشدد کا سلسلہ جاری رہا اور عوام کے صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز سے لبریز تر ہوتا گیا۔بالآخر سوئی ہوئی ہندوستانی قوم نے کروٹ لی اور ایک کے بعد ایک تحریک حکومت کی مخالفت میں رونما ہونی شروع ہوئی۔ان تمام تحریکوں کو عوامی سطح پر مقبول بنانے میں اردو صحافت بالخصوص اخبار 'مدینہ' بجنور نے نمایاں کردار ادا کیا۔علاوہ ازیں حالات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مختلف قسم کے موضوعات کو اس اخبار نے اپنے صفحات میں جگہ دی۔ان میں بعض موضوعات ایسے تھے جس پر عوام تو درکنار خواص بھی غلط فہمی کے شکار تھے۔ بالفاظ دیگر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حکومت یا ان کے دلالوں کی طرف سے چند اہم موضوعات کو عوام کے سامنے توڑ مروڑ کر اس انداز سے پیش کیا جا رہا تھا کہ حقیقت کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی تھی۔ان ہی موضوعات میں سے ایک 'حریت' اور 'آزادی' بھی تھی۔اگر ہم اس کے لغوی معنی پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ دونوں معنی کے اعتبار سے مشترک ہیں یعنی ''غلامی کے بعد آزادی'' لیکن اسے عوام کے سامنے کس انداز سے پیش کیا جاتا رہا تھا ملاحظہ فرمائیں:

''حریت اور آزادی کا مفہوم اس وقت مختلف الخیال لوگوں کے ذہن میں مختلف صورت رکھتا ہے۔ جو لوگ بہت زیادہ پرانے خیال کے ہیں اور دنیا کے سیاسی حالتوں کا انھیں علم نہیں وہ تو حریت اور آزادی اس کو سمجھے ہوئے ہیں کہ انسان مذہب سے آزاد ہو کر خود روز زندگی بسر کرے جس کی تفصیل ہم نے کسی موقت ایشو ماہوار رسالہ

میں ان الفاظ میں پائی کہ حریت الحاد و دہریت کے دوش بدوش ہے۔ لوگ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلعم کو طاق نسیاں پر رکھ کر ملحدانہ اور لغویانہ تعلیمات کو اپنا استاد اور رہبر سمجھ کر اصول اسلامی کی بیخ کنی میں مصروف ہو گئے۔ اسلامی تعلیمات کو دقیانوسی خیالات کا لقب عطا ہوا۔ مسلمات اسلامی کا انکار کیا گیا۔'' ۲

مندرجہ بالا اقتباس کو پڑھ کر بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ حریت اور آزادی کے مفہوم سے اس وقت تک عوام کا ایک بڑا حصہ نامانوس تھا۔ علاوہ ازیں انگریزوں کی حکمت عملی بھی اس طرح کی گمراہی پھیلانے میں پوری طرح سرگرم تھی۔ لہٰذا عوام کو ان غلط فہمیوں اور گمراہیوں سے نجات دلانے کے لیے اخبار 'مدینہ' نے انتھک کوشش کی، بے شمار اعتراضات کے جواب دیے، اداریے شائع کیے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ضرورت پڑنے پر صفحات میں بھی اضافے کیے۔ درج بالا اقتباس میں 'حریت' اور 'آزادی' کے تئیں جس غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے اس کی مذمت اور صحیح مفہوم سے عوام الناس کو آگاہ کراتے ہوئے اخبار 'مدینہ' یوں گویا ہے:

''حریت اس بے نظیر قوت کا نام ہے جو مذہب کے اصول کے مطابق مخلوق کو ہدایت دے، مذہبی تعلیم کے موافق اپنی ضروریات کو بے خوف ہو کر انجام دے، اسلام کی توہین و تذلیل کے اسباب کو رفع کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہے۔ خواہ دنیا اس کی دشمن ہو جائے۔ اسلام کی تعلیم کے موافق بے لاگ بات کہے، راہ ہدایت و صواب سے ہٹ جانے والوں کو خواہ وہ امیر یا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو متنبہ کرے اور ہدایت و صواب کی جانب رجوع کرنے میں امکانی طاقت سے کام لے، یہی وہ حریت ہے جو ہر ایک مسلمان کا نصب العین ہونا چاہیے۔ لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے اصلیت کو چھوڑ دیا ہے اور خواہشات کے تابع ہو گئے ہیں، اور یہی وجہ تمام خرابیوں کی ہے۔'' ۳

اخبار 'مدینہ' کے ذریعہ حریت اور آزادی کے تئیں جن خیالات و نظریات کی عکاسی کی گئی ہے اس طرح کے خیالات کی تشہیر اس لیے بھی ضروری تھی کہ عوام حریت کے مفہوم سے واقف ہو کر اس پر عمل پیرا ہونے کی سعی کریں، کیوں کہ جب تک عوام حریت اور آزادی کے مفہوم سے پوری طرح واقف نہ ہوگی، آزادی کی جدو جہد میں ان کی شرکت یا ان سے کسی انقلاب کی توقع عبث اور بے کار ہے۔ لہٰذا اخبار 'مدینہ' نے اپنے ابتدائی شماروں سے ہی عوام کو ان کے حقوق کا احساس اور آزاد ملک میں زندگی گزارنے کے فوائد و برکات کی طرف راغب کرنا شروع کر دیا۔ اخبار مدینہ نے اس کی ایک صورت یہ نکالی کہ بیرون ممالک کی خبروں بالخصوص جنگی واقعات و حالات کو بڑے موثر پیرائے میں شائع کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ بلقانی ریاستوں کی بغاوت، ترکی کی فتح و شکست،

مزدوروں و بے کسوں کا انقلاب، اس کے علاوہ سرمایہ داروں کا مزدوروں پر ظلم، کسانوں کی بد حالی، انگریزوں کی بد نیتی وغیرہ۔ شاید ہی کوئی ایسا موضوع رہا ہو جو آزادی کے حق میں مفید ہو اور اخبار مدینہ نے اس جانب توجہ نہ کی ہو۔ غرض کہ اس طرح کی خبروں سے جہاں عوام دنیائے عالم میں رونما ہونے والے حادثات اور سانحات سے واقف ہوئی، وہیں ان کے دل میں اپنے تئیں آزاد کرانے کے جذبے کی چنگاری بھی بھڑک اٹھی۔ جس کے نتیجے میں مختلف تحریکوں کا وجود عمل میں آیا۔ ان تحریکوں میں عدم تعاون ایک ایسی تحریک تھی جس نے انگریزوں کے دلوں پر گہرے نقوش ثبت کیے۔ گاندھی جی نے یکم اگست ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون کی تحریک شروع کی۔ اس کا بنیادی مقصد ملکی اشیاء کا استعمال اور غیر ملکی اشیاء کے بائیکاٹ کے ساتھ انگریزوں سے ملنے والے مراعات، خطابات، انعامات یا نوکریوں سے دست بردار ہونا تھا تا کہ ان کی حکومت کمزور ہو اور انھیں ملک بدر کیا جا سکے۔

اخبار 'مدینہ' چونکہ کانگریس کا زبردست حمایتی تھا لہٰذا اس نے کھل کر عدم تعاون تحریک کی حمایت کی۔ اس حوالے سے اداریے، مضامین اور رپورٹس وغیرہ وہ وقتاً فوقتاً شائع کرتا رہا۔ ایک اداریے میں گاندھی جی کی طرف سے اٹھائے گئے اس قدم کو سراہتے ہوئے یوں گویا ہے:

''حق و باطل، طاغوت و یزدان، ضمیر و ایمان فروشی کی جنگ آج سے نہیں عرصہ دراز سے جاری ہے۔ لیکن استبداد و تظلم کی گھنگھور گھٹائیں جس وقت فضائے حریت پر گھر گھر کر آتی ہیں اور یہ سیلاب وطوفان سچائی کے ذرات کو بہالے جانا چاہتا ہے تو غیرت حق کو حرکت ہوتی ہے اور وہ اس دنیا میں چند ایسے نفوس پیدا کر دیتا ہے جو راہ راست کی طرف بھٹکے ہوئے مسافروں کو لے آئیں۔'' [۴]

ان ہی چند نفوس میں ایک شخصیت گاندھی جی کی تھی جس نے ہندو مسلم اتحاد، انگریز دشمنی اور ملک کو سیاسی، معاشی، اقتصادی، تہذیبی و تمدنی بحران سے نجات دلانے کی انتھک کوشش کی۔ انگریزوں نے اپنی حکومت کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے ابتدا سے ہی ایک پالیسی یہ بنا رکھی تھی کہ وہ جس ملک میں بھی گئے سب سے پہلے ایسے افراد کی تلاش شروع کی جو خود کی ضمیر کا سودا کر سکیں۔ ہندوستان میں بھی انھوں نے اپنے بال و پر اسی نہج پر پھیلانے شروع کیے اور دیکھتے ہی دیکھتے شمال تا جنوب اور مشرق تا مغرب ان کا پرچم بلند ہو گیا۔ قطع نظر ان باتوں سے ہندوستان کی سرزمین کو بیچنے میں جب ان ایمان فروشوں کی پیشانیوں پر بل نہیں پڑے تو ایک تحریک کو ناکام بنانے میں انھیں کیا دقت پیش آ سکتی تھی۔ ایسے افراد کے بارے میں 'مدینہ' بجنور نے دوٹوک لفظوں میں کہا:

''اس (انگریز مخالف تحریکوں) میں وہ لوگ (شامل) ہیں جو گندم نما جو فروش ہیں۔ ملے جلے تو رہتے ہیں ...

(لیکن) مقصد ہے ان کا کچھ نہ کچھ فساد پیدا کرنا۔ چنانچہ پرامن ترک موالات کو بدنام کرنے کے لیے یہ جب موقع پاتے ہیں حملہ کی ابتدا کر کے لڑائی چھڑوا دیتے ہیں۔ اور خود میدان کارزار سے رفو چکر ہو جاتے ہیں۔'' ۵

بہر حال گاندھی جی کی کوششوں سے شروع کی گئی یہ تحریک عدم تعاون ناکام تو ضرور ہوئی لیکن اس تحریک نے انگریزوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ جس طرح چاہیں ہندوستانیوں کو نہ استعمال کر سکتے ہیں نہ ان کا استحصال۔ یہاں اس جانب اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کی اہنسا اور عدم تشدد کے نظریے کے علاوہ ہمارے بے شمار اکابرین اور مجاہدین نے جان و مال کی جس قدر قربانیاں پیش کیں یا آزاد ہند فوج نے انگریزوں کا جس بے جگری سے مقابلہ کیا یا اسی طرح کی اور تنظیمیں جو وقتاً فوقتاً انگریزوں کی جان و مال میں نقصان کا سبب بنیں اسے نظر انداز کرنا آسان نہیں۔ بالالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی میں جو اہمیت گاندھی جی کی اہنسا واد کو حاصل ہے وہی اہمیت ان کی بھی ہے جو گاندھی کی اس تحریک سے علیحدہ لیکن ملک کی آزادی کے لیے سرگرم تھے۔

بہر حال یہ تمام تحریکیں اپنی جگہ منظم طریقے سے کام کر رہی تھیں، خدشہ صرف اس بات کا تھا کہ مختلف نظریے کی بنا پر آپسی اتحاد زائل نہ ہو جائے۔ مولوی مجید حسن اور ان کا عملہ اس حقیقت سے پوری طرح آشنا تھا کہ انگریز ایک دوسرے کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ لہٰذا قابل غور امر یہ ہے کہ عوام میں یکجہتی کو فروغ دیا جائے، کیوں کہ بغیر اس کے ہندوستان کی آزادی ممکن نہیں۔

اخبار 'مدینہ' چونکہ ابتدا سے ہی کانگریسی طرز خیال کا حامی تھا۔ لہٰذا اس نے ملک میں قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لیے تمام سیاسی پارٹیوں کو کانگریس کے سائے تلے کام کرنے یا اس میں ضم ہونے کی پیش کش کی۔

اخبار 'مدینہ' جس زمانے میں صحافت کے افق پر نمودار ہوا وہ دور نہایت بے چینی اور انتشار کا تھا لہٰذا اس نے ابتدا میں نہایت محتاط انداز میں اپنے قدم بڑھائے۔ وقت اور حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بعض اوقات طنز و مزاح کا سہارا لیا تو کبھی انگریزوں کی بے جا تعریف بھی کی۔ یہ سب فقط اس لیے تھا کہ وہ حکومت کی جکڑ بندیوں سے خود کو آزاد رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن جب ہم اخبار 'مدینہ' کے صفحات کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جوں جوں آزادی کا وقت قریب آتا گیا اور انگریزی حکومت خوف زدہ ہوتی گئی تو اخبار 'مدینہ' بھی کھل کر ہندوستانیوں کی موافقت اور حکومت کی مخالفت میں اٹھ کھڑا ہوا:

''...موجودہ حکومت ہند اپنی مرضی سے ہم پر مسلط ہے اور ہندوستان کے سر پر جان بل کی بدنما ٹوپی کی

طرح رکھی ہوئی ہے۔ ہم اسے بدلنا چاہتے ہیں لیکن بدل نہیں سکتے، ہم اس کو اپنے سر سے اتار کر دور پھینکنا چاہتے ہیں مگر پھینک نہیں سکتے، ہماری خواہش ہے کہ اس کے قلب اور قالب دونوں کو نئے سانچے میں ڈھال دیں مگر ہم ڈھال نہیں سکتے۔

یہ حکومت جس قدر غیر ذمہ دار ہے اس سے زیادہ غیر جمہوری ہے اور جتنی غیر جمہوری ہے اس سے زیادہ غیر ذمہ دار ہے۔ بھلا وہ حکومت جو چالیس کروڑ انسانوں کی مالک ہو اور چار چار کروڑ ووٹروں کی جگہ ایک انسان کے سامنے جواب دہ ہو اسے ذمہ داری سے کیا واسطہ اور اسے جمہوریت سے کیا تعلق! جس حکومت کو ایک منٹ زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ وہ ہمارے گورے حاکموں کی کرامت سے ہندوستان میں ہمیشہ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔'' [۱]

اقتباس کے پہلے حصے میں جس انداز سے حکومت کی مذمت اور ہندوستانیوں کے ارادے کو واضح کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اب پانی سار سے اوپر اٹھ چکا تھا۔ عوام حکومت سے پوری طرح بے زار و دل آزار ہو چکی تھی۔ اخبارات جو اب تک دبی زبان میں حکومت پر طنز یا تنقید کیا کرتے تھے، براہ راست عوام کو انقلاب کی دعوت دینے لگے۔ اخبار 'مدینہ' نے عوام کے ضمیر کو جھنجھوڑتے اور انھیں غیرت دلاتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہم چاہتے ہیں انگریزوں کو ہندوستان کی سرزمین سے نکال باہر کریں یا انھیں اس پر مجبور کریں کہ ہر اعتبار سے وہ ہندوستانیوں کے حقوق کی حفاظت کا خیال رکھیں، لیکن غلامی کی اس طویل مدت میں انگریزوں کا خوف اس درجہ غالب تھا کہ براہ راست حکومت سے بغاوت یا سرے عام ان پر تنقید کرنا ہر کس و ناکس کے بس کا نہ تھا۔ البتہ بعض جماعتیں ایسی تھیں جن کے ذریعہ وقتاً فوقتاً مختلف قسم کی تحریکیں وجود میں آ رہی تھیں۔ ان تحریکوں سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ عوام رفتہ رفتہ بے خوف اور نڈر ہوتی گئی جس کا خاطر خواہ اثر انگریزوں پر بھی پڑ رہا تھا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے دل کی آگ بجھانے کے لیے اس کی کوشش شروع کر دی کہ کسی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ابدی لڑائی یا دشمنی کا بیج بو دیا جائے۔ مسلسل کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ ہندوستانیوں کو آزادی تو ملی لیکن اس کے لیے انھیں ایک بھاری قیمت چکانی پڑی۔ بلکہ یہ کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ آج تک یہ قومیں اس کی قیمت چکا رہی ہیں۔

ع لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

اخبار 'مدینہ' کا اگر سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ اس میں صحافت کے ساتھ ادب کا بھی

وافر خزانہ موجود ہے۔لہٰذا اس نے جہاں نثری اعتبار سے اداریے، مضامین اور رپورٹس شائع کیے وہیں شاعری کے ذریعہ بھی عوام کے دلوں میں حریت طلبی اور انگریز دشمنی کی راہ ہموار کرنے کی حتیٰ الوسع کوشش کی۔

ابتدا تا آخر شاید ہی 'مدینہ' کا کوئی ایسا شمارہ ہو جس میں کوئی غزل یا نظم نہ پیش کی گئی ہو۔ان غزلوں یا نظموں کے ذریعہ ہندوستانی نوجوانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے، کسانوں کو ان کی اہمیت بتانے، مسلمانوں کے شاندار ماضی کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ حالت پر افسوس کرنے کے ساتھ انگریزوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی تھی کہ وہ دن دور نہیں جب ہندوستان ایک کروٹ کے ساتھ خواب غفلت سے بیدار ہو جائے گا اور انگریزی حکومت کے پاس سوائے فرار اختیار کرنے کے کوئی دوسری راہ موجود نہ ہوگی۔اس ضمن میں اخبار 'مدینہ' میں شائع شدہ ایک نظم کے کچھ بند ملاحظہ فرمائیں:

پھر دل کے غمکدے میں ہے جوش شادمانی — آتے ہیں پھر نظر کچھ آثار زندگانی
رخصت ہو میرے دل سے اے دور نوحہ خوانی — میں بھول جاؤں اپنی سب دکھ بھری کہانی

دل یاس سے خفا ہے

کب تک خموش رہ کر ایذائے غم اٹھائیں — گھل گھل کے اس طرح سے کیوں زندگی مٹائیں
اب تو سنبھل کے اپنی شان عمل دکھائیں — چارہ گروں سے کیوں کر زخم کہن چھپائیں

جو حد سے بڑھ چکا ہے

غافل یہ زندگی ہے؟ کیا خاک زندگی ہے! — یہ راحت وسکوں ہے؟ غفلت ہے بے حسی ہے!
جان ضعیف وقف آلام ہو رہی ہے — لیکن زبان ولب پر ہر وقت چپ لگی ہے

آخر یہ بات کیا ہے ؂

اس قسم کی نظموں کو پیش کیے جانے کا مقصد فقط ہندوستانیوں کے دلوں میں وطن کی محبت بیدار کرنا اور عمل کی طرف راغب کرنا تھا۔لیکن راغب کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ان کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار اور ان کے ضمیر کو جھنجھوڑا جائے۔'مدینہ' نے ان نظموں کے ذریعہ یہ کارنامہ بخوبی انجام دیا۔

ایسا نہیں تھا کہ اخبار 'مدینہ' نے اس نوعیت کی ایک یا دو مثالیں پیش کیں، بلکہ تواتر کے ساتھ 'مدینہ' اس طرح کی نظمیں اور غزلیں پیش کرتا رہا۔اسی نوعیت کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں جس میں بالخصوص نوجوانان ہند سے مخاطب ہو کر اخبار 'مدینہ' یوں گویا ہے۔

نوجوانانِ وطن اے نوجوانانِ وطن
اے شگفتہ تازہ گلہائے دبستانِ چمن

دیکھ کر آنکھوں میں باطل عیش و مستی کا خمار
مجلسی کمزوریوں نے کرلیا تم کو شکار

خواب طاری ہے تمہارے جذبۂ نوخیز پر
بارشِ تخریب ہے جذباتِ عیش انگیز پر

میرزا، آغا و سید ہے تمہارا جزو نام
شرم کیوں آتی ہے کہنے سے غلام ابن غلام

جس وطن کے پوت ہو جس ملک کے افراد ہو
وہ غلام آباد تم ننگ غلام آباد ہو

تم بنے ہو جرأت و جنگ آزمائی کے لیے
عورتیں کچھ کم نہیں جلوہ نمائی کے لیے

فی الحقیقت جوہر قابل ہو تم اس ملک کے
یہ مسلم ہے کہ مستقبل ہو تم اس ملک کے ۸

یہاں پوری نظم نقل کرنے کی گنجائش نہیں اس لیے فقط چند اشعار پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اس نظم کے ذریعہ نوجوانانِ وطن کی تعریف بھی کی گئی ہے اور ان پر تنقید بھی۔ انھیں طنز کا نشانہ بھی بنایا گیا ہے اور عظمتِ دیرینہ کی یاددہانی کراتے ہوئے عملی طور پر سرگرم ہونے کی تلقین بھی کی گئی ہے۔

اخبار 'مدینہ' میں شائع ہونے والی ان نظموں یا غزلوں نے جنگِ آزادی کے تئیں عوام کے دلوں کو جس قدر مسحور کیا وہ نہ اس زمانے میں کسی کی آنکھوں سے پوشیدہ تھا نہ آج اس سے چشم پوشی کی جاسکتی ہے۔

انسان کی پوری زندگی میں جوانی ہی ایک ایسا مرحلہ ہوتا ہے جس میں ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے وہ پوری طرح توانا و تندرست ہوتا ہے۔ اخبار 'مدینہ' نے بھی جنگِ آزادی کو ہوا دینے اور ملک کے نوجوانوں کو انگریزوں کے خلاف برانگیختہ کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ کئی نظموں کے عنوانات ہی ایسے قائم کیے گئے کہ پڑھ کر بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ اس کے مخاطب بالخصوص نوجوانانِ وطن ہیں۔ مثال کے طور پر ان نظموں کے عنوانات ملاحظہ فرمائیں (۱) اے جوانانِ وطن (۲) اے وطن کے نوجواں (۳) نوجوانانِ وطن سے وغیرہ۔ ان نظموں کے عنوانات سے واضح ہے کہ اخبار 'مدینہ' اس کا بے حد خواہش مند تھا کہ ملک کا ہر جوان انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوکر ان کے لیے شعلے کی شکل اختیار کرلے۔ نظم ''اے وطن کے نوجواں'' کے یہ بند ملاحظہ فرمائیں:

اے وطن کے نوجواں
اے وطن کے نوجواں

کھیل تلواروں سے کھیل
خون کی دھاروں سے کھیل

خود کو اتنا کر بلند
چاند اور تاروں سے کھیل

اے وطن کے نو جواں	اے وطن کے نو جواں
تیرا ہے کون و مکاں	تیرا ہے سارا جہاں
اٹھ کہ تیرا منتظر	ہے نظام آسماں[9]

پوری نظم میں نو جوانانِ ہند کو عمل کی طرف راغب ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ جس انداز سے اس نظم میں ان کو مخاطب کیا گیا ہے اس کا منشا ہی یہ ہے کہ اب وہ وقت نہیں رہا کہ ہم لبوں پر مہریں لگائے ظلم و زیادتی برداشت کرتے جائیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تیر و تفنگ سنبھال کر میدان کارزار میں سینہ سپر ہو جائیں۔

مختصر یہ کہ اخبار 'مدینہ' بجنور نے اپنے معاصر اخبارات مثلاً زمیندار، الہلال، ہمدرد، پیغام، سچ، صدق، ہفتہ وار ہند وغیرہ کی طرح جنگ آزادی کی فضا کو سازگار بنانے یا انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کے دلوں میں جذبۂ حریت کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

○

حواشی:

1. اخبار 'مدینہ' بجنور، سلطنت برطانیہ میں ہندوستان کا درجہ کیا ہے؟، ۱۵؍جولائی ۱۹۱۵ء، ص۔۳، جلد۔۴، نمبر۔۲۷
2. اخبار مدینہ، ہمارا پریس حریت و آزادی کا صحیح مفہوم، ۵۱؍اگست ۱۹۱۳ء، ص۔۴، جلد۔۲، نمبر۔۳۱
3. ایضاً
4. اخبار 'مدینہ'، اداریہ: نان کوآپریشن کی رفتار، یکم مئی ۱۹۲۱ء، ص۔۲، نمبر۔۳۳، جلد۔۱۰
5. ایضاً
6. اخبار 'مدینہ'، اداریہ: موجودہ حکومت ہند: آزادی کی جگہ سدا بہار غلامی، ۷؍مارچ ۱۹۴۵، ص۔۲، نمبر۔۲۰، جلد۔۳۴
7. اخبار 'مدینہ'، ''پیام عمل'' از مولوی محوی صدیقی لکھنوی، ۱۳؍مارچ ۱۹۳۱ء، ص۔۱، نمبر۔۱۹، جلد۔۲۰
8. اخبار 'مدینہ'، نو جوانان وطن سے خطاب از محمد ادریس خاں شمیم، ۲۱؍جنوری ۱۹۴۵ء، ص۔۱، نمبر۔۵، جلد۔۳۴
9. اخبار 'مدینہ'، 'اے وطن کے نو جواں' از زخمی ٹانڈوی، ۹؍مارچ ۱۹۴۵، ص۔۱، نمبر۔۱۸، جلد۔۳۴

خانوں میں بٹی ہوئی پیاری سی شخصیت: کہکشاں تبسم

ڈاکٹر حلیمہ فردوس، بنگلور

اچانک یہ سوال مجھے پریشان کرنے لگا آخر کیوں آج کل اچھی اور سچی شخصیتوں کا کال پڑنے لگا ہے؟ یوں تو سب کے سب ماشاءاللہ، سبحان اللہ کے وظیفہ میں گم ہیں، ہر قدم پر مبارکبادیوں کے چراغ روشن ہیں، ہر طرف کورس کی دُھن سنائی دے رہی ہے، ہر فرد خوش فہمی کے ریلے میں بہے چلا جا رہا ہے، ایسے میں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک چہرہ مجھ سے سوال کر رہا ہے،''کیا آپ مجھے بھول گئیں؟ میں ہوں نا ....اچھی اور پیاری شخصیت، ہاہاہا............زوردار قہقہہ ہوا میں گونجتا ہے،''سب کا خیال رکھنے والی،'' یکا یک میری نگاہوں میں ایک اشتہار ابھرتا ہے پلک جھپکتے میں ایک خاتون گھر کے ہر فرد کی خدمت میں فرمایشی کھانے لئے حاضر ہوتی ہے، دیکھتے ہی دیکھتے اس چہرے کو نقوش بدلنے لگتے ہیں، کہکشانی تبسم سے چہرہ جگمگانے لگتا ہے۔اس کی قہقہہ بھری دستک سے مجھے ایک دہائی پر محیط خوشگوار سفر کی ہر بات یاد آنے لگتی ہے، ہوا یوں کہ کہکشاں تبسم کے خوبصورت شعری تحفہ'' بھنور بنتا دریا، کے ذریعہ ہمارے رشتے کی بنیاد پڑی تھی فون کے ذریعہ بنگلور سے سُبور کا (شہر بھاگلپور کا مضافاتی علاقہ) فاصلہ سمٹ گیا۔ابھی تک نہ ہمیں مصافحہ کی لذت میسر آئی ہے اور نہ ہی گلے مل کر سرشار ہونے کا موقعہ نصیب ہوا ہے۔اس کے باوجود یوں لگتا ہے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔شاید کہکشاں کو حلیمہ آپا کے بارے میں کہنے کے لئے دقت پیش آئے لیکن میری گٹھڑی میں اس کی پیاری شخصیت سے متعلق بہت سامال موجود ہے۔ ہمارے درمیان بہناپے کا یہ رشتہ بہلاوا نہیں دل میں بسنے والا جذبہ ہے۔میرے خیال میں ہم مزاج خواتین کے درمیان محبت کی امر بیل جب اعتماد کے منڈوے چڑھتی ہے تو وہ اپنے آپ پھلتی پھولتی ہے۔

بہت کم وقفہ میں، میں نے یہ جانا کہ کہکشاں تبسم خانوں میں بٹی ہوئی شخصیت کا نام ہے۔سُبور کے محلّہ کی مکین، مفتی گھرانے کی بہو، پروفیسر ضیاءالاسلام رضوی کی شریک حیات، سنبل بی بی کی پیاری امّاں، ایک بہن اور دو بھائیوں کی بڑی آپا، محلے بھر کی بھابھی، چاچی، نوآموز قلم کاروں اور طلبا کی آپی غرض بیک وقت ہنسی

خوشی مختلف رشتے نبھانے والی اس خانہ دار خاتون کی شخصیت پر رشک آتا ہے۔ یہ خاتون خانہ کئی خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اُس کی عمر کا ایک حصہ تنک مزاج ساس کے ناز اُٹھانے، دل و جان سے سُسر کی خدمت کرنے میں گزرا، ساتھ ہی وہ اپنے نادان بلم وا کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے ''نسائی شعری آفاق'' میں گم رہیں تعارف بزبانِ شاعرہ۔

ایک تو میری نازک ریشم ساری تھی
بندھی ہوئی پلّو سے ذمہ داری تھی

کہکشاں کی ذمہ داریوں کا سلسلہ دراز سہی اس کے باوجود یہ پلّو نہ کبھی کوتاہ ہوا اور نہ ہی مسک گیا۔ محترمہ سے ادبی گفتگو کرتے ہوئے ہرگز یہ خیال نہیں گزرتا کہ آپ کسی خانہ دار خاتون سے گفتگو کر رہے ہیں۔ اپنے ہمسائیوں کے دُکھ سُکھ میں شریک یہ مونس و غمخوار ہستی جب شادی بیاہ کی محفلوں میں ڈھولک کی تھاپ پر گیت چھیڑتی ہیں تو اکیسویں صدی کی ادب مزاج، تعلیم یافتہ، باشعور خاتون ڈاکٹر کہکشاں تبسم کی پرچھائی بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ وہ سماجی جہد کار کا دعویٰ نہیں کرتیں ان کی سماجی سرگرمیوں کا دائرہ اپنے محلے تک محدود ہے۔ اپنے خانگی اسکول کے پسماندہ نونہالوں کی نگران کار کی اضافی ذمہ داری بھی وہ بخوشی نبھا رہی ہیں غرض وہ اپنے محلے کی محبوب ہستی ہے۔ کوئی بھابھی کو اپنی بپتا سُنانے چلا آتا ہے اور کوئی چاچی سے اسکول کے آنگن میں بیاہ رچانے کی اجازت مانگنے آ دھمکتا ہے۔ حتٰی کہ ادب کے شائقین تلاشِ معاش کے لیے سرگرداں طلبا کا گروہ انٹرویو یا مقالہ کی تیاری کے لیے کہکشاں آپی کے در پر دستک دینا نہیں بھولتا۔ گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ادبی شوق پورا کرنا اِس ملٹی ٹاسک ویمن کا کمال ہے۔

کہکشاں تبسم کی شخصیت اسم با مسمّٰی ہے۔ خوش شکل سلیقے سے جمے ہوئے بال، پلّو سے ڈھکا ہوا سر، اونچی، پیشانی، چشمہ کے اندر سے جھانکتی سوالیہ نظریں، کچوری جیسے پھولے گال، متوازن ناک اس میں چمکتی کیل، پتلے ہونٹ، نوکیلی ٹھوڑی، کھلا کھلا رنگ گلے سے سُر کی طرح پھوٹتے قہقہے، کتابی چہرہ سرتاپا مشرقی رنگ میں ڈوبی پُروقار شخصیت ہے۔ بات کرنے میں پھول جھڑیں یا نہ جھڑیں لہجہ اہل زبان کا سا۔ جس پر بہاری رنگ کا شائبہ تک نہیں۔ سراپا جس قدر جاذبِ نظر ہے فطرت بھی اُسی قدر دل میں گھر کرنے والی ہے۔ صاف گو مگر موم صفت، جفاکش مگر تازہ دم، جمال پرست اور حقیقت پسند، احتجاجی مزاج لیکن علم برداری سے بیر ہے۔ بہرکیف اس کی شخصیت میں مختلف اوصاف مجتمع ہیں۔

اس صاف گو شخصیت کا بھلا مروت اور مصلحت سے کیسا ناتا؟ بے باکی پر اُتر آئیں تو پروفیسر حضرات کی پول کھولنے اور خانقاہوں کا کچا چٹھا نکالنے سے ذرا بھی نہیں ہچکچائیں گی۔ ایک دن مختلف المزاج ہستیوں پر گفتگو ہونے لگی۔ محترمہ سورج مزاج، سمندر مزاج، شبنم مزاج، برگد مزاج شخصیتوں کا ذکر کرنے لگیں تان ٹوٹی پروفیسر لطف الرحمٰن پر۔ آپا! میرے یہ پروفیسر برگد مزاج تھے۔ کیا بتاؤں ان کی جڑیں دور دور تک پھیلی تھیں۔ انہوں نے اپنے شاگردوں کو اپنا سایہ بنائے رکھا۔ کسی کو پنپنے نہیں دیا۔ اقتدار کے تلے دبے شاگردان کا سوٹ کیس تھامے ان کے سایہ میں سانس لیتے رہے۔'' برگدی مزاج پروفیسر کا تعارف سننے کے بعد میں نے لمبی سانس لیتے ہوئے سوال کیا'' بی بی یہ تو جامعات کا کلچر ہے۔ کوئی سورج مزاج ہو تو بتاؤ؟ اُس نے فوراً جواب دیا'' جمالیاتی فلسفہ طراز پروفیسر شکیل الرحمٰن بابا سائیں سورج مزاج ہی تو تھے۔ میرے مجموعہ کلام ''لہورنگ صحیفہ'' میں شامل تخلیقات آشرم اور بابا سائیں کی نذر'' پڑھ لیں تو آپ خود جان جائیں گی۔ واقعی ان کے مطالعہ سے مجھے سورج مزاج شخصیت اور کہکشاں کی پار درشنی محبت کا اندازہ ہوا۔

بسا اوقات کہکشاں کے ادبی فتوے مجھے حیرت میں ڈال دیتے ہیں، وہ اردو ادب کی ہمالیائی شخصیتوں کو بھی نہیں بخشتیں، اردو والوں کی مستند نادانیوں کو نشانہ بناتی ہیں۔ کہنے لگیں علامہ اقبال کو اان کی اسلامی فکر کی وجہ سے اردو دنیا انھیں رحمت اللہ علیہ کہتی ہے۔ ان کی ظاہری ہیت تو دیکھیں، اللہ کی پناہ شریعت کے مطابق داڑھی نہیں رکھی مونچھیں اس قدر گھنی کہ گلاس کا پانی مکروہ ہو جائے، بھلا وہ رحمت اللہ علیہ کیسے ہوئے۔ اس کے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا، اگلا نشانہ شمس الرحمٰن فاروقی کو بنایا، آپا مجھے فاروقی کی ذکاوت، فطانت اور ادبی مرتبہ سے انکار نہیں، گلہ ہے تو ان کے مُدیرانہ کارناموں سے، فاروقی نے ایک نسل کو گمراہ کیا ہے شب خون نے اردو ادب کو کون سے بڑے شاعر و ادیب عطا کئے۔ کسی کی شناخت شب خون سے نہیں بلکہ ایک ذہین نسل کے ذریعہ شب خون کو شہرت نصیب ہوئی ہے۔ یہ باتیں فاروقی شناسوں کے گلے سے بھلے نہ اتریں مگر فاروقی مخالف خیمہ اس خیال کی ضرور حمایت کرے گا۔ کہکشاں کے اس قسم کے بیانات مسطح جھیل میں کنکر پھینکنے جیسے ہوتے ہیں۔

کہکشاں کی ہستی مجموعہ اضداد ہے اس نے عجیب و غریب شوق پال رکھے ہیں۔ محترمہ روزانہ باضابطہ کبوتر کی کابک کی صفائی میں مصروف رہتی ہیں اور کبھی سہجنا کی پھلیاں تڑوا کر محلے میں بانٹ رہی ہیں۔ کبھی باغبانی میں لگی ہیں اور کبھی گھاس کاٹ رہی ہیں۔ فرصت کے لمحات میں رنگ بہ رنگے پھولوں کی خوبصورتی کو

آنکھوں میں جذب کر رہی ہیں تو کبھی صحن میں بیٹھے صبح کی ٹھنڈی ہوا کا لطف لیتے ہوئے ننھی ننھی چڑیوں کے نغمے اور نازک سی رنگین تتلیوں کا نظارہ کر رہی ہیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ اگر قدرت کا حسن اس کی دل بستگی کا سامان نہ ہوتا تو شاید اس کی شاعری، بے روح و بے رنگ سی ہوتی۔ دھنک رنگوں کی یہ پھلکاری ردا جب درد کے ستاروں سے جگمگانے لگتی ہے تو ہم اس پر سرسری نگاہ ڈال کر آگے نہیں بڑھ سکتے۔

کہکشاں کے مختلف شوق اپنی جگہ لیکن شب و روز کی مصروفیات اس کے مطالعے میں مخل نہیں ہوتے۔ مطالعہ کے بغیر اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ یوں تو وہ اپنے حلقے میں کتاب دوست کی حیثیت سے مشہور ہے جبکہ میں انھیں کتاب خور مانتی ہوں۔ محترمہ صبح کی چائے کی چسکیوں کے ساتھ اخبار کی سرخیوں کو گلے سے اتارتی ہیں، صبح ناشتہ کرنے کی عادی نہیں، ان کا ناشتہ گھر کے کام سے فراغت پانے کے بعد ہوتا ہے۔ اصل ناشتہ پلنگ اور ٹیبل پر دھری ڈھیر ساری کتابوں کے ساتھ کرتی ہیں، ان کے مطالعہ کی خوراک کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

اردو ادب، عالمی سیاست، معیشت، مغربی زبانوں کے مشہور ترجمہ شدہ ناولیں اس قدر آسانی سے ہضم کر جاتی ہیں کہ ڈکار کی نوبت تک نہیں آتی۔ یوں تو زن، زیور کی دیوانی ہوتی ہے اور کہکشاں کتابوں کی دیوانی ہے۔ اس کی لائبریری نمائشی نہیں اس کی دیوانگی کا نتیجہ ہے۔ سنا کہ بھاگلپور فساد میں شہر کے بازار اور گلیاں ہی نہیں کہکشاں کی لائبریری بھی شعلوں کے کی نذر ہوگئی تھی۔ مطالعہ کی جنونی نے ازسرِ نو برصغیر کی شاعرات کے مجموعے، تذکرے، سینکڑوں تنقیدی کتابوں کا ذخیرہ جمع کیا۔ اس شوق کے شہہ دینے میں رفیق حیات رضوی کی فراخ دلی کا بھی ہاتھ ہے۔ میں نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا تھا ''بی بی تم اس معاملہ میں بڑی خوش قسمت ہو'' وہ قہقہہ کے ساتھ گویا ہوئیں ''ہاں وہ تو ہوں، آپا سالوں سے گھر کی چوکیداری کر رہی ہوں اس کا صلہ تو ملنا چاہئے نا۔ دِلّی کے کتاب میلہ میں بائیس ہزار کی کتابیں خریدنے پر میری بیٹی خفا ہوگئی تھی مگر اس کے بابا نے بڑے پیار سے سمجھایا تھا'' تمہاری اماں نے تینتیس (33) برس کی شادی شدہ زندگی میں سوائے کتابوں کے ایک چاندی کے چھلّے تک کی فرمائش نہیں کی بھلا میں کتابوں کی خریداری سے کیسے انکار کرتا ان کی حمایت سے آج بھی یہ دیوانگی باقی ہے۔ سالانہ آٹھ دس ہزار کی کتابیں خریدے بنا چین نہیں آتا۔'' میں نے اس کی لائبریری اپنی آنکھوں سے دیکھی نہیں لیکن اس ذخیرے سے استفادہ کیا ہے۔ جب بھی کسی ادبی حوالے یا مواد کی ضرورت ہوتی ہے یا کسی کتاب کے متعلق معلومات چاہئے تو میں بس ''گوگل بُوا'' کی خدمت حاصل کرتی

ہوں۔ جواب نوکِ زبان پر یا پھر دس بیس منٹ میں اس کی فوٹو کاپی واٹساپ کے ذریعہ مل جاتی ہے۔ خدا کرے اس کا مطالعۂ شوق اور کتب کی خریداری کا جنون قائم رہے۔

ابتداء میں کہکشاں سے گفتگو ادبی سطح تک محدود ہوا کرتی تھی، دھیرے دھیرے ادب کے علاوہ ہمارے مشترکہ شوق گفتگو کا حصہ بننے لگے، اس قدر کم مدت میں وہ اپنی حلیمہ آپا سے قریب کیا ہوئی کہ اس نے طاقِ دل پر رکھی کتابِ زیست کے اَن چھوئے پنّوں کو کھول کر رکھ دیا۔ میرے لیے اس کے کرب اور اضطراب کو پڑھنا مشکل ہو گیا۔ یوں تو ہماری گفتگو کبھی سنجیدہ، کبھی رنجیدہ اور کبھی زعفران زار ہوتی ہے، اس کی ابتداء المناتی موضوع یا عالمی تباہ کاری کے علاوہ سیاسی و ادبی سورماؤں، مافیاؤں اور دورِ حاضر کے ادبی رویوں سے ہوتی ہوئی پائے اور میٹھی قیمے کی ترکیب یا بیڈ شیٹ کی کڑھائی پر اختتام کو پہنچتی۔ میں وظیفہ خوار اور وہ مصروف خانہ دار خاتون اس کے باوجود ہماری گفتگو کے اوقات مقرر ہیں۔ ہفتہ میں ایک بار اس کی گفتگو سے فضا مزاح بیز ہو جاتی ہے۔ موبائلی گفتگو کے ذریعہ مل بیٹھے بغیر دو دیوانوں کی خوب گذرتی ہے۔ مجھے اس کے قہقہوں بھرے دم دار سلام کا انتظار رہتا ہے۔ ایک بار میں نے نے پوچھ ہی لیا ''بی بی کیا یہ قہقہوں کی برسات گھر پر بھی ہوتی ہے؟'' جواب ملا کیوں نہیں میرے قہقہوں پر بھائی ٹوک بھی چکے ہیں، بھائی نے سیدھے سیدھے کہا ''آپا! آپ کی عمر ہو چلی ہے قہقہے لگانا بس کیجئے۔'' وہ کہاں سمجھیں گے؟ میں اس عمر میں اپنے قہقہوں کا والیوم کیسے کم کر سکتی ہوں؟ ہاں بالکل سچ تمہاری طرح ایک بذلہ سنج ہستی ہی عمر کی ساٹھ بہاریں دیکھنے کے باوجود قہقہوں کا والیوم برقرار رکھ سکتی ہے، نہ ہو ہنسنا تو جینے کا مزا کیا۔ تمہاری گفتگو سن کر زاہدِ خشک بھلے قہقہوں سے پرہیز کرے لیکن وہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ دوست دار شخصیت ہے۔ اس کی طرح اس کا فون بھی ہمیشہ آن ڈیوٹی رہتا ہے۔ برصغیر ہی نہیں اردو کی نئی بستیوں میں بھی اس کے دوست اور شناسا موجود ہیں۔ اس نے اردو ادب کی معتبر ہستیوں کے ساتھ رابطے اپنی ناموری یا خود نمائی کے لیے قائم نہیں کیئے۔ اس کی کتاب ''نسائی شعری آفاق'' اور شعری مجموعے ادب برادری سے متعارف ہونے کا ذریعہ بنے۔ خواتین کی شاعری سے متعلق یہ کتاب ایک مثالی تحقیقی کام ہے۔ اسے ریاست بہار کی دو جامعات کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ سنا کہ محترمہ نے جب سے ہوش سنبھالا تب سے نسائی شاعری کا وظیفہ پڑھ رہی ہیں۔ اس کو توجیہہ یوں پیش کرتی ہیں کہ ''بچپن میں نانا جی کا جملہ 'عورتیں شاعری کہاں کرتی ہیں' میری سائیکی کا حصہ بنا اور میں نے اس میدان میں قدم رکھا'' نانا جی کو دعائیں دینا چاہئے ورنہ نسائی شاعری ایک کامیاب شاعرہ سے محروم رہ جاتی۔ اُفوہ!

کہکشاں کی شخصیت پر گفتگو کرتے کرتے شاعری درمیان میں آگئی۔اس کی شاعری کے ذکر کے بغیر بات کہاں مکمل ہوتی ہے۔کیا کہیں کہکشاں تبسم اپنے ہر شعر اور ہر لفظ سے جھانکتی نظر آتی ہے۔دو چار سالوں سے ادھر نظم ہوئی اُدھر حلیمہ آپا کے سر پر سوار، معلوم ہوتا ہے وہ میری شعر فہمی کا امتحان لینے لگی ہے۔عموماً تازہ نظموں پر تاثر اور عنوان کی فرمائش اس کا معمول بن گیا ہے۔ میں نے تو بس اتنا جانا کہ خود اعتمادی، خودداری اور خودسری سے گوندھا گیا خمیر، تانیثی فارمولہ ٹائپ انداز سے مستثنٰی اظہار بیان، نسائی وقار سے معمور لہجہ کہکشاں تبسم کا تعارف ہے۔''بھنور بنتا دریا'' میں خارجی موضوعات کے علاوہ اپنی ذات کے حوالے سے ہو ّ از ادیوں کے مقسوم کی باتیں کی گئی ہیں، ''سلسلے سوالوں کے'' کی نظمیہ شاعری میں نرم تانیثی مزاج لہجہ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔''لہو رنگ صحیفہ'' کے کینوس پر عالمی لہو رنگ مناظر قید ہیں۔گویا اس کے شعری سرمایے میں دورِ پُرفتن کا ہر نقش سمٹ آیا ہے۔ جمال پرست کہکشاں کا عصری، نسائی اور تانیثی اظہار دھنک رنگوں کے علاوہ زمین و آسمان کے متعلقات سے عبارت ہے۔

امیر وقت ہے سورج کو بیچنے والا
زمین پہ رکھے گا باقی حیات گہرے کی
اپنے زخموں کا لہو رنگ صحیفہ دیں گے
گریہ کے مکیں اور کیا تحفہ دیں گے
میں خزاں گزیدہ شجر سہی میری ٹہنیوں کی خبر تو لے
گرے زرد پتوں کے ڈھیر سے ہری کونپلوں کا حساب کر
موسم خوشبو رنگ دھنک کے منظر سارے اس کے تھے
رات کی کالی چھایا میری، چاند ستارے اس کے تھے

مذکورہ بالا غزلیہ اشعار میں فطرت کے دامن سے سمیٹے رنگ دعوتِ نظارہ نہیں دعوتِ فکر دے رہے ہیں۔اس کے علاوہ ''ریگ زار''، ''کیکٹس''، ''بے گھری''، ''چھل''، ''افغانی ماؤں کے نام'' جیسی نظموں میں درد کا خاموش دریا بہہ رہا ہے۔ کہکشاں کی نس نس میں نسائیت سمائی ہوئی ہے اور ذہن کے کونے کونے میں اضطرابیت کا ڈیرا ہے۔اس کی روح اضطرابی، نظریں عقابی اور تخیل آفتابی ہے۔ رنگ، حسن، کسک کے تمام استعارے کہکشاں کے توانا اسلوب کی شناخت ہیں۔اس کی شاعری اثر آفرینی سے معمور ہے، اس کے کلام

میں اکیسویں صدی کی تھرتھراہٹیں ہیں۔ عالم کاری کی ترقی میں پوشیدہ تباہی پر کہکشاں کی نظر ہے۔ دورِ موجود کی شاعرات نے یہ ثابت کر دیا کہ نسائی شاعری صرف سرشاری اور خودسپردگی کا اظہار نہیں ہے۔ ''ایک اسطوری قصّہ'' ''اور جب دماغ ہیک کر لیے جائیں'' نامی نظموں کو ایکوفیمنزم کے خانے میں رکھا جاسکتا ہے، اس مزاج کی نظموں میں زمین زادوں کی ہوس پرستی کی شکار ہوتی بنجر زدہ دھرتی ماں کی کوکھ کا کرب شامل ہے۔ یہ نظمیں طنزِ ملیح کی کامیاب مثالیں ہیں کیونکہ اشرف کہلانے والی مخلوق روبوٹ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ نظم کا اقتباس پیش ہے۔

''اصلی دنیا میں جب کبھی کسی پلینٹ (Planet) پر وجود میں آئے تو / شاید ہم نئے اساطیری حوالوں میں نظر آئیں / یا پھر دھرتی بلیک ہول کی آغوش میں سما جائے / تب تک آؤ بانسری پہ لب رکھ کر مخملی بوسوں کی دھن بجائیں۔'' (اور جب دماغ ہیک کر لیے جائیں)

تعجب ہے میں کہکشاں کی ہمرہی میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اس کی پیاری، سچی اور کھری شخصیت اور شاعری نے میرے دل و دماغ کو ہیک نہیں کیا پر دل میں گھر کر لیا ہے۔ اس کے لیے کسی قانونی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ تو یہ سوالوں کا سلسلہ تھمتا ہی نہیں ہے، ایک اور سوال سر اٹھانے لگا ہے۔ کیا کرشماتی شخصیات کے درمیان کہکشاں تبسم کی شاعری اور شخصیت جگہ بنا پائے گی جس کی وہ مستحق ہے؟؟؟

خدشہ

معز ہاشمی (ممبئی)

آج وہ عمر کی اس منزل پر تھا جہاں اس کے اپنے بھی اس کے نہیں ہو سکتے تھے۔ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑادینا اس کے اپنوں نے اپنا طرز عمل بنالیا تھا۔اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اپنی بات سے دوسرں کو اپنا ہموار بنالے۔کائنات کی دوسری مخلوقات میں تو بڑے بوڑھوں کو بندگی کا درجہ دیا جاتا ہے ہر اچھے برے کام ان ہی کے دست مبارک سے انجام پاتے ہیں۔کسی تقریب کا آغاز ہو یا کسی کو سپرد خاک کرنے کا فریضہ ہو۔یہی بزرگ بڑی خوش اسلوبی سے ادا کرتے پھر اظہار مسرت، اظہار تعزیت بھی کرنے کا حق انہی کو زیادہ ہوتا ہے۔اسی لئے بڑے بزرگوں کو شرف بخشا جاتا۔انہیں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا، انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا۔مگر صد افسوس اس کی قوم نے اس کی بزرگی کو ٹکے لگا دیا۔اس کی ضعیفی پر کسی کو ترس نہیں آیا۔آج وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے بھٹکتا پھر رہا ہے، اس مسافر کی طرح جو پانی کے قطرہ کے لئے صحرا کی خاک چھان رہا ہو۔اس کی نسل کا جوان خون اس کے منجمد خون کو پھلانگتا ہوا اس کے حصہ کی خوراک ہضم کر لیتا ہے۔آخر یہ غذا کا سنگین مسئلہ کب تک درپیش رہتا۔اس کا کوئی حل نہ نکل سکا۔اس کی قوت زوال پذیر ہونے لگی۔قدموں میں کمزوری کے سبب لڑکھڑاہٹ پیدا ہوگئی۔لاغر اور کمزور ٹانگیں اس کے رعشہ زدہ جسم کا بوجھ اٹھانے سے معذور ہوگئیں۔نقاہت کی وجہ سے وہ اپنے بھاری جسم کو اناج کے دانے کی طرف گھسیٹنے نہیں پا رہا تھا۔اپنی بے بسی پر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔چشم بے نور میں جوانی کے دھندلے نقوش ابھر آئے۔عالم تصور میں وہ اونگھنے لگا۔آنکھوں میں وہ مناظر دکھائی دینے لگے جو اس کے زرین دور کے اوراق کو آہستہ آہستہ پلٹنے لگے۔وہ محلّہ یاد آیا جہاں نے پانچ سال تک بے تاج بادشاہی کی۔وہ گھورا نظر آیا جس پر اس کی سلطنت کا پرچم لہراتا تھا۔کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس گھورے پر اپنی چونچ مار سکے۔کئی آنکھیں وہ خونی منظر نہ بھولی ہوں گی جب بیرونی نسل کے ایک اصیل مرغ نے اس کی حدود سلطنت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی ناپاک چونچ سے دانہ چگ لیا تھا اور پھر زمانہ نے دیکھا کہ اصیل کا سفید لباس سرخ ہوگیا۔اس کے حرم میں اس بے مثال کامیابی پر جشن منایا گیا۔گھورے کی رنگین دانوں سے تزئین عمل میں آئی۔اس کی نسل کے دیسی پٹھوڑوں نے اسے سردار تسلیم کرلیا۔اس کی فولادی آریوں میں کئی جوان اور کنواری پٹھوڑیوں کے دل جھولنے لگے۔اپنی کامرانی پر اس نے اپنی کلغی کو شان بے نیازی سے جھٹک کر اپنی محدود سلطنت پر

طائرانہ نظر دوڑائی۔اس واقعہ کے بعد کسی نے اس کی حدود سلطنت پر حریصانہ نگاہیں ڈالنے کی جرأت نہیں کی۔ پھر اس کی چال میں شاہانہ انداز پیدا ہوگیا۔کسی فاتح شہنشاہ کی طرح وہ اپنے گھورے پر چڑھ گیا۔

انسانوں نے بھی اس کی فتح پر خوشی کا اظہار کیا۔اس کے مالک نے اسے پیار سے اپنی گود میں اٹھالیا۔اس کی کامیابی پر اسے تھپتھپا کر شاباشی دی۔پھر مالک نے یہ طئے کرلیا کہ اپنے اس بہادر جنگجو مرغ کو دنگل میں ضرور اتارے گا۔اپنے آقا کی خواہش کے احترام میں اس نے کئی بار کامیابی کے جھنڈے گاڑے۔کئی خونی دنگلوں میں اس نے اپنے مالک کا سر فخر سے اونچا کیا۔اس کے حرم میں ہر نسل کی مرغیاں داخل ہونے لگیں۔اس کے کھوڑاڑے کو رنگ وروغن کیا گیا۔اس کی خوراک میں مقوی غذاؤں کے ساتھ لہسن اور بچھو کا استعمال بکثرت کیا جانے لگا۔اس کے خون میں حدت پیدا ہوگئی۔اور پھر سے اسے کلغی دار، میر جنگ اور آبروئے محلّہ جیسے خطابات سے نوازہ گیا۔

خطابات سے نوازے جانے کے بعد اس کی چال اور آواز میں تبدیلیاں رونما ہوگئیں۔آواز کی کرختگی تکبر کی نشاندہی کرنے لگی۔اس کی بلند بانگ پر گھڑیوں کے رقاص محو رقص ہو گئے۔اطراف واکناف کے انسانوں نے وقت کے تعین کا انحصار اس کی بانگ پر کیا۔برسوں اس نے انسانوں کو وقت کی اہمیت کا احساس دلایا۔انسان بیدار ہوا۔پھر اس نے اس کے احسانوں کا بدلہ اس کی نسل کشی کر کے چکادیا۔وقت نے کروٹ لی۔عصری آلات کے ذریعہ انڈوں سے چوزے عالم وجود میں آنے لگے۔کمزور اور ناتواں نونہالوں نے اس کی نسل کو تباہی کی راہ پر ڈال دیا۔

سائنسی ایجادات نے خواتین کو امور خانہ داری سے مبّرا کردیا۔وہ کاہلیت کا شکار ہوگئیں۔ان کی زیادہ تر توجہ آرائش وزیبائش پر مرکوز ہوگئی۔اور پھر عریانیت کے جال میں وہ جکڑتی چلی گئیں۔یہی جان لیوا حربہ انہوں نے ہماری مرغیوں پر آزمایا۔انہیں اکیس دن کی لامتناہی قیدو بند کی صعوبتوں سے آزاد کردیا۔ہم نے احتجاج کیا۔تیز چھری نے اپنا فرض پورا کیا۔اوروں کی طرح ہم نے بھی قربانیاں دیں۔پر ہماری کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ہمیں یقین تھا کہ مشینی پیداوار ہماری روایتی قدروں کا بوجھ اٹھا نہ پائے گی۔ان کے دیے ہوئے انڈے غذائیت کیلئے موثر ثابت ہوئے لیکن قوت بخش تغذیہ نہ بن سکے۔ایک دن انسان بھی قائل ہوگیا۔وہ پیٹ کی دوزخ کو سرد کر سکتے ہیں لیکن جسم میں حرارت نہیں پیدا کرسکتے۔تب اسے ہماری یاد آئی۔اس پر بھی اس نے اپنے طرز عمل کو نہیں بدلا۔وہ مجبور تھا۔ذہنی کوفت اس کی کمزوری میں اضافہ کا سبب بنی۔تشنجی سے اس کا جسم اینٹھنے لگا۔اس پر جنونی کیفیت طاری ہوگئی۔اس کی بانگ سے انسان لرزاٹھا۔وہ انہیں چیخ چیخ کر کوس رہا تھا۔ہمارے کردار کو تباہ کر کے تم نے اچھا نہیں کیا۔بہت جلد تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔

پھر بہت جلد اسے انسان پر ہنسنے کا موقع میسر آیا۔ایک عرصہ بعد وہ دل کھول کر ہنسا۔پھر اس کی ہنسی بتدریج قہقہہ میں بدلنے لگی۔پھر قہقہے بلند تر ہوتے چلے گئے۔اس کے کمزور قدم تھر کنے لگے۔بار بار وہ لڑکھڑایا۔سنبھلنے کی لاکھ کوشش کے باوجود وہ گر پڑا۔پھر بھی وہ خوش تھا اس کے باوجود کہ خوشی کا اظہار کم ظرف کیا کرتے ہیں۔وہ خوش اس لئے تھا کہ چلو اکیسویں صدی میں انسان اپنی سائنسی ترقی کے سبب نلکی زادوں ونلکیزادیوں کے ساتھ خراماں خراماں داخل ہوگیا۔وہ خوش تھا آ کر انسان نے اتنی ترقی کر لی کہ نلکی زاد بچوں سے اپنے نسلی کردار کو راہ تنزلی پر لا کھڑا کیا۔وہ خوش ضرور تھا لیکن عقل وفہم سے آراستہ انسان کو اپنی روایتی قدروں سے اتنا نیچے گرا ہوا دیکھ کر وہ ان کی عقل پر ماتم کرنے لگا،وہ رو پڑا۔ظالم ہماری نسل کشی سے تیرا دل نہیں بھرا تھا جو تو نے اپنے آپ پر ظلم ڈھایا۔تو جو اپنی خاندانی حرمت پر ایک لفظ برداشت نہیں کرتا تھا۔تو تو اپنے آباء واجداد کی شان میں قصیدے گایا کرتا تھا۔اپنی خاندانی عزت کو بچانے کے لئے تو نے ہر دور میں خون کی ندیاں بہادی تھی۔آج تجھے کیا ہوا۔تو جانتا ہے ان نلکی زادوں کا حسب نسب کیا ہوگا۔تیری ترقی نے ان معصوموں کا شجرہ نلکی سے ملادیا۔پر اس کے ننھے سے دل میں خوفناک خدشات اجاگر ہوئے۔کہیں یہ اپنی ضرورت کے مطابق زندگی کے ہر شعبہ کے مناسب مقدار میں نلکی زاد (Test Tube Baby) فراہم نہ کرلیں۔جو پیار ومحبت سے نا آشنا ہوں جو ہر قسم کے جذبات سے عاری ہوں اور جنہیں ان کے فرائض کے علاوہ کسی اور سے مطلب نہ ہو۔تب تو یہ نلکی زاد صرف گوشت کے روبوٹ بنے رہیں گے۔یہ کمپیوٹرائز ڈنسل رشتے ناطوں سے لاتعلق اپنے کام سے کام رکھیں گی۔اس بھیانک تصور ہی سے وہ کانپ اٹھا۔انسانی قدروں کی پاسبانی کے خیال سے اس کا معصوم دل بلاوجہ دھڑک اٹھا۔وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔اپنی نسل کی کردار کشی پر بھی اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔اب انسان قدروں کی پامالی پر وہ کیا کرسکتا تھا۔وہ سوچنے لگا انسانوں میں انسانیت کا جذبہ کس طرح پیدا کیا جائے اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوگیا تو یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی کامرانی ہوگی۔لیکن پھر وہ یہ سوچ کر بے چین ہوگیا کہ یہ عظیم کارنامہ وہ انجام نہیں دے سکتا۔انسان تو انسانوں کی نہیں سنتا وہ تو حقیر جانور ہے جس نے ساری زندگی گھورے پر گزاری۔ذہنی کوفت کی وجہ سے جنونی انداز میں چیخ اٹھا۔اے خدائے بزرگ و برتر اس سے زیادہ ان کم ظرفوں کو ترقی عطا نہ فرما۔اس کا دل شدت جذبات سے شق ہوگیا۔اس کی چونچ سے خون کی لکیر اس اخباری تراشہ پر کھنچتی چلی گئی جس پر جلی حرفوں سے تحریر تھا اس سال ہمارے ملک میں دو نلکی زاد بچوں کا وجود عمل میں آئے گا۔اکیسویں صدی کی ہولناک ترقی کو دیکھنے سے پہلے وہ مر گیا۔اسی گھورے پر اسکی محدود سلطنت میں اس اخباری تراشہ پر اس کی بے گور کفن لاش کوؤں اور چیلوں کو دعوت عام دے رہی تھی جس نے مر کر دوسروں کو غذا کے سنگین مسائل سے تھوڑی دیر کے لئے چھٹکارا دلایا۔

ریگستان کی سرحدوں کی طرف

محبوب پاشا اعظمی

موبائل : 9445377037

یہ نہ اس زمانے کی بات ہےاور۔۔نہ اُس زمانے کی بات۔دراصل کچھ ہے بھی نہیں ایک شہر ہے!
سنا ہے کسی زمانے میں نگرآباد کے نام سے جانا جاتا تھا۔یہ شہر کب بسا اور کس نے بسایا کچھ معلوم نہیں اور اِس گمنام شہر کی تاریخ بھی لکھی ہوئی کہیں نہیں ہے۔اور محکمہء آثارِ قدیمہ میں اِس شہر کا کوئی رکاڈ بھی نہیں ہے!۔۔کسی نے تو بسایا ہوگا!!کوئی بادشاہ کوئی شہنشاہ!کوئی راجہ کوئی مہاراجا!کوئی درویش کوئی فقیر!مگر ایسی کوئی دستاویز کہیں نہیں ملتی ہے کہ جس سے پتہ لگے کہ اس شہر کو کب کس نے بسایا تھا!پھر یہ شہر کیسے بسا؟
بس لے دے کے لوک گیتوں میں "فقیر بابا بساوہ نگرآباد" ایسے الفاظ ملتے ہیں اور ان لفظوں کے باشندوں کا ماننا ہے کوئی ملنگ بابا کئی سو سال پہلے اِس جگہ میں (جواب یہ شہر ہے) اکیلا رہتا تھا اُس کے آگے پیچھے رونے والا کوئی نہیں تھا!وہ ایک پیدائشی فقیر تھا نہیں بلکہ ایک ریاست کا راج کمار تھا۔۔ایک امیر زادہ تھا اور قدیم داستانوں اور کہانیوں میں جو قصے ملتے ہیں انکی طرح وہ بھی کسی مہ جبین کی زلف کا اسیر ہوگیا تھا اور اس مہ جبین کے عشق میں پاگل دیوانہ ہوگیا!اُس مہ جبیں نے ور مالا پہنتیسے پہلے ایک شرط رکھی تھی۔۔۔۔اور وہ شرط تھی اس سنسار میں جو اُسے سب سے ذیادہ ہر دلعزیز ہے اپنی جان سے بھی پیاری ہے اُس کا کلیجہ مہ جبیں کے قدموں میں ڈال دیں تو وہ مہ جبیں اس نوجوان کی ہو جائیگی۔نوجوان کو اس سنسار میں سب سے زیادہ عزیز اُس کی ماں تھی۔۔۔۔اور وہ نوجوان اپنی ماں کا کلیجہ لیکر بے خودی میں بھاگتا ہوا اس مہ جبیں کے محل کے سامنے گر پڑا۔۔ماں کے کلیجہ سے آواز آئی بیٹا!تجھے چوٹ تو نہیں لگی؟
شرط تو شرط تھی اور اگر مہ جبیں سے بیاہ کرنا ہے تو پوری تو کرنی ہوگی۔۔مگر وہ کہانی دوسری ہے!بہت قدیم ہے اور جو کہانی یہاں بیان ہو رہی ہے وہ کہانی یہ ہے:
اس کہانی میں جو ہیرو ہے وہ بیس پچیس سالہ ایک نوجوان ہے۔افسوس!اُسکی ماں کبھی کی پرلوک سدھار چکی ہے!نوجوان اب کیا کرے،شرط کیسے پوری ہو؟۔۔یہ خیال آتے ہی وہ پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا ہے اور اپنے بدن کے سارے کپڑے پھاڑ ڈالتا تھا اور بیاباں کا رُخ کرتا تھا۔مگر ایک دن ایسی ہی حالت میں

وہ بھٹکتا بھٹکتا اس مہ جبیں کے محل میں گھس جاتا ہے اور سید حامہ جبیں کی خواب گاہ میں پہنچ کر جنون کی حالت میں اُسے قتل کر دیتا ہے! گرفتاری کے خوف سے وہ ڈر جاتا ہے اور اپنی جان بچانے کے لئے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکتے بھٹکتے اس ویران بیاباں جگہ میں اپنی جان کو محفوظ جان کر اسی سرزمین کو اُس نے اپنا مسکین بنالیا اور یہاں رہنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی آدم زاد نہیں تھا! سرکاری دستاویزات میں ایسا کچھ بھی نہیں لکھا ہوا ہے! لوگ باگ اپنے بزرگوں سے سنی سنائی باتوں کو اپنے بچوں کو وراثت میں دیتے تھے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ لوگوں کا ایسا ماننا ہے کہ یہاں پہلے کوئی عورت نہیں تھی۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس شہر میں جو ایک اکیلا مرد تھا وہ اپنی جنسی ضرورت کیلئے اس شہر سے باہر قریب کے گاو؟ ں دیہات میں چلا جاتا تھا اور کافی تلاش کے بعد اُسے چند گھڑیوں کے لئے سہی عورت مل جاتی اور اُس کی ضرورت پوری ہو جاتی تھی۔ مگر ایک دن اُسے یہ کیا سوجھی کہ وہ اپنے ساتھ ایک عورت لے آیا۔ دوسرے دن دوسری لے آیا اور تیسرے دن تیسری عورت لے آیا اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔ اس شہر میں اس طرح دس پندرہ عورتیں ہوگئیں اور یہ عورتیں خوشی خوشی اپنے لئے الگ الگ مکان (حجرے) بنالئے اور اس شہر میں آباد ہوگئیں! اُس اکیلے آدمی کی موت کے بعد۔۔۔۔ پھر کیا تھا۔۔۔ وقت گزرتا گیا اور وقت کے ساتھ ہی جوان عورتوں کے لئے یہ شہر جانا جانے لگا! اور دولت مند لوگ دور دور سے یہاں آنے لگے جو اپنی بیوی سے مطمئن نہیں ہوتے تھے یا کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی بیوی میں طوائف تلاش کرتے اور ناکام رہتے وہ یہاں کا رُخ کرتے تھے!

دور دراز کے علاقوں میں یہ شہر عورتوں کے لئے مشہور ہو گیا اور دولت کی ریل پیل ہونی لگی۔ دور دور سے جوان عورتیں بھی دولت کمانے کے لئے یہاں آ کر بس گئیں تھیں! ان عورتوں نے اتنی دولت کمالی تھی کہ اب ان کو پیسے نہیں صرف مرد چاہئے تھا اس لئے وہ مردوں کو اپنے گھر رکھیل کی طرح رکھی ہوئی تھیں!

اور اس کے علاوہ کیا حالات ہوئے کہ یہ شہر بس تو گیا تھا مگر اس کی بنیادوں میں عورت کا عمل دخل تھا اور یہ آج بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان عورتوں میں اکثر ایسی تھیں جو پیار محبت میں اپنی عزت کا سودا کر کے ناکام ہو چکی تھیں اور کچھ ایسی تھیں جو پیار محبت میں دھوکا کھائی ہوئی تھیں اور جسم فروشی کو اپنا لیا تھا۔ کچھ تو اپنی بُری عادتوں کی وجہ سے اپنی عصمت لوٹا چکی تھیں اور کچھ عورتیں ایسی بھی تھیں جن کی عصمت خود ان کے رشتے ناطے والوں نے لوٹی تھی۔ کچھ عورتیں والدین کی غلطیوں کا شکار تھیں! چند ایسی بھی تھیں جو اپنے شوق کے لئے چرس گانجہ کی لت کی شکار ہو چکی تھیں، جسم کی دولت گنوا چکی تھیں! ایسی عورتوں کا ایک آشرام تھا یہ شہر!!

میرا اس شہر میں آنے کا ایک عجیب اتفاق تھا۔ایک بُھولی ہوئی داستان کی طرح ہے جو مجھے یہاں لے آئی تھی۔۔۔۔۔وہ ایک "حسین بلا" ایک خوبصورت لڑکی تھی۔۔۔میں ایک پریشان حال مسافر تھا! روزی روٹی کی تلاش میں مارا مارا ایک شہر سے دوسرے شہر بھٹک رہا تھا اور جب میں اس شہر میں بھٹکتا بھٹکتا پہنچ گیا تو ایک خوبصورت لڑکی سے آنکھیں چار ہوئیں اور اُس لڑکی سے مجھے پیار ہو گیا۔اور وہ جو ہونا نہیں تھا ایک ہی ملاقات میں ہو گیا! شاید اس شہر کی یہی رسم تھی یا روایت تھی! وہ لڑکی اس شہر کی رہنے والی تھی اور بلا کی حسیں تھی جو جوان مرد کو مقناطس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیتی! کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا۔

اِس شہر میں مجھے آئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہوا ہے اور مجھے ہر روز عجیب وغریب قصّے اور کہانیاں اس شہر کے بارے میں سننے کو مل رہی ہیں وہ حسین بلا! خوبصورت لڑکی کا نام مدھومتی ہے اور وہ میری ہر ویران رات کو شاداب کرتی رہی ہے اور میں چاہتا بھی یہی ہوں کہ وہ میری ہر رات۔۔۔۔۔! مگر اچانک میری ملاقات مدھو بالا سے ہوئی اور پہلی ہی ملاقات میں ہم دونوں نے اپنی اپنی جوانی کو سجانے اور سنوارنے میں لگ گئے تھے۔۔۔۔۔ ابھی کچھ دور ہی چلے تھے کہ مجھے ایک تیسری لڑکی انیتا بھا گئی اور میں اُس کے چکر میں بہت دور تک نکل گیا! یہ سلسلہ دو ہفتوں میں ہی ختم ہو گیا جب میں نے محبوبہ کی باہوں میں اپنی راتیں گزارنے لگا اور۔۔۔۔اب تو ہر رات ایک نئی کلی میرے بستر میں کھلتی ہے۔

اس شہر کے شب و روز بھی عجیب ہیں۔۔یہاں مرد ڈھونڈھنے سے ملتے ہیں۔۔۔۔عورتیں ہی عورتیں یہاں ہیں جو مرد کا شکار کرتی ہیں! یہاں اس شہر میں صبح سو رہی ہوتی ہے اور رات کی حکمرانی ہے اور رات جاگ جاگ کر جسم کے منتھن سے لذتوں کا امرت نکالنے میں لگ جاتی ہے اور جسموں کے سجنے اور سنوارنے میں سرمدی ماحول بھی جسم کی لذت کا مزا لینے لگتا ہے۔ اسی لئے اس شہر میں میں زیادہ دن ٹکا ہوں۔۔۔ورنہ دو دن سے زیادہ میں کسی شہر میں نہیں رُکا!

جسم کی بو باس کو قائم و دائم رکھنا اور جوانی کے مزے لوٹنا اس شہر کی ہر عورت اپنا مقدر مانتی ہے اور اسی پر عمل پیرا ہے۔یہ اپنے جسم کو کسی بھی جوان مرد کو خوشی خوشی پیش کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتی ہیں اور اپنے جسم کو مرد کو ارپن کرنا ان کے لئے ثواب ہے۔ ہر رات مک اپ میں گھومتی ملتی ہیں اور گھر کا دروازے کُھلا رکھتی ہیں! دہلیز پر چراغ رکھے اپنے رات کے مرد کا راستہ دیکھتی ہیں۔انتظار کرتی ہیں!

چاروں طرف سے سرخ روشنی کے سمندر میں ڈوبا ہوا یہ شہر! ہر رات ایک نیا مرد یہاں کی عورت کی

ضرورت ہے۔۔ کمزوری ہے۔ حمل ٹھہرنے کا کوئی چانس ہی نہیں ہوتا ہے اور غلطی سے اگر حمل ٹھہر بھی گیا تو اسقاطِ حمل کروا لینے میں یہاں کی عورت اپنی عزت سمجھتی ہے اور خوش ہوتی ہے۔ اور یہی ان کی شرافت ہے!

اسی لئے اس شہر میں عورت شادی بیاہ کی قید کو نہیں مانتی اور جو مرد مل جائے اُس کے ساتھ اپنا بستر لگاتی ہے۔۔ اپنا بستر شیئر کرتی اور ہر رات مرد بدلتے رہتے ہیں۔ یہ ان کا کلچر ہے۔ ان کے سماج کا ایک حصہ! یہاں اس شہر میں جوان عورتیں ہی عورتیں ہیں یا کمسن نابالغ لڑکیاں اور۔۔۔۔۔ بوڑھی عورت کو اس شہر میں رہنے کی نہ ضرورت ہیاور ہی اجازت! پھر یہ جوان عورتیں جب بوڑھی ہو جاتی ہیں تو کہاں جاتی ہیں؟ میں نے یہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی! لیکن اتنا سنا ہے۔ یہ بوڑھی عورتیں کہیں غائب کر دی جاتی ہیں یا خود ہی غائب ہو جاتی ہیں! لیکن۔۔۔ کہاں؟ کسی کو پتہ نہیں! جو کوئی ایک بار اس شہر میں داخل ہوتا ہے وہ اپنی کشتی جلا دیتا ہے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ سب راستے بند۔ اور اس شہر کی عورتوں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہاں کی جوان عورتوں کے جوان جسم لوگوں کو پاگل کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ اور ایک پتہ کی بات، یہاں کسی بھی مرد کی رات بغیر عورت کے نہیں کٹتی ہے اور یہاں عورتیں مرد کے بغیر رات سو ہی نہیں سکتیں! کسی بھی حال عورت کو مرد اور مرد کو عورت چاہئے رات کے سہانے سفر کے لئے! اور ایسا نہ ہو تو رات گزرے نہیں گزرتی اور کاٹے نہیں کٹتی! ایسی رات شاید ہی کبھی اس شہر میں آئے!

یہاں نوجوان مرد ہیں اور یہ شہر ان مردوں سے بھرا بھرا دکھائی دیتا ہے۔ اور بوڑھے مرد؟ ہیں! مگر سب کے سب اندھے اور ہجڑے ہیں! جوان عورتوں کے لئے کسی کام کے نہیں! مطلب بوڑھے آدمی کو اس شہر میں اگر رہنا ہی ہے تو اپنی دونوں آنکھوں کا بلیدان دینا ہوگا اور اتنا ہی نہیں اپنے اعضاء تناسل کا سرا کاٹ کر پھینک دینا ہوگا اور اگر وہ یہ نہیں کر سکتا ہے تو اُسے جلا وطن کر دیا جاتا ہے۔۔ اس شہر میں کچھ ایسی خاص بات ہے کہ کوئی اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا! میرا بھی یہی حال ہوا ہے۔ میں کب اس شہر میں آیا، کتنے دن ماہ سال بیت گئے پتہ نہیں! اور میں بھی ایک دن بوڑھا ہو جاؤں گا اور میرے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا! یہ خیال آتے ہی میں پاگلوں کی طرح ناچنے گانے لگتا ہوں!

مرد۔۔۔ جوان مردوں کو اس شہر میں کچھ کام دھندہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ہے۔ اس لئے مرد یہاں دن بھر سوئے پڑے رہتے ہیں کیونکہ ان کی ساری کی ساری رات ان جوان عورت کی نذر ہو جاتی ہے! جسموں کی گرمی رات بھر گرم بستروں میں پناہ لیتی ہے!

عورتیں مرد کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہیں۔

ایسی ہی ایک رات تھی اور مجھے ایک جوان خوبصورت عورت نے اپنے گھر بلا لیا تھا۔۔اس سے پہلے کہ ہم دونوں رات کی سیاہی میں ڈوب جاتے اور اپنے جسم کو رنگین بنانے میں لگ جاتے ،اچانک دروازے پر زور کی دستک ہونے لگی۔۔۔وہ عورت جسکا نام نینا ہے برہنہ حالت میں جھٹ سے اُٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی تو میں نے رات کی دھندلی سیاہی میں اُس کے صندلی جسم سے پھولجھڑیاں کی بارش ہوتے دیکھا اور۔۔۔ میرا جسم آگ میں جلنے لگا! میرے جسم کے پاتال میں اُتھل پتھل ہونے لگی!

جب کسی گھر میں مرد عورت کے ساتھ سویا ہوا ہے تو وہ عورت اپنے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لیتی ہے اور جس عورت کے گھر ابھی کوئی مرد نہیں آیا ہے تو وہ گھر کا دروازہ کھلا رکھتی ہے یہ یہاں کا دستور ہے جو یہاں کی ہر عورت کو ماننا پڑتا ہے! نینا نے تو میرے سامنے ہی میرے گھر میں داخل ہوتے ہی گھر کا دروازہ بند کر دیا تھا تو پھر یہ دستک کیسی؟ یہ یہاں کے اصولوں کے خلاف ہے!

" کون ہے؟ جو دستک دے رہا ہے۔۔"نینا نے اپنے ننگے جسم کے ساتھ دروازے کے پاس رکی رہی اور چلا کر کہنے لگی۔۔۔" کون ہے؟ جو اس شہر کے اصول نہیں جانتا؟ رات بالکل ننگی۔۔۔شبنم میں بھیک چکی ہے تو اس وقت دروازے پر دستک؟"

"دروازہ کھولو تو میں بتاو؟ں۔۔۔

دروازہ نہیں کھلے گا!اور جو کچھ بھی بتانا ہے باہر سے بتاو؟"۔۔۔ باہر کی خاموشی میں واپس لوٹنے والے کے قدموں کی آواز سنائی دی!

صبح جب میں نینا کے حجرے سے باہر نکلا تو ایک شخص میرا انتظار میں کھڑا ملا۔ میں اُسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔وہ مجھے غصہ میں لگا اور نہ جانے کیوں وہ مجھے اس شہر کا نہیں لگ رہا تھا۔ہوسکتا ہے رات دستک دینے والا یہی ہو؟ وہ بغیر کچھ مجھ سے کہے نینا کے حجرے کے اندر چلا گیا۔ مجھے پہلی بار اس شہر میں خوف اور ڈر کی آمد کا احساس ہوا اور میں اپنی حفاظت کے لئے نینا کے حجرے میں جانا چاہتا تھا مگر میں ایسا کر نہیں سکا۔کیوں کہ نینا کے حجرے میں ابھی ابھی تو وہ انجان شخص گیا ہوا ہے! اس شہر کا رواج ہے دن میں یہاں کی عورتیں مردوں کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتیں۔۔کسی مرد کو مُنہ نہیں لگاتیں! پھر یہ اجنبی؟ نینا کے حجرے میں کس لئے گیا ہے۔سوالوں کے تیر برسنے لگے اور میں گھائل بیہوشی کی حالت میں نینا کے حجرے میں تھا اور جب مجھے ہوش آیا تو نینا کے حجرے میں میرے علاوہ اور کوئی مرد نہیں تھا!

نینا مسکراتے ہوئی میرے قریب ۔۔۔۔ بالکل قرب آ گئی اور ۔۔۔اور قریب! مگر وہ اپنے جسم کا ہدیہ پیش نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ دن میں ایسا کرنا اس شہر کی روایات کے بالکل خلاف تھا! میں نے اپنے جذبات پر قابو پالیا اور نینا بھی اپنے سلگتے ہوئے جذبات کو کنٹرول میں کر لیا اور کہنے لگی: " آپ کو پتہ نہیں! کل رات دروازہ پر دستک کسی انسان مرد نے نہیں دی تھی اور وہ دستک دینے والا ایک جن تھا!

"جن "بدحواسی میرے وجود میں سما گئی۔ایک ڈر۔۔۔ایک خوف سا سارے جسم کو ڈسنے لگا!

"ہاں! جن۔

کیا جن بھی؟" ڈر و خوف اپنے انتہاء پر تھا!!

ہاں!"

اب مجھے نینا سے خوف لگنے لگا اور میرے اندر سوال پوچھنے کی طاقت ہی ختم ہو چکی تھی!!

"ڈر گئے کیا؟ نینا میرے چہرے کو پڑھنے لگی!

" نہیں! ایسی کوئی بات نہیں! لیکن ۔۔۔عجیب سا لگتا ہے کہ جن بھی آپ کے یہاں ۔۔

آپ غلط مطلب لے رہے ہو۔۔۔ وہ آپ انسان مردوں کی طرح اپنے جسم کی ضرورت پوری کرنے نہیں آتے! وہ ہمارے مالک ہیں۔وہ ہمارے مائی باپ ہیں وہ ہماری حفاظت چوبیس گھنٹے کر رہے ہوتے ہیں۔۔ہم اُن کے بچے ہیں! کل رات جو جن آیا تھا وہ جنوں کے سردار ابلیس کا ایک اہم پیغام لے کر آیا تھا۔ وہ پیغام کیا تھا؟ یہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گی! اور آپ کو یہ سب جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے!" کچھ رُک کر چند ثانیہ کے بعد وہ یوں گویا ہوئی۔۔"اب اس شہر کا مزاج بدلنے لگے گا اور جوان عورتیں یہاں سے کسی عجیب و غریب جزیرہ کی طرف کوچ کریں گی! اور یہ شہر جوان عورتوں سے خالی خالی دکھائی دیگا۔ "

اتنا سننا تھا کہ میں اپنے ہوش و حواس سمیٹنے لگا اور اس شہر کو الوداع کرنے کا اب وقت آ گیا تھا! لیکن میرے اندر کا مرد نہیں مان رہا تھا اور۔۔۔۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس شہر میں رہنے کو مجبور تھا۔

میں نے محسوس کیا اس شہر میں ضرور کچھ ہونے والا ہے۔نینا نے سچ کہا تھا واقعی میں اس شہر کا مزاج بدلا بدلا سا دکھائی دینے لگا تھا۔ایسا لگ رہا تھا کوئی اس شہر پر حملہ کرنے کی سازش میں پکڑا گیا ہے اور اس سازش کے اسباب معلوم کر لینے کی سعی کی جا رہی ہے اور ایک تحقیقی کمیٹی بنا دی گئی ہے!

اچانک جوان خوبصورت عورتیں شہر سے غائب ہو گئیں یا غائب کر دی گئیں۔۔۔اور ساتھ میں کمسن نا

بالغ لڑکیاں کوبھی جوان عورتوں کے ساتھ ہی غائب کردیا گیا تھا! جب جوان جسم ہی نہیں رہے تو؟ ۔۔۔۔
پھراس شہر میں رکھا ہی کیا تھا؟

یہ سب جوان خوبصورت جسم والی عورتیں کہاں گئیں؟

کون انہیں یہاں سے لے گیا۔۔۔۔کہاں لے گیا؟ جوان جسموں کی خوشبو کہاں چلی گئی ہے!
ہمارے وجود میں بسی جوان جسموں کی بُو باس کا اغواء ہوا ہے اور یہ کس نے کیا ہے؟ ہمارے پاس اسکا کوئی جواب نہیں تھا!۔سب درویشی میں پڑے رہے! لاچار، محتاج! میں نے ہمت کی۔۔۔ کوشش کی اس بات کا پتہ لگا لوں کہ یہ کس کے حُکم سے ہو رہا ہے اور کون یہ سب کروا رہا ہے اور کس لئے؟

جب میں نے اکیلے ہی اپنی تحقیق شروع کی اور اس کا سراغ ڈھونڈ لیا تو ایک انوکھی بات کا انکشاف ہوا۔ چند درویش صفت مرد معلوم نہیں کہاں سے اس شہر میں آ گئے ہیں اور ہمیں اسکا علم ہی نہیں ہے اور سنا اور دیکھا بھی ہے کہ ان بیچاروں کو عورتوں کے نرم و نازک گرم گرم جسموں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے!

وہ اپنے قائد کی تلاش میں نکلے ہیں اور اتفاق سے یہاں ان کا پڑاو؟ ہے! جب میں نے یہ سب پہلی بار سنا تو عجیب سا لگا اور میں نے اِسے سنجیدہ نہیں لیا!

ہمارے سامنے سب سے بڑا مدعاء عورتیں اور ان کا غائب ہونا تھا! اب راتیں وہ نہیں رہیں جہاں جوان جسم عریاں رقص میں اپنے آپ کو فراموش کردیتے تھے۔۔ یہ اچانک ۔۔کیا ہوا؟ جوان خوبصورت جسم کہاں غائب ہو گئے ہیں؟ مجھے یہ پتہ کرنا تھا۔اور میں دو چار جوان مردوں کو اپنے ساتھ لے کر اس مہم پر نکل پڑا۔

اب وہ راتیں کہاں وہ عریان جسم کہاں۔

وہ لذتوں کی بارش وہ دلربا ہوش ربا شرابی ماحول؟

ایک یاد ہو کر رہ جائیگا!

میں اور میرے ساتھی اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ رات اپنی شباب پر ہے اور گھروں سے ناچنے گانے کی آوازیں آرہی ہیں۔! یہ دیکھ کر اور یہ سن کر ہمارے اوسان خطا ہوئے۔۔۔ پہلی بار اس شہر کے گھروں سے ہم ناچ گانے کی آوازیں سن رہے تھے۔اب تک تو جسم کی لذت عبادت تھی اور یہ کیا۔۔۔؟ یہ ناچنے گانے والیاں کہاں سے آگئیں؟ وہ جسموں کی پوجارن عورتیں کہاں گئیں؟ اب تو اس شہر کا کردار ہی بدل گیا تھا۔اب گھروں میں جوان عورتوں کے بجائے ناچنے گانے والیاں تھیں۔۔۔تھیں تو یہ بھی عورتیں مگر لگتا تھا ان کے جسموں سے جوانی

رخصت ہورہی ہے یا ہونے والی ہے! وہ لذت۔۔۔وہ نشہ ان میں کہاں؟ تھیں تو یہ بھی خوبصورت! مگران کا کام جسم کی بُو باس اور شبنمی لذت کا نہیں! گانے بجانے کا تھا ناچنے دل بھلانے کا تھا۔۔۔اایک سرور ایک مستی بھری محفل سجانے اور سنوارنے کا تھا!

اب ہر رات ہر گھر سے ناچنے گانے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور مرد جسم کے قیدی۔۔۔جسم کی لذت سے محروم ان گانے بجانے والوں کے گھر آنے اور رات گزارنے لگے۔ اب یہاں کے گھروں (حجروں) کو نائٹ کلب کہا جانے لگا اور ان نائٹ کلبوں میں اب کیبرا اور مجرا ہونے لگا اور ساتھ میں شراب و کباب کا دور بھی چلنے لگے۔

مجھے اور میرے ساتھیوں کو یہ پتہ لگانا تھا۔۔ یہ سب کس کے حکم سے ہو رہا ہے اور یہ اچانک اس شہر میں جو تبدیلی آئی ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اب اس شہر میں جسم۔۔۔۔ کے بغیر دو پل سانس لینا بھی مشکل ہی نہیں مشکل ترین ہو گیا تھا اور ہم اپنے جسموں میں ایک نامعلوم سی کمی محسوس کرنے لگے تھے اور لگ رہا تھا اگر کچھ دن اس طرح بغیر سکس کے راتیں ہوں گی تو ہو سکتا ہے یہاں جتنے بھی جوان مرد ہیں اپنے ہونے کا ثبوت دینا بھول سکتے ہیں اور اپنے آپ کو مرد کے علاوہ کچھ اور سمجھنے لگے! ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ ابھی ہم اس ایشو پر غور و فکر کر ہی رہے تھے کہ پتہ چلا نائٹ کلبوں میں قتل ہو رہے ہیں کبھی ناچنے والی کا تو کبھی گانے بجانے والے سازندوں کا ہر رات ایک دو مرڈر عام سی بات ہو گئی تھی! زنا، شراب، جوا، بے ایمانی عام تھی!! عالم کاری کی وجہ جو کلچر وجود میں آیا ہے اس میں اخلاقی قدروں کی کوئی اہمیت ہی نہیں! یہی کلچر اس شہر کا بھی تھا۔

یہاں پولیس کا کوئی کام نہیں تھا اس لئے وہ برائے نام آتی اور بغیر کوئی تحقیقات کرے چلی جاتی تھی مگر یہاں ہر رات قتل پر قتل ہوتے رہے! سارے شہر میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔۔۔لوٹ مار، چوری ڈکیتی، مار دھاڑ، خون خرابہ، رشوت، عصمت ریزی اور اغواء کی وارداتیں عام ہو گئی تھیں! ایک مرد کے لئے دس دس عورتیں تھیں اور مرد تھے کہ عورتوں سے بھاگ رہے تھے! تو بھلا ایسے شہر میں کون رہنا چاہے گا؟ اچانک یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ زمین کے اس خطے پر بسنے والی ساری جوان خوبصورت عورتیں خوبصورتی کے مقابلے میں حصہ لینے کے لئے اور اپنے ننگے جسموں کی نمائش کرنے کے لئے ایک جزیرے کی طرف بھاگی چلی جارہی ہیں۔۔

ہم اس شہر سے الوداع لیں اور ہمارے لئے بہتر یہی ہوگا! اور ہم گنتی کے سو پچاس مرد اس شہر میں رہ گئے تھے اور میں نے نوٹ کیا ان سو پچاس لوگوں میں چالیس پچاس ایسے تھے جنہیں میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یہ کون لوگ

ہیں؟ پہلے کبھی انہیں نہیں دیکھا! یہ یہاں کیوں آئے ہیں؟ کس کام سے آئے ہیں۔ میں حیران پریشان! کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کس سے اس کا جواب طلب کروں؟ کوئی پُرانے ساتھی سے پوچھ لیتا ہوں! لیکن کیا پوچھوں؟۔۔۔نہیں! ان نئے چہروں سے ہی پوچھ لیتا ہوں۔ نہیں! ایسا کرنے سے ان کا اعتماد میں کھو دوں گا۔میں نے اپنے دماغ سے شک وشبہ کو جھٹک دیا! اور اپنے ان ساتھیوں پر ہی بھروسہ کرنا پڑا۔میری پریشانی کو دیکھتے ہوئے میرے ایک پرانے ساتھی نے مجھ سے کہنے لگا:

یہ جو نئے لوگ دیکھ رہے ہو اپنے امام کی تلاش میں اپنے امام کو ڈھونڈ تے ڈھونڈ ھتے ساری دنیا گھومتے گھومتے یہاں پہنچے ہیں! یہ سن کر میری حیرانی اور بڑھی اور میں اپنے اس ساتھی سے کہنے لگا:

انہیں آخر جانا کہاں ہے اور ان کے امام کہاں ملیں گے۔میرے یہ پوچھنے پر میرا ساتھی خموش رہا۔اُس کے پاس شاید اس کا کوئی جواب نہیں تھا!

یہ شہر اپنی رونق کھو چکا تھا۔اس لئے ہمارے لئے مناسب یہی تھا کہ ہم جلد از جلد اس شہر سے رخصتی لے لیں اور ریگستان کی سرحدوں کی طرف کوچ کر جانے کا پروگرام طے ہوا تھا۔ہمارے پچاس پچاس مردوں کے تین گروپ بنئے اور تینوں گروپ نے ایک ساتھ اسی شہر کے طیارہ گاہ کا رُخ کیا۔

طیارہ گاہ کی لابی میں میں اور میرے ساتھی بیٹھے ہوائی جہاز کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ۔۔۔ایک لشکر ننگے برہنہ جسموں کا جن پر کپڑے تو ہیں مگر نہیں کے برابر! ہمارے پاس سے گزر رہا ہے۔ اس لشکر میں سب میں آگے چار عورتیں ہیں جن کے جسم پر لباس برائے نام ہے ایک بڑا سا صندوق اپنے کاندھوں پر اُٹھائی ہوئیں ہیں اور لشکر کی زینت بنی ہوئی ہیں اور باقی عورتیں رقص کرتی ناچتی گاتی ہوئی موسیقی کی برسات میں بھیگی مدہوش چلی جارہی ہیں! میں نے اس لشکر میں نینا کو پہچان لیا اور اس نے بھی مجھے پہچان لیا۔میں نے نینا کو ہاتھ کا اشارہ کیا۔۔۔آواز دی اور وہ بھاگتی ہوئی میرے قریب آئی اور کہنے لگی۔" کیا یہ شہر چھوڑ کر جا رہے ہو؟

ہاں۔۔۔

مگر کیوں؟

جب تم جیسے جوان جسم نہیں تو پھر یہاں کون جھک مارے گا۔۔؟

وہ میری بات کاٹ دی اور کہنے لگی "اور بھی تو عیاشی کے اڈّے موجود ہیں اس شہر میں"

میں نے بھی اس کی بات کاٹ دے اور کہنے لگا" تمھاری بات کہاں؟ جواں خوبصورت جسم نہیں تو کچھ

بھی نہیں"

اس کے قریب جا کر میں نے اس شہر کی بگڑتی صورتِ حال کے بارے میں بتایا تو وہ اجنبی کی طرح مجھ تکنے لگی اور اپنی زبان سے کچھ نہیں بولی۔ دو تین سکنڈ کی خاموشی کے بعد کہنے لگی۔ تمہیں اس شہر کی اتنی فکر؟ کیا بات ہے؟؟

تم تو ایسا ہی کہو گی! اور یہ بڑا سا صندوق اور یہ اتنا بڑا لشکر؟ کہاں جا رہے ہو؟ کہاں کی سواری ہے اور کہاں جانا ہے؟ میرے سوال! جواب سے محروم رہے! اور وہ تھی کہ اصل بات کو اِدھر اُدھر کر رہی تھی اور وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے کچھ اور بتانے لگی:

دجّال کا نام سنا ہے؟ دجّال کو جانتے ہو؟

ہاں! جو صدیوں سے قید ہے؟

ہاں! وہی دجّال۔۔۔۔۔اب قید سے آزاد ہو گیا ہے اور یہ دنیا۔۔۔بس ختم ہی سمجھ لو! فتنوں کا دور آ گیا ہے"

دجّال کا نام نینا کے منہ سے سن کر مجھے حیرانی ہوئی اور میں اسی حیرت و یاس کی حالت میں نینا سے کچھ اور پوچھ لیتا۔۔۔ کوئی سوال کرتا۔۔۔ وہ جلدی میں تھی اور میرے کوئی سوال کا جواب دینے کے لئے اُس کے پاس وقت نہیں تھا یا شاید اس کا موڈ بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا!۔ پھر بھی میں نے پوچھ ہی لیا!" آپ لوگ اس وقت کہاں جا رہے ہو؟ اور یہ اتنا بڑا لشکر؟ اور یہ قدیم زمانے کا بابا آدم کے زمانے کا صندوق! کہاں لے جا رہے ہو؟ اس میں کیا ہے۔ یہ کوئی معمولی صندوق نہیں لگتا"

میں نے نینا سے سیدھا سادہ سا سوال کیا تو وہ مجھے سر سے پاو؟ں تک دیکھنے لگی اور میرا سوال، سوال ہی رہا۔۔۔ وہ خاموش رہی شاید کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس یا وہ کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اور وہ صرف اتنا کہنے لگی!

"ہم سب ایک عجیب و غریب جزیرہ پر جا رہے ہیں اس جگہ کا نام برمودا ٹکون ہے جہاں دجّال قید تھا اور اب وہ آزاد ہے" اور وہ پتہ نہیں کیوں نا چاہتے ہوئے بھی وہ بتانے لگی۔ یہ قدیم صندوق تابوتِ سکینہ ہے اس میں بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے تبرکات محفوظ ہیں اور اس جزیرہ کا ہی نہیں ساری دنیا کا وہ اب دجّال اکیلا حکمران ہے۔ ساری دنیا اس کی مٹھی میں ہے وہ جب چاہا دن کو رات میں تبدیل کر دے اور رات کو دن میں۔۔

جب چاہے بارش برسا دے! جوان عورتوں کا ہجوم ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے یہ ساری دنیا میں تباہی مچا دے گا!"

دجّال فتنوں کا دوسرا نام ہے!!

یہ سن کر میں نے بھی بات آگے بڑھا دی اور کہنے لگا" یہ تو سالوں سال سے کسی گمنام جگہ پر قید ہے "

نینا نے چاروں طرف اپنی نظروں کو گھمایا اور راز دانہ انداز میں کہنے لگی۔" اس کی قید کی ہوئی جگہ کا سراغ اسرائیل نے کئی سالوں کی تلاش اور جستجو کے بعد لگا لیا ہے!"

اور وہ کچھ ثانیہ کے لئے خاموش رہی اور پھر کہنے لگی۔"وہ کائنات کے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھانے میں مصروف ہیں۔"اب دجّال آزاد ہے۔۔۔۔۔"

میں نے نینا کی بات کاٹ دی اور یوں گویا ہوا۔۔۔۔۔۔"دجّال کی رہائی اس دنیا کے لئے تباہی اور بربادی ہے! اور جو کچھ بھی اس زمین پر بدامنی پھیلی ہوئی ہے یا پھیل رہی ہے ان سب کا ذمہ دار یہی دجّال ہے" میں نے اپنی بات کو طویل کر دی اور کہنے لگا۔"دجّال انسانیت کے کئے خطرہ ہے۔"

" میں! یہ سب نہیں جانتی۔۔ یہ سب مجھے معلوم نہیں! "۔ نینا نے اپنی لاعلمی ظاہر کر دی اور اس کے پاس بتانے کے لئے بہت کچھ تھا مگر وہ اپنی لاعلمی کا ناٹک کرنے لگی تھی۔۔۔ میں سمجھ گیا تھا وہ سب جانتی ہے لیکن بتانا نہیں چاہتی ہے اور پلک جھپکتے ہی وہ دوڑتی ہوئی اپنے لشکر سے جا ملی! نہ الوداع کہا اور نہ ہی رخصتی سلام! نینا کے چلے جانے کے بعد میری آنکھوں کے دائرے میں وہ بڑا سا لشکر اور وہ قدیم صندوق تابوتِ سکینہ دونوں قید تھے!

ہمارا طیارہ ہمیں ریگستان کی سرحدوں میں پتہ نہیں کہاں تپتی ہوئی ریت پر جلتی ہوئی دھوپ میں پھینک کر اُڑ گیا ہے۔ میں اور میرے ساتھی ریگستان میں بسائے گئے آئینوں اور روشنی کے شہر میں داخل ہو چکے ہیں اور یہاں بنی ہوئی ملٹی اسٹوری بلڈنگوں کا جال بچھا دیکھ کر حیرت میں ڈوب جاتے ہیں اور فلک بوس عمارتوں کی قطار وں میں اپنے کو کھو جانے کے خطرے سے بچنے کے لئے ایک ملٹی اسٹوری بلڈنگ کے ایک ایر کنڈیشن ریسٹورنٹ میں شراب اور شباب کا لطف اُٹھاتے ہیں اور بلیو فلموں کے ویڈیو بڑی اسکرین والے ایل سی ڈی ٹی وی پر دیکھنے میں لگ جاتے ہیں! یہاں آ کر میں نے نوٹ کیا کہ ہمارے چند ساتھی غائب ہیں۔ جب میں نے گنتی کی تو پتہ چلا پچاس ساتھی لاپتہ ہیں! اب سوال یہ ہے کہ یہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔انہیں آسمان ہضم کر گیا یا زمین نگل گئی۔آخر یہ گئے کہاں؟ کس نے ان کو غائب کر دیا؟ ایک ایسا سوال جس کا میرے پاس فی الحال کوئی جواب نہیں تھا۔

مگر ایک خوف۔۔۔؟ ایک انجان سا خوف ہمیں گھیر رکھا ہے اور ہمیں اپنی جان خطرہ میں دکھائی

دینے لگتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں جنگی لڑاکو امریکی، چینی اور روسی ٹانکروں کے ساتھ ایک بھاری فوج جنگ کے میدان کی طرف کوچ کرنے لگی ہے۔ سیاہ فوجی لباس میں سپاہی اور ان کے سروں پر سیاہ عمامے تو ضرور ہیں مگر کمر میں لٹکتی تلواروں کیجائے اے کے 47 رائیفلیں ہیں، گولا بارود اور دستی بموں کی تھلی، ہاتھوں میں سیاہ پرچم کے ساتھ گن مشین لئے پوری تیاری کے ساتھ یہ فوج دشمن کے تعاقب میں نکل پڑی ہے! میزائل داغے جانے کے لئے اسٹیشن بنایا گیا ہے۔ یقین ہو جاتا ہے دشمن پر حملہ کسی بھی وقت ہو سکتا ہے! یہ جنگ کہاں؟ کس ملک کی سرحد میں لڑی جائے گی پتہ نہیں! اندیشہ ہے اسی ریگستان میں جنگ ہوگی کیونکہ دشمن ریگستان کی سرحدوں پر ہی تباہی مچانے لگا ہے۔

اب اس جنگ کے بعد اس دنیا کا کیا ہوگا؟-- یہ دنیا کیا واقعی تباہ ہو جائے گی؟ ختم ہو جائے گی؟ اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب --- ایک اور جنگ ہے! سنا ہے یہ جنگ تیروں اور بھالوں سے لڑی جانے والی جنگ ہوگی!!

پتوں پر لکھی تحریریں

دیپک بدکی

موبائل : 9868271199

ایک چھوٹی سی دنیا تھی وہ۔ ٹرین نہ ٹرام، ٹیلی ویژن نہ موبائیل۔ کچھ گھروں میں ریڈیو تھا جس پر بزرگ خبریں اور موسم کی پیش گوئی سننے کے لیے بے قرار رہتے۔ نوجوان ہر بدھوار کو بِنا کا گیت مالا کا بے صبری سے انتظار کرتے اور بچے ہر اتوار کو بچوں کے پروگرام میں بھائی جان کی آواز سننے کے متقاضی ہوتے۔ اس کے علاوہ عشق کے مارے لڑکے لڑکیاں تھیں، جب دیکھو تب ریڈیو پر پرانی فلموں کے گانے سنا کرتے اور ریڈیو کی آواز اتنی بلند رکھتے کہ سامنے کھڑکی پر بیٹھی معشوقہ کے کانوں سے اس کے بول جا ٹکراتے اور وہ برہ کی آگ میں جلتی رہتی۔ پھر بھی کیا مجال کہ کوئی ایک دوسرے سے براہ راست بات کرنے کی ہمت جٹا لیتا۔ دونوں کو اس بات کا احساس ہوتا کہ سامنے والے کے دل میں کچھ کچھ ضرور ہو رہا ہے مگر ایک عجیب قسم کی جھجک تھی، گھبراہٹ تھی، سنکوچ تھا جو ان کو ایک دوسرے سے دور رکھتا۔ دراصل ایک دوسرے کا لحاظ ہوتا تھا، اس کی عزت و ناموس کا خیال رہتا تھا۔

''نہ جانے کیا سوچے گی اگر میں نے پیش قدمی کی؟''

''نہ جانے میرے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا اگر میں نے پہل کی یا مسکرا کر پیار کا اظہار کیا؟''

دونوں انہی وسوسوں میں برس ہا برس گزار دیتے تب تک جہلم دریا میں بہت سارا پانی بہہ جاتا۔ پھر شہنائیاں بج اٹھتیں۔ لڑکی کہیں اور بیاہی جاتی اور لڑکا کہیں اور۔ رُخصتی سے پہلے ریڈیو پر دوسری طرف یہ گانا بج اٹھتا۔ ''کہہ دو کوئی نا کرے یہاں پیار، اس میں خوشیاں ہیں کم، بے شمار ہیں غم، اک ہنسی اور آنسو ہزار.....''

اتفاقاً اگر عشق پروان چڑھتا بھی تو گھر سے میلوں دور ایک دوسرے سے ملنے کے لیے جانا پڑتا تھا۔ کالج کے پھاٹک کے باہر لڑکا انتظار کرتا، اپنی تعلیم فراموش کر کے کئی کئی گھنٹے وہاں کھڑا رہتا اور تب جا کر وہ نظر آتی، سفید شلوار اور سفید کرتے میں ملبوس، سر پر سفید اوڑھنی اوڑھے، بالکل سنگ مرمر کی چلتی پھرتی مورت کی طرح۔ مگر اکیلی نہیں اس کے ساتھ اس کی سہیلیاں ہوتیں، اور وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی۔ مجنوں جی تھوڑے فاصلے پر پیچھے پیچھے چلتے رہتے۔ بعض اوقات لیلیٰ پیچھے مڑتی، مسکراہٹیں بکھیرتی اور پھر وہی آگے آگے ہم اور پیچھے تم۔ گھر پہنچنے میں آدھا پون گھنٹہ تو لگ ہی جاتا تھا۔ تب تک دونوں ایک دوسرے کی صورت اپنی آنکھوں میں بسا لیتے۔ شام کو جب ہلکی سی چاندنی میں سارا ماحول نہا لیتا تو

محبوب کے ریڈیو سے گانا سنائی دیتا۔ ''آجا صنم مدھر چاندنی میں ہم تم ملے تو ویرانے میں بھی آجائے گی بہار....''

جوانی میں نرنجن ناتھ ڈرپوک بھی تھا اور شرمیلا بھی۔ اس لیے کبھی کسی لڑکی سے بات کرنے کی جرأت نہیں کی۔ اس نے پہلا عشق اپنی بیوی کے ساتھ ہی کیا تھا اور وہ بھی شادی کے بعد۔ ارینجڈ میرج تھی، والدین نے لڑکی دیکھ لی، اس کے خاندان کے بارے میں جانکاری حاصل کی اور جب پوری طرح مطمئن ہوئے تو بیٹے کی شادی کے لیے ہاں کہہ دی۔ نرنجن سے کوئی پوچھتا تو وہ صرف یہ کہتا کہ والدین جو بھی کریں گے مجھے منظور ہے آخر وہ میرا بُرا تو نہ چاہیں گے۔

ان دنوں سنتے تھے کہ شہر کی سرحد پر کہیں کوئی ہوائی اڈہ بھی ہے مگر دیکھا کسی نے نہیں۔ غریبوں کا ہوائی اڈے سے کیا کام! ہاں دن میں ایک دو بار گردوں پر ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ بچے آنگن میں جمع ہو کر اوپر آسمان کی طرف دیکھتے اور خوشی سے تالیاں بجاتے جب تک ہوائی جہاز نظروں سے غائب نہ ہوتا۔

بہت ہی چھوٹی سی دنیا تھی۔ ضرورتیں کم تھیں اور ذرائع آمدنی محدود تھے۔ تنخواہیں قلیل تھیں، گورنمنٹ نوکری مل جاتی مانو کوئی قلعہ فتح کر لیا ہو۔ سارے خاندان میں خوشیوں کی لہر دوڑ جاتی۔ پرائیویٹ کمپنیوں یا کارخانوں کا کہیں کوئی نام ونشان ہی نہ تھا۔ ہاں چند ایک پرائیویٹ بنک شہر میں کھلے تھے۔ جس شخص کو جوڑ توڑ کر کے بھی گورنمنٹ نوکری نہ ملتی اسے تجارت کا سہارا لینا پڑتا اور اگر سرمایہ نہ ہوتا تو کسی دکان پر ملازمت کرنی پڑتی۔ وہ بھی ممکن نہ ہوتا تو مزدوری کر کے پیٹ پالتا اور سردیوں میں پنجاب چلا جاتا۔ عام طور پر لوگ آبائی پیشہ جیسے کسانی، ملاحی، ماہی گیری یا کاریگری اپنا لیتے۔ بہر حال ہر ایک کے چہرے سے اطمینان اور قناعت ٹپکتی جیسے کسی کو کوئی غم وفکر ہی نہ ہو۔ ہر کوئی مالک دوجہاں کی اطاعت گزاری اور شکر گزاری میں اپنے شب وروز گزارتا۔ نرنجن ناتھ کو پنجاب نیشنل بنک، جس کا ابھی قومیانہ نہیں ہوا تھا، میں کلرک کی نوکری ملی اور وہ خود کو خوش نصیب سمجھنے لگا۔

ایسا نہیں تھا کہ اس وقت لوگوں کو کسی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا یا پھر ان کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی مگر وہ اسے اپنا نصیب سمجھ کر بھولنے کی کوشش کرتے۔ بیوائیں اپنے بچھڑے ہوئے شوہر کی یادوں کے سہارے ساری عمر گزارتیں۔ مردوں کو البتہ چھوٹ تھی۔ جب دیکھو نئی شادی کر لیتے۔ اِدھر بیوی مری نہیں اُدھر دوسری شادی ہوتی، دوسری بھی اگر آنکھیں موندتی، تیسری تیار رہتی۔ نہ عمر کا لحاظ اور نہ جذبات کی قدر۔ کہیں کہیں ایسی صورت حال ہوتی کہ اِدھر ماں بچہ جنتی اور اُدھر بیٹی۔ کسی لڑکے کا ماما اس سے کم عمر کا ہوتا اور وہ ماما کا لفظ سننے سے گھبرا جاتا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اُس دنیا میں نفسا نفسی نظر نہیں آتی تھی، کوئی ریس دکھائی نہیں دیتی تھی یا پھر کسی کی زندگی میں کہیں کوئی خلا نظر نہیں آتا تھا۔

اس چھوٹی سی دنیا میں کتنا سکون تھا۔ آدمی نوّے سال کی عمر میں بھی پہاڑیاں چڑھتا، نہ ذیابطس اور نہ ہی قلبی

امراض۔کبھی کسی کے منہ سے ایسے کلمات سنائی نہیں دیتے تھے کہ" ہے بھگوان،اب تو اٹھالے بہت جی لیا میں نے۔" آخر ایسے کلمات کی ضرورت ہی کیا تھی۔آدمی خود کو کیوں کوستا! بھرا پُرا گھر ہوتا۔دیکھ بھال کے لیے بیٹے بیٹیاں اور بہوئیں ہوتیں۔خوشیاں بانٹنے کے لیے پوتے پوتیاں اورنواسے نواسیاں ہوتیں۔جی بہل جاتا۔کوئی ٹوپی اتارتا،کوئی عینک چھین لیتا ،کوئی بھجنوں کی کتاب پھاڑ دیتااورکوئی حقے کی نے غائب کر لیتا۔بوڑھے کواس میں بھی عجیب سالطف آجاتا۔باہر سے وہ بچوں کوڈانٹتا مگر دل سے یہی چاہتا کہ وہ بندروں کی طرح اچھل کود کریں،کندھوں پر چڑھیں اور چھینا جھپٹی کرتے رہیں۔

مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ ان دنوں اکثر لوگ کم عمری ہی میں مرجاتے،عورتیں زچگی میں جان بحق ہو جاتیں اور بچے آنکھ کھولتے ہی بھگوان کو پیارے ہو جاتے۔جی بھی لیتے تو آگے جا کر جوانمرگ ہو جاتے۔دو تین دن کوئی مہلک بیماری آدبوچتی،حکیم ڈاکٹر سارے نسخے آزماتے جو کارگر نہ ہوتے اور مریض دم توڑ دیتے۔ہاں جو خوش نصیب زندہ رہنے میں کامیاب ہوتے ان کی عمر دوا دارو کے بغیر ہی دراز ہوتی۔اس کے برعکس آج کل جتنی بیماریوں کے نام سننے میں آتے ہیں ان سے تو دل ہی بیٹھ جاتا ہے۔انسان کی اوسط عمر بڑھ گئی ہے مگر ساتھ ہی وہ زندگی سے اکتا گیا ہے۔اذیت برداشت کرنے کے لیے مریضوں کی زندگی کے ایام میں توسیع کی جاتی ہے۔اور وہ تڑپتا ترستا،سکون آور دوائیوں کے بل بوتے پر دن گزارتا رہتا ہے۔

دراصل گذشتہ صدی نے ہماری کایا ہی پلٹ دی۔سائنس اور ٹکنالوجی نے زندگی کی رفتار تیز سے تیز تر کر دی۔کہتے ہیں دنیا نے جتنی ترقی ابتدا سے انیسویں صدی تک کی تھی اس سے زیادہ ترقی بیسویں صدی میں کر لی ہے۔ہر جانب فاصلے سکڑ گئے ہیں۔ساری دنیا ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہوگئی ہے۔کہاں تو نرنجن ناتھ نے جغرافیہ کا سبق پڑھتے ہوئے امریکا اور برطانیہ جیسے ممالک کا نام سنا تھا اور نقشے پر ان کا محل وقوع دیکھا تھا اور کہاں اب اس کے دونوں بچے تعلیم حاصل کر کے سمندر پار ان ملکوں میں جا بسے ہیں۔بیٹا امرت ٹیکساس میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کر رہا ہے اور بیٹی ارادھنا یو کے میں ڈاکٹر ہے۔امرت جن دنوں ایم بی اے کرتا تھا کالج کی ایک لڑکی پر فریفتہ ہوگیا،امیر باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور پڑھائی میں بہت تیز۔دونوں کی جوڑی خوب جمی اس لیے اپنے والدین سے بات کر کے شادی کر لی۔نہ جنم پتری اور نہ نجومی کی رائے،نہ ذات کی فکر اور نہ منگلیک کا چکر،تاہم شادی میں ہندو ریتی رواج کے تحت سات پھیرے لگائے گئے۔چونکہ نرنجن ناتھ کشمیر سے ہجرت کر کے دوارکا دہلی میں رہ رہا تھا اس لیے ریسپشن اشوکا ہوٹل دہلی میں دیا گیا۔پھر دو روز بعد ہی دونوں اپنا بوریا باندھ کر امریکا چلے گئے ۔بیٹی انورادھا کا معاملہ کچھ مختلف سا تھا۔لیڈی ہارڈنگ میں ایم بی ایس مکمل کرنے کے بعد ہسپتال میں انٹرن

شپ کر رہی تھی جہاں ایک سینئر ڈاکٹر کی نظر اس پر پڑی۔ دو چار ملاقاتیں ہوئیں اور پھر بات ازدواجی بندھن تک آ پہنچی۔ شادی کرنے کے بعد انھوں نے بھی ملازمت کے لیے برطانیہ کی راہ لی۔

باقی بچے نرنجن ناتھ اور اس کی بیوی نرملا۔ اتنے بڑے کنکریٹ کے شہر میں دونوں مہاجر ایک دوسرے کا منہ تکتے رہتے۔ انھیں ہر چہرہ اجنبی لگتا۔ نہ آگے کوئی اور نہ پیچھے کوئی۔ اکیلے دوکیلے کا اللہ بیلی۔ انھیں اپنا فلیٹ ایک دڑبے کی مانند لگ رہا تھا، چاروں طرف سے بند، نکلنے کا ایک ہی راستہ اور نیچے اتر کر سامنے سڑک تھی۔ نہ سبزہ، نہ پھول پتی اور نہ سایہ دار درخت۔ بات کرنے کو کوئی اپنا نہ ملتا۔ کالونی میں سب لوگ مختلف ریاستوں سے تعلق رکھتے تھے اور مختلف بھاشائیں بولتے تھے۔ میاں بیوی ایک ساتھ مارننگ واک اور اشیائے خوردنی خریدنے نزدیکی بازار میں چلے جاتے، باقی وقت فلیٹ کی چار دیواری ہی میں گزرتا۔ بچے ہفتے میں کئی بار وہاٹس اپ پر ویڈیو کال کرتے، دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھتے اور دیر تک باتیں کرتے۔ ان کی کوشش رہتی کہ والدین کو دلاسہ دیں اور انھیں تنہائی محسوس نہ کرنے دیں۔ مگر والدین تھے کہ بہت ساری باتیں کر کے بھی تسلی نہ ہوتی۔ کال ختم ہوتے ہی وہی اکیلا پن اور وہی بے مہری کا احساس ہونے لگتا۔

اور پھر ایک روز سرکار نے لاک ڈاؤن کا اعلان کر دیا۔ کورونا وائرس کے سبب لوگوں کی نقل و حرکت پر قدغن لگائی گئی۔ راستے پر کہیں کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ چاروں طرف صرف پولیس کی گاڑیاں اور پولیس والے۔ نیشنل اور انٹرنیشنل ہوائی اڑانیں بند ہوگئیں۔ ٹرانسپورٹ اور ریل گاڑیاں بھی بند ہوگئیں۔ نرنجن ناتھ اور نرملا کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ اس بڑھاپے میں کیسے گزر بسر کریں گے؟ اُدھر امرت اورارادھنا بھی پریشان ہو رہے تھے مگر لاچار تھے۔ دن میں کئی بار ویڈیو کال پر ماں باپ سے بات کرتے اور انھیں ڈھارس دیتے۔

آج لاک ڈاؤن کا آٹھواں دن تھا۔ نرنجن ناتھ نیند سے جاگا مگر نرملا ابھی سو رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آج کیا بات ہوگئی۔ یوں تو نرملا علی الصباح ہی جاگ جاتی تھی اور اس کے لیے بیڈٹی بنا کر لاتی تھی۔ وہ گھبرا گیا۔ نرملا کو جگانے کے لیے اسے ہلایا ڈلایا۔ وہاں کوئی جوابی حرکت نظر نہیں آئی۔ اس کی نبض ٹٹولی مگر وہاں بھی خاموشی پائی۔ نیچے جا کر پولیس سے مدد مانگی۔ وہ نرملا کو پاس ہی ایک ہسپتال تک لے گئے جہاں ڈاکٹر نے اسے مردہ قرار دیا۔ نرنجن ناتھ کے سر پر جیسے آسماں گر پڑا۔

حسب معمول امرت نے ویڈیو کال لگائی۔ اس وقت نرنجن ناتھ ہسپتال میں تھا۔ امرت کی ماں جس نے اس کو نو مہینے اپنی کوکھ میں پالا تھا اور عمر بھر دنیا کے سرد و گرم سے بچا کر رکھا تھا، آج دنیا سے کوچ کر گئی تھی۔ وہ بے بس تھا۔ کچھ کر بھی نہ سکتا تھا۔ اس کے آنے کی امید تو صفر کے برابر تھی۔ بین الاقوامی ہوائی جہاز بند تھے۔ نہ وہ آسکتا تھا اور نہ ہی

ارادھنا۔ دریں اثنا ارادھنا کو بھی اس نے خبر کردی۔ روتے بسورتے امرت نے اپنے پتا جی سے گزارش کی۔

''پاپا، ممی کی صورت تو دکھادو۔ کیا اسی دن کے لیے میں نے جنم لیا تھا کہ اس کی آخری رسومات میں بھی شرکت نہ کرسکوں؟''

''بیٹے، یہ سب کال چکر کی دین ہے۔ اس میں انسان کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ تمہاری ماں تمھیں آسمان کی بلندیاں چھوتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے آخری سفر پر تم اس کا کریا کرم بھی نہیں کر پاؤ گے۔'' نرنجن ناتھ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

نرنجن ناتھ نے اپنے موبائیل کا رُخ نرملا کی جانب کیا اور بیٹے کو اپنی ماں کے آخری درشن کرائے۔ کال جونہی ختم ہوئی تو ارادھنا کی ویڈیو کال آئی۔ وہ بھی زاروقطار رو رہی تھی۔

''پاپا، یہ کیا ہوا۔ ممی ہمیں چھوڑ کر کیوں چلی گئی؟ اسے تو کوئی ایسی بیماری بھی نہ تھی۔''

''بیٹے، رات کو معمول کی طرح سوئی، مگر صبح جاگ ہی نہ پائی۔ تمہاری ممی تو مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔ میں ٹوٹ گیا ہوں، بکھر گیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کس کے سہارے جیوں؟ میرا ہم سفر مجھ سے بچھڑ گیا ہے بیٹی۔'' نرنجن ناتھ کی گھگی بندھ گئی۔

''پاپا، صبر کیجیے، ہونی تو ہوکر ہی رہتی ہے۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ گذشتہ سال آپ لوگ یہاں آئے تھے، کہیں کوئی شبہ بھی نہیں ہوا کہ ممی اتنی جلدی ہمیں چھوڑ کر چلی جائے گی۔ پاپا مجھے اس کے انتم درشن تو کرائیے۔''

نرنجن ناتھ نے پھر ایک بار موبائیل کا رخ موڑا اور ارادھنا کو نرملا کا چہرا دکھایا۔ پھر کال بند ہوگئی۔

نرنجن ناتھ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سنسان ماحول میں کیسے لاش کو مرگھٹ تک پہنچائے۔ کوئی اپنا قریب نہ تھا۔ چند ایک رشتے دار تھے مگر سبھی دور تھے اور ٹرانسپورٹ بند ہونے کی وجہ سے کوئی آ نہیں سکتا تھا۔ وبا کی وجہ سے انسان انسان سے ڈر رہا تھا، ایسی صورت میں پڑوسیوں سے امید کرنا واجب نہ تھا۔ پولیس نے نرملا کا انتم سنسکار کرنے کے لیے نزدیک ہی مرگھٹ کے انتظامیہ سے رابطہ قائم کیا۔ ان کی جنازہ گاڑی آئی اور لاش کو اٹھا کر لے گئی۔ ساتھ میں صرف نرنجن ناتھ تھا اور کوئی نہیں۔

آخر کار نرنجن ناتھ نے چِتا کو اَگنی دکھائی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی پتنی کے مردہ جسم کو آگ کی لپٹوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

ایک ماں کا شریر پنچ تتو میں ولین ہونے لگا۔ اس وقت نہ اس کا بیٹا حاضر تھا اور نہ ہی اس کی بیٹی۔

آدھے جسم کا آدمی

کیپٹن زین العابدین خاں

موبائل : 9822837116

اسلم خاں ایک فوجی تھا جو اپنے فوجی میس کے بار (Bar) میں بیٹھ کر شراب پی رہا تھا۔فوج میں شراب کوئی ضروری نہیں ہے، مرضی پی لو اور مرضی نہ پیو یہ آپ کے اوپر ہے۔ویسے نشہ کے تین اسٹیج ہوتے ہیں۔ پہلے پیگ کے بعد آدمی لومڑی کی طرح چالاک ہو جاتا ہے، دوسرے پیگ کے بعد آدمی بھیڑیے کی طرح غرّانے لگتا ہے اور آدمی اپنی زبان چھوڑ کر انگریزی بولنے لگتا ہے، تیسرے پیگ کے بعد آدمی شیر کی طرح دھاڑنے لگتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ اعلان کر دیتا ہے کہ میں اس ملک کا وزیر اعظم ہوں اور چوتھے پیگ کے بعد وہ سُور ہو جاتا ہے۔ایک لوک کتھا کے مطابق شیطان نے نوح کے ناؤ سے انگور کا پودا چوری کر لیا تھا اور نوح کو اسی شرط پہ انگور کا پودا واپس کیا کہ جہاں کہی بھی یہ پودا لگایا جائے ایک دِن وہ پانی ڈالے گا۔شرط بہت آسان تھی اس لیے نوح راضی ہو گئے اور اپنی باری پہ جب اُسے انگور کے پودے میں پانی ڈالنا تھا، ایک دِن لومڑی کا خون، دوسرے دِن بھیڑیے کا خون، تیسرے دِن شیر کا خون اور چوتھے دِن سُور کا خون اُس پودے کی جڑ میں پانی کی جگہ ڈال دیا اور یہی وجہ ہے کہ یہ تینوں اسٹیج سے ہر شرابی گزرتا ہے۔ابھی اسلم کا دوسرا پیگ ہی چل رہا تھا کہ اُس کا جگری دوست جسونت سنگھ بار میں پہنچ گیا اور ضد کرنے لگا کہ اب تیسرا پیگ نہیں پینا ہے بلکہ ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھ کے کھانا کھانا ہے لیکن اسلم بضد ہو گیا ''نہیں ایک اور پیگ بنانی ہے، اس کے بعد کھانے کے ٹیبل پہ چلے گیں'' جسونت چُپ چاپ ایک صوفہ پہ بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگا۔اسلم نے جب تیسری پیگ گلے کے نیچے اُتار لیا تو اُسے کافی نشہ چڑھ چُکا تھا، وہ نشہ کی حالت میں جسونت سنگھ سے بولا،

''جسونتے اگر مجھے اس دنیا کا مالک بنا دیا جائے تو تم جانتے ہو میں کیا کرونگا؟'' جسونت سنگھ نے اُس کے کمر میں ہاتھ ڈال کر اُٹھایا اور پوچھا،

''دنیا کا مالک بن کے کیا کرو گے؟''

''میں دنیا کی ساری عورتوں کو ایک میدان میں اکٹھا کرتا اور سب کو ایٹم بم سے اُڑا دیتا، پھر پوری دنیا

میں شانتی پھیل جاتی۔''

''بھائی ساری دنیا کی عورتوں میں تو تمہاری ماں اور بیوی بھی ہوگی ،کیا تم اُن کو بھی بم سے اُڑا دیتے؟''

''بالکل، اِن دونوں نے ہی میرا جینا حرام کر دیا ہے، اِن دونوں کو بھی اڑا دونگا۔''

اسلم خاں کی اِس طرح کی باتوں سے جسونت سنگھ سمجھ گیا تھا کہ اب یہ بُری طرح شراب کے نشہ میں چُور ہے، اِسے کھانا کھلا کے اِس کے بستر پہ سُلانا ہی بہتر ہے لیکن اُس کی یہ بات اُس کے ذہن میں چُبھ گئی ۔ویسے ساس بہو کا جھگڑا ہر گھر میں ایک عام سی بات ہے لیکن دونوں کو یا ساری دُنیا کی عورتوں کو بم سے تباہ کرنا یا مار ڈالنا ایک عجیب سی بات ہے۔

اب تو موبائیل کا زمانہ آ گیا ہے، چاہے جس سے جب بات کرلو،سب کچھ آسان ہے۔آج سے چالیس سال پہلے جب فیلڈ ایریا میں فوجیوں کو اُن کی بیویوں کا خط نہیں ملتا تھا تو بار میں بیٹھ کر شراب پیتے تھے ،اگر وجہ پوچھو تو بتائیں گیں،

''یار بیوی بچوں کی خیریت نہیں مِل رہی،کوئی خط نہیں آرہا ہے''اور اگر بیوی کا خط آ گیا ہے تو بار میں بیٹھ کر شراب پی رہے ہیں،اگر پوچھو کہ کیا ہوا ہے تو کہے گیں،

''گھر میں جھگڑا شروع ہو گیا ہے، بھائی الگ ہونا چاہتا ہے اور ماں بھی اُسی کا ساتھ دے رہی ہے۔''

لیکن اسلم خاں کی ساری باتیں الگ تھیں،وہ سب سے زیادہ اپنی ہی ماں سے پریشان تھا۔جب بھی اُس کی ماں کا خط اُسے فوج میں ملے گا وہ اُسے کھول کے پڑھے گا نہیں کہ کیا لکھا ہے بس شام ہوتے ہی بار میں گھس جائے گا اور تین چار پیگ پی کے بُری طرح نشے میں لڑکھڑاتے نکلے گا۔ایک دِن جسونت سنگھ نے کہا،

''اِسے کھول کے پڑھ تو لے، یہ تیری ماں کا خط ہے، جِس کے قدموں کے نیچے تیری جنت ہے۔''

''یار مجھے معلوم ہے کہ اِس خط میں کیا لکھا ہوگا ،میری تیسری بہن کی شادی کا ذکر ہوگا ،اب میرے پاس بیچنے کے لیے میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور کچھ نہیں۔''اتنا کہنے کے بعد اسلم نے شراب کی پوری گلاس خالی کر دی۔جسونت سنگھ پھر اُسے ڈھکیلتے ہوئے ڈائننگ ہال کی طرف لے گیا تا کہ وہ بھر پیٹ کھانا کھا لے۔

اسلم خاں یو پی کے غازی پور ضلع کا رہنے والا پٹھان تھا،اُس کی تین بہنیں تھیں۔اُس کے والد نے بچے تو ضرور پیدا کیے لیکن سب کے سب رام بھروسے،لڑکوں کی زندگی تو کٹ جاتی ہے لیکن جب لڑکیاں جوان

ہوتی ہیں اُن کا بدن بھرنے لگتا ہے تو اُن کی شادیاں کرنی پڑتی ہیں، اُن کے لیے مناسب رشتے ڈھونڈنے پڑتے ہیں اور پھر جہیز کی لعنت جیسی چیز سامنے آ کے کھڑی ہو جاتی ہے۔

جب اسلم کی پہلی بہن کی شادی ہوئی تو گھر کے سارے زیوروں کی پالش ہوئی، پیتل کے پُرانے زمانے کے بڑے بڑے برتنوں کو بیچ کر نئے نئے برتن لیے گئے۔ رضائی، گدّے، فرنیچر گھر کی چیزوں کو توڑ کر یا بیچ کر بنا دیے گئے اور اُس کی ماں نے ایک ایک سامان کا خوب دِکھاوا کیا اور جب اسلم کی دوسری بہن کی شادی ہوئی تو اسلم کی بیوی کے سارے زیور چھین لیے گئے یہاں تک کہ ناک کی کیل بھی اُتار لی گئی، سماج میں عزت کا سوال تھا، لڑکی خالی خولی سسرال کیسے جائے گی۔ اسلم کی بیوی کچھ نہ بولی، خالی خولی اپنے شوہر کا منہ دیکھتی رہی۔ اب اُس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا کہ وہ پہن کر کسی کے شادی میں جائے۔ غازی پور کے دیہاتی علاقوں میں عورتوں کا سماج الگ ہے، گھر میں شادی سے پہلے مٹ منگرا، رسم چوک، ہلدی، مہندی جو خالص عورتوں کے رسم و رواج ہے اُسے دھوم دھام سے کیا جاتا۔ اِن رسموں میں عورتوں کا مِلنا جُلنا، گیت، رنگ سب ہوتا ہے۔ ویسے بھی اِن عورتوں کو آپس میں مِلنے جُلنے کا یہی موقعہ ہوتا ہے ورنہ اِن کے پاس گھر کے کام اتنے ہوتے ہیں کہ سر اُٹھانے کی فرصت نہیں ہوتی ہے۔ اسلم کی بیوی اُن جگہوں سے بیماری کا بہانہ بنا کر کترا جاتی کیونکہ اُس کا ناک، کان اور گلا سب زیور سے خالی تھا۔ زیور عورتوں کے لیے بہت معنی رکھتے ہیں ورنہ وہ جوانی میں ہی بیوہ لگتی ہیں، اُلٹے اسلم کی ماں نے اِدھر اُدھر سے اتنا قرض لے لیا کہ اسلم کا گردن چھڑانا مشکل ہو گیا لیکن اسلم کی ماں کو کمی برداشت نہیں تھی۔ دوسری لڑکی کی بھی شادی دھوم دھام سے ہو گئی، اب اسلم ٹوٹنے لگا۔ فوج کی نوکری میں اُس زمانہ میں کُل پانچ سو روپئے تنخواہ، اب اُس کے بھی بچے ہوئے، ننگے پاؤں، پھٹے فراک اور بیوی کسی بیوہ کی طرح صرف دو کپڑوں میں۔ ویسے غریب کی بھی شادی ہوتی ہے لیکن وہ غریب کی طرح شادی کرتا ہے لیکن جب غریب اپنی ناک اونچی کر کے امیر کی طرح ٹھاٹ باٹ کرنے لگتا ہے تو بظاہر سماج میں سب کو معلوم ہوتا ہے لیکن وہ اپنے میاں مٹھو بنا رہتا ہے۔

اب اسلم اور اُس کی بیوی ٹوٹ کر بکھرنے لگے، بات بات پہ جھگڑا، ساس چلاّتی، بہو منہ ڈھک کے روتی اور اسلم گھر سے بھاگ جاتا اور تب تک باہر رہتا جب تک شام نہ ڈھل جاتی، اُس کے بچے اِدھر اُدھر کھیلتے رہتے، نہ وہ ماں سے کچھ کہہ پاتا اور نہ بیوی سے، اُس کے لیے اُس کی ماں ایک مقدس چیز تھی، کبھی بھی ماں سے اونچی آواز میں بات نہیں کرتا اُسے معلوم تھا کہ وہ اِسی ماں کے پیٹ سے نکلا ہے اور اِسی کے قدموں کے نیچے جنت ہے لیکن اپنی عورت کی بے بسی بھی اُس سے دیکھی نہیں جاتی۔ اب اُسے لگتا تھا کہ اُس کے آدھے جسم کو چیر دیا جائے گا۔ ایک

طرف ماں کا مقدس چہرہ اور نا جائز دباؤ اور دوسری طرف اُس کی عورت کی بے گناہی کی تڑپ۔ بچے کہتے پاپا ہمیں جوتے بازار سے لادو لیکن جیب میں پیسے نہیں، سب ماں نے لے کر اپنے قرض ادا کر دیے۔ جب کِسی رسّی کو زیادہ کھینچ دیا جائے تو وہ بیچ سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اسلم ٹوٹ گیا اور اپنی بیوی بچوں کو لے کر ملیٹری کواٹروں میں چلا آیا۔ اب ماں کا قرض ادا ہو کہ نہ ہو، اُس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اب تیسری اور آخری بہن بھی جوان ہو رہی تھی، اُس کے بھی رشتہ آنے لگے تھے لیکن اسلم اب اپنی بیوی کے ساتھ کِسی پرندہ کی طرح اپنے گھونسلے میں رہنے لگا تھا۔ ماں کا خط آتا، اُسے بغیر کھول کے پڑھے ہی وہ ہر ماہ اپنی ماں کو کچھ روپے بھیج دیتا، ماں کہتی اتنے پیسوں سے کیا ہوگا، وہ کہتا میری اوقات ہی اتنی ہے اب میں چوری تو کر نہیں سکتا ہوں۔ دِن گزر گئے ماں بیٹے کی دوری بڑھتی گئی۔ پہلے ماں ہر مہینے میں دو۔ دو خط لکھتی تھی، اب صرف ایک لکھنے لگی وہ بھی اِس لیے کہ تمہارا بھیجا ہوا منی آڈر مِلا ہے، اس سے آگے کچھ نہیں۔

ایک خط اُس کی ماں نے ایسا بھیجا کہ وہ پڑھ کے بہت رویا، اُس میں لکھا تھا کہ ایک ماں اپنے بچہ کو بنانے میں بیس سال لگاتی ہے لیکن دوسری لڑکی اُس کو صرف بیس منٹ میں بے وقوف بناتی ہے، آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ تم اپنی بیوی کے غلام ہو چکے ہو۔ پہلے تمہارے پیسوں پہ میرا حق ہے بعد میں تمہاری بیوی بچوں کا۔ اِس خط کے بعد اب ماں بیٹے میں خط و کتابت بھی بند ہوگئی۔

اِس بیچ اُس کے دو بچے ملیٹری اسکول میں داخل ہو گئے تو اُس نے ماں کو پیسہ بھی بھیجنا بند کر دیا لیکن اندر سے وہ اِتنا ٹوٹا جیسے آسمان سے گر کر کھجور کے پیڑ پہ اٹک گیا ہو۔ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کا جب وہ چہرہ دیکھتا تو اپنی ماں کا چہرہ وہ اپنے ذہن سے مٹا دیتا لیکن ماں کو چھوڑنے کا، پیسہ بند کرنے کا ایک گناہ اُس کے ضمیر کو ہمیشہ جھنجھوڑتا رہا اور بعد میں اُس کے دِل میں یہ بات آتی کہ ٹھیک ہے اگر خدا مجھے دوزخ میں ڈالے گا تو وہ قبول ہے لیکن اب میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ انصاف کرونگا۔

ہر عورت کی زندگی میں ایک بات بہت صاف صاف نظر آئے گی۔ عورت اگر ساس ہے تو اُس کی بہو غلط ہے، عورت اگر بہو ہے تو اُس کی ساس غلط ہے، اگر بھابھی ہے تو نند غلط ہے، اگر نند ہے تو بھابھی غلط ہے، بہو کے لیے سسرال کا ہر آدمی غلط ہے اور ساس کے لیے بہو کا رشتہ ہی غلط ہے، عورتوں سے مرد اتنا نفرت نہیں کرتے جتنی عورتیں خود عورتوں سے نفرت کرتی ہے اور اِس نفرت نے دُنیا کا اتنا بڑا اسائز کر دیا۔

تقریباً پانچ سال کے بعد معلوم ہوا کہ اُس کی بوڑھی ماں کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، وہ گاؤں گیا تو

ماں بغیر دوا علاج کے بستر پہ پڑی تھی۔ وہ اُسے دیکھ کے بہت رویا اور انھیں اپنے ساتھ کسی طرح لایا۔ اُس کی ماں کی عمر اب نوے سال سے تجاوز کر چکی تھی، اب وہ ٹھیک تھیں۔ ایک دِن اچانک اُن کی طبیعت بگڑی اور اُنھوں نے اپنے بیٹے اسلم کو آواز دی،

''اسلم بیٹے مجھے اُٹھا کے بٹھاؤ۔''

اسلم نے اُن کے بوڑھے جسم کو بستر سے اُٹھا کے بٹھایا، اُن کے کمر میں بالکل جان نہیں تھی، وہ پوری طرح سے اسلم کے گود میں آگئیں، اب اُن کی سانس تیز تیز چلنے لگی، اسلم نے سمجھ لیا کہ ماں کا آخری وقت ہے ،اُس نے روتے ہوئے کہا،

''ماں مجھے معاف کر دو ورنہ مجھے خدا بھی معاف نہیں کرے گا کیونکہ میں نے آپ سے تعلق ہی توڑ دیے تھے۔''

''بیٹا مجھے سب معلوم ہے کہ تمہارا آدھا جسم و جان تمہارے اپنے بیوی بچوں میں تھا اور آدھا مجھ میں اور جب غریب انسان انصاف کرنے لگتا ہے تو خود بھی ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے، مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔''

اور پھر انھوں نے اسلم کے ہاتھوں کو ایسے چوما جیسے اسلم کوئی چھوٹا بچہ ہو اور پھر اُن کی روح پرواز کر گئی۔

روشنی کا پُراسرار سایہ

سیدانجم رومان

موبائل : 9832242047

کمپنی سے دفتری کام کے کے لئے پٹنہ جانے کی پیشکش تھی اور میں فوراً راضی ہو گیا۔

ہم وہاں ایک زمانے کے بعد گئے تھے۔خالو سے پہاڑ پور میں ایک مختصر ملاقات کی عمدہ سبیل نکل آئی۔ہم نے پٹنہ سے کولکاتا کی واپسی پر خالو کے یہاں آدھے دن اور ایک رات قیام کیا۔خالو کا پریوار دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے علاوہ ان کے بھانجے مظفر عرف جگن پر مشتمل تھا۔خالو کی بیٹی یعنی نسرین آپا کی شادی کوئی نو برس قبل ہو گئی تھی اور وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ حیدر آباد میں مقیم تھی جبکہ جگن اپنے ماں باپ کے ایک کار حادثے میں مارے جانے کے بعد خالو کے کنبے کا اٹوٹ حصہ بن چکا تھا۔خالو نے اپنی مرحومہ بہن کی نشانی سمجھ کر بیٹوں کی طرح ہی اس کی کفالت کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی تھی۔وہ گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور گھر کے سارے چھوٹے بڑے کام میں ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔

امّی اور خالہ جان کے انتقال کے بعد خالو ہی پرانے وقتوں کے ہمارے یہاں واحد نمائندہ تھے۔خالو کا فون پر بار ہا یہ اصرار رہتا کہ اس سے قبل کہ ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں میں ایک بار ان کی زیارت کر لوں۔خالو چوراسی سال کے ہو چکے تھے مگر ماشاءاللہ صحت ہنوز اچھی تھی۔ابھی بھی چہرے یا جسم کے کسی حصے پر عمر رسیدگی کے ڈھیلے پن کے اثرات بہت نمایاں نہیں تھے۔ان کی دراز قامت، دودھیا رنگت، بڑی بڑی شربتی آنکھیں، کشادہ سینہ، اونچی پیشانی، چوڑی کلائیاں دیکھ کر یہی گمان ہوتا تھا کہ خالو اب بھی بے نظیر ہیں۔اب بھی ان کی شخصیت کو پختونی تمکنت، جلال اور تیج نے باکمال بنا رکھا ہے۔

خالو کے دونوں بیٹے حیدر بھیا اور احمد ان دنوں مسلسل لاک ڈاؤن کے سبب پریشان تھے۔اگرچہ خالو کے اباواجداد کا تعلق سرمایادار طبقے سے تھا۔مگر خالو کے عہد تک پہنچتے پہنچتے خاندان معاشی بحران کا زبردست شکار ہو چکا تھا۔باپ دادا کی پرانی حویلی اب کھنڈر بن چکی تھی۔خالو ایک عرصے تک پرائیوٹ ٹرانسپورٹ کمپنی میں منشی کا کام کیا کرتے تھے مگر اب سبکدوش تھے۔حیدر بھیا کا این ایچ۔۲ پر ایک ڈھابہ ہوا کرتا تھا جو ان دنوں ویران تھا۔احمد اب بھی بے روزگار تھا۔جگن کو میں نے برسوں بعد دیکھا تھا۔آج وہ ایک کشیدہ قامت اور سڈول بدن والا خوبرو نوجوان تھا۔اس کے گندمی رنگ کے تندرست جسم پر بالوں کا ایک جنگل سا اُگ آیا تھا۔شاید یہی وجہ تھی کہ اپنی قمیض کے اوپری بٹن وہ کھلے رکھتا تھا تا کہ مردانی کشش پوری طرح سے نمایاں رہے۔میں نے سنا تھا کہ اسے فلمیں دیکھنے کا بڑا شوق تھا اس سے متعلق کجروی کی اور بھی خبریں روز ہی

آرہی تھیں اور اسے سگریٹ نوشی کی بھی لت پڑ گئی تھی۔ یہی اسباب تھے کہ خالو اس کے رنگ ڈھنگ سے قطعی خوش نہ تھے۔

اکتوبر کی شام تھی۔ ہم بوسیدہ حویلی کے درمیان میدان نما صحن میں یکجا تھے۔ خالو، حیدر بھیّا، ان کی بیگم یعنی مدحت بھابھی، ان کے اور میرے ننھے منے، میں اور میری نصف بہتر عالیہ بیٹھے پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ وہاں احمد موجود نہ تھا۔ احمد اور میری عمروں میں کوئی خاص تفاوت نہ ہونے کے سبب ہم بھائی ہونے کے علاوہ ایک اچھے دوست بھی تھے۔ احمد بچپن سے ہی وجیہ تھا۔ اس کے ہونٹ کم وبیش پتلے تھے اور آنکھیں روشن تھیں۔ لمبے بال اسے اچھے لگتے تھے۔ اس کی انگلیاں مخروطی تھیں۔ طبیعت میں شرافت، نفاست اور نزاکت کے عناصر شامل تھے۔ وہ کم گو اور بڑا شرمیلے سبھاؤ کا لڑکا تھا۔ گذشتہ سال احمد کی شادی خالو نے اسکی مرضی کے خلاف بہت دھوم دھام سے کروائی تھی۔ ماضی میں، میں نے بھی اس سے شادی کے بارے میں دریافت کیا تو، یہی جواب ملا کہ "شادی کر کے کیا کروں گا؟" اسے واقعی لڑکیوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

احمد کو وہاں نہ پا کر میں نے خالو سے اس کے بارے میں استفسار کیا مگر خالو خاموش رہے۔ جب تھوڑی دیر بعد احمد کی بیوی شگوفہ جو امید سے تھی وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تو خالو نے مہر سکوت توڑی۔

"وہ بے راہ روی کا شکار ہو گیا ہے۔ ہم پریشان ہیں بیٹا۔"

احمد جیسے حد درجہ شریف الطبع لڑکے کے لئے "بے راہ روی" کا شکار ہونا میری فہم سے بالاتر تھا۔ خالو کچھ توقف کے بعد بولے۔ " کم ظرف نے پختونوں کی عزت خاک میں ملا دی" خالو نے اس بار حلق میں پھنسے آنسوؤں کے چند قطروں کو کھنکھار کے صاف کیا۔ "بیٹا ہمارا شجرۂ حسب ونسب سرحدی گاندھی سے جا ملتا ہے۔ آج ایسے حالات میں بھی خالص پٹھانی خون رگوں میں زندہ ہے۔ مگر اس کمبخت نے تو۔۔۔"

خالو کے جملے ادھورے رہے۔ میں نے بھی زخم کو کریدنا نامناسب سمجھا۔

بعد طعام صدر دروازے کی جانب سے ایک سائے نے بڑی نرمی سے حویلی کے اندرونی احاطے میں قدم رکھا۔ آنگن میں گرد آلود بلب کی مضمحل روشنی میں سرخ ریشمی ساڑی میں ملبوس ایک خاتون کا پیکر متحرک نظر آیا۔ کاندھوں تک تراشیدہ بال مگر دونوں سرخ گالوں پر دو لٹیں خمیدہ ہو کر جھول رہی تھیں۔ پلکوں کے اوپر خمیدہ ابروں کو تراش خراش کر باریک بنالیا گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر گہرے سرخ لپ اسٹک کے شعلے دہک رہے تھے۔ اور آنکھوں میں کاجل کی سیاہی تنی ہوئی تھی۔ چہرے سے گھونگھٹ کے سرکتے ہی پیشانی پر ایک جھومر اور لمبی ناک میں پیوست بڑا سا نتھ عیاں ہوا۔ متحرک پیکر کے ہر قدم سے چوڑیوں کی کھنک اور پائل کی جھنک فضا میں ایک گنگناہٹ بن کر ابھرنے لگی۔

اللہ کیا حالت بنا رکھی تھی اس نے؟ خراماں خراماں میری جانب بڑھتے ہی اس نے جنبش چشم سے مجھے سلام کیا۔ کچھ ہی دیر بعد، میں احمد کے کمرے میں تھا۔ ایک کونے میں شگوفہ خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خلا تھا۔ میں نے احمد کو اس کے نئے اوتار سے متعلق کریدنا شروع کیا۔ بڑی مشکل سے وہ کچھ کہنے پر راضی ہوا۔

"حالات بہت ناساز گار تھے، شیرو بھائی! ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے میرے پاس دو ہی آپشن تھے۔ یا تو خودکشی کرتا یا زندگی رہتے اپنے دوہرے کردار سے نجات حاصل کرتا"۔ وہ پیاز کے چھلکے کی طرح اترتا ہی چلا گیا۔ "ان دنوں میری آمدورفت خواجہ سراؤں کے محلے میں بڑھ چکی تھی۔ وہاں سے مسلسل آفر آ رہا تھا۔ ادھر میرے جسم میں پھنسی نسوانیت مسلسل بیدار ہو رہی تھی۔ جسم اور آتما کا سمجھوتہ جواب دینے لگا تھا۔ دونوں کے تقاضے ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ میرے پاس اب کھونے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ نام نہاد، بدنامی پہلے بھی تھی مگر سرگوشیوں میں۔ انجام کار میں نے تلخ حقیقت قبول کر لی"۔

احمد کی باتوں نے بچپن سے پل رہے میرے اندر کے تمام وسوسوں کو ایک منزل عطا کر دی۔ میں نے گو گل میں تحقیق بھی کی تھی۔ احمد کم از کم میری نظر میں مذاق نہیں ایک مریض تھا۔ اس کے درد کا علاج ممکن تھا۔ ہمیں اپنے زاویہ نگاہ کو بدلنے کی ضرورت تھی۔ گفتگو کے خاتمے پر میں جب کمرے سے باہر صحن میں آیا تو آنگن میں کھڑے برگد کے پتوں اور شاخوں سے پورن ماسی کا چاند کسی کٹی پتنگ کی طرح الجھا ہوا تھا۔ رات بھر چارپائی پر پڑا میں سورج کے نیند سے بیدار ہونے کا انتظار کرنے لگا اور پو پھٹتے ہی خالو سے اجازت طلب کی اور عازم کلکتہ ہوا۔

بیگم اور بچوں کے ساتھ پہاڑ پور سے رفیع گنج تک کچی پکی سڑکوں کا سفر بذریعہ بس طئے کیا۔ پھر ہم ٹرین میں سوار ہو گئے۔ میرے تمام تر خیالات ایک اہم نقطے پر سمٹ رہے تھے۔ اس پورے ڈرامے کا ایک اہم کردار شگوفہ تھی۔ وہ بیچاری اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا سلیقے سے کاٹ رہی تھی۔ مجھے افسوس تھا!

آخرش! بیگم سے دورانِ سفر میں نے اسی نقطے کو چھیڑا۔ حسب توقع عالیہ تمام تر حقائق سے آشنا تھیں۔ انہیں مدحت بھابھی نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ عالیہ پہلے تو میرے سوال پر باہر پیچھے بھاگتے مناظر کو خاموشی سے کچھ دیر تک دیکھتی رہیں۔ پھر اپنے لبوں پر ایک تیکھی مسکراہٹ لئے آہستگی سے بولیں "شگوفہ خوش ہے"۔

"خوش ہے؟" میرے دماغ میں ایک بم پھٹا۔ اس سے قبل کہ میں کچھ اور کہتا عالیہ نے اپنی ادھوری بات پوری کی۔

"ججن میاں اس کا ہر طرح سے خیال رکھ رہے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے۔۔۔ کہ احمد میاں کو سب پتہ ہے"۔

"تو اسکا مطلب احمد نے خود کو آزاد کرنے سے پہلے شگوفہ کو بھی مکمل آزادی دے دی تھی؟"۔

ٹرین کے باہر سورج کی کرنیں تیکھے قہقہے لگا رہی تھیں کہ اچانک ڈبے پٹریاں بدلنے لگے اور پھر گھن گرج کے ساتھ ٹرین ایک طویل سیاہ غار میں گھس پڑی اور ہم روشنی کی مسکراہٹ کا انتظار کرنے لگے۔

خالد

رئیس احمد کمار (کشمیر)

موبائل : 9622904728

ریاض آٹھویں درجے کا ہی طالب علم تھا جب وہ باپ کے سائے سے محروم ہوگیا۔ دس سال تک بستر مرگ پر رہنے اور لاکھوں روپیہ اس کے علاج ومعالجہ پر خرچ کرنے کے باوجود بھی اس کا باپ زندگی کی جنگ ہار گیا۔ ریاض کی والدہ حسینہ کو بے شمار تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اور خطرناک مصیبتیں جھیلنی پڑیں کیونکہ شوہر کی بیماری نے اس کا کمر ہی توڑ ڈالا تھا۔ گھر کا واحد کمانے والا ہی جب ایک دہائی تک بستر مرگ پر رہا ہو تو یہ بات خود ہی سمجھ میں آتی ہے کہ کس طرح کے مشکلات ومصائب کا سامنا حسینہ نے کیا ہوگا۔۔۔۔

اپنی آمدنی سے جو بچت حاصل ہوئی تھی اور بیشتر حصہ اپنی جائداد کا بیچ کر بھی حسینہ کا شوہر جان لیوا بیماری سے چھٹکارا نہیں پا سکا۔ اس کے مرنے کے بعد ہی گھر کی اقتصادی حالات نہ صرف کمزور ہوئی بلکہ کمر توڑ مہنگائی نے ان کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ حسینہ کو خود سے زیادہ اپنے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی فکر تھی۔ ان کی کفالت کرنا، تعلیم وتربیت کا انتظام وغیرہ کرنا اب حسینہ کے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن سا بن گیا تھا۔ رشتے داروں اور ہمسایوں نے بھی کبھی حسینہ کی کوئی مدد نہ کی، یہاں تک کہ انہوں نے کبھی اس کی خبر گیری بھی نہ کی بلکہ اسے اللہ کے رحم وکرم پر ہی چھوڑا۔۔۔۔

بچوں کو پالنا اور ان کی بہتر تعلیم وتربیت کرنا حسینہ کا خواب تھا۔ اس لیے اس عظیم خواب کو حقیقت میں بدلنے کی خاطر اس نے ایک بہادر مرد کی طرح ان کی کفالت کی۔ صبح پہلے وہ بچوں کو اسکول کے لیے روانہ کرتی تھی۔ بعد میں کچھ لوگوں کے گھر جاتی تھی جہاں وہ ان کا کام کرتی تھی۔ مہینے بعد اسے وہاں اچھی تنخواہ ملتی تھی۔ اس طرح وہ اپنے عیال کی کفالت کرتی تھی۔ چار بجے پہلے پہلے وہ واپس اپنے گھر پہنچتی تھی۔ بچوں کے لیے چائے وغیرہ تیار کرنا اور گھر کا باقی پڑا کام ختم کرتے کرتے رات ہو جاتی تھی۔ اس طرح سے حسینہ کے دن گزرتے تھے۔۔۔۔۔

وقت گزرتا گیا۔ حسینہ کے بچے بھی بڑے ہوتے گئے۔ اس کا بڑا بیٹا خالد بارھویں جماعت میں اچھے نمبرات لے کر اس سال کامیاب ہوا تھا اور وہ ڈاکٹری کرنے کے لیے مسابقتی امتحان کی تیاری میں مصروف عمل تھا۔ اس کی ماں نے اسے اور دو اور بچوں کو کبھی کسی قسم کی کمی محسوس ہونے نہیں دی۔ بک بائنڈنگ کارخانے میں بھی

اس نے کام کیا تا کہ بچوں کے تعلیمی اخراجات اور باقی ضرورتیں پورا کر سکے۔۔۔۔۔

نیٹ امتحان میں اچھی کارکردگی دکھا کر خالد نے سرکاری میڈیکل کالج میں سیٹ حاصل کی۔ اب اس کے لیے ڈاکٹر بنا طے تھا لیکن اب اگر کوئی چیز رکاوٹ ڈال سکتی تھی وہ پیسوں کی کمی تھی۔ اس کی ماں کا خواب پورا ہوا تھا اس لیے اس نے اپنے بیٹے خالد کو کبھی پیسوں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ جہاں بھی اسے کام ملتا تھا وہ موقعے کو غنیمت جان کر اور بچوں کے مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے کہیں بھی جاتی تھی۔ پانچ سال بعد ایم بی بی ایس کی ڈگری مکمل کرنے کے بعد ہی خالد کی تعیناتی قصبے کے سرکاری ہسپتال میں ہوئی۔ اپنی قابلیت اور ذہانت کی بدولت وہ ڈگری مکمل کرنے کے فورا" بعد ہی تعینات ہوا۔ اب وہ قصبے کا کیا پوری ریاست کا بہترین معالج بن گیا۔ گھر کی حالت ایک دم تبدیل ہوگئی۔ اس کی بہن اور اس کا بھائی اب شہر کے سب سے بڑے ادارے میں تعلیم حاصل کررہے تھے۔ اس کی ماں جو پہلے لوگوں کے گھروں میں بطور نوکرانی کام کرتی تھی اور جس نے بک بائنڈنگ کارخانے میں بھی کام کیا تھا اب ایک اچھی زندگی گزار رہی تھی۔ پھٹے کپڑوں میں ملبوس اور ماضی میں کسمپرسی کی زندگی گزارنے والی خالد کی ماں اب دوسروں کی مدد میں پیش پیش رہتی تھی۔۔۔۔۔

ڈاکٹر خالد نے فیصلہ کیا کہ ڈیوٹی سے واپس لوٹنے کے بعد شام کو وہ ہر دن لوگوں کا مفت بغیر کسی فیس کے علاج و معالجہ کریں گے۔ اس نے اپنے مکان کے سامنے ہی اپنا کلینک بنوایا تھا۔ اپنی غریبی اور تنگدستی کے دن ڈاکٹر خالد کو برابر یاد تھے اسی لیے اس نے خدمت خلق کے بطور لوگوں کا مفت علاج کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ شام کو ہسپتال سے واپس آتے ہی ڈاکٹر خالد اپنے کلینک کو جاتے تھے۔ آس پاس کے رہنے والے لوگ اقتصادی لحاظ سے کمزور ہی تھے اس لیے بھی ڈاکٹر صاحب نے مناسب سمجھا تھا کہ ان کا مفت علاج کروں۔ پورا ایک مہینہ ہوا تھا اور ڈاکٹر خالد کے پاس کوئی بیمار ہی نہیں آیا ان کے کلینک پر۔ ڈاکٹر صاحب صبح نو بجے تک اور شام کو پانچ سے سات بجے تک لوگوں کی خدمت کے لیے اپنے کلینک پر حاضر رہتے تھے لیکن پورے ایک مہینے میں ایک بھی بیمار اپنا علاج کروانے ڈاکٹر صاحب کے پاس نہیں آیا۔ ڈاکٹر صاحب، اس کی ماں اور بہن شش و پنج میں تھے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ لوگ اپنا مفت علاج کروانے بھی ان کے پاس نہیں آتے۔۔۔۔

ان کے پڑوس میں ایک خاتون کی موت واقع ہوئی تھی اور اس کی ماں بھی تعزیت کرنے وہاں گئی تھی۔ جب اس نے ایک عورت سے پوچھا کہ لوگ کیوں نہیں اپنا علاج کروانے ڈاکٹر صاحب کے پاس آتے ہیں بلکہ شہر جا کر اپنا پیسہ ضائع کرتے ہیں تو واپس جواب ملتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔" آپ درست فرما رہی ہے لیکن کیا

آپ کو پتہ ہے کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ جو ڈاکٹر مفت میں علاج کرے گا وہ کونسا ڈاکٹر ہوگا اور جو دوائی مفت میں وہاں سے ملے گی اسے بھی بیمار ٹھیک کیسے ہوگا"۔۔۔۔۔۔۔

ایک سال بعد ڈاکٹر خالد نے شادی بھی شہر کے ایک رئیس آدمی کی بیٹی سے کی۔ وہ بھی ایک ڈاکٹر ہی تھی۔ شادی کے ایک مہینے بعد ہی بیوی نے ڈاکٹر خالد کو شہر میں ہی مکان بنانے پر مجبور کیا کیونکہ گاؤں کا رہن سہن اور اس کی ماں اور بہن کے سادہ مزاج سے بھی وہ تنگ آئی تھی۔ اس لیے وہ ہر دن کسی نہ کسی بہانے پر اسے شہر میں ہی رہنے کے لیے کہتی تھی۔ ایک دو مہینے تک اس نے بات ٹال دی تھی لیکن جب وہ پوری طرح بے بس نظر آیا تو آخر اس نے شہر میں ہی مکان خریدا۔ بیوی اور ایک بیٹے کے ساتھ شہر میں رہتے ہوئے وہ کبھی کبھار ہی اپنے آبائی گاؤں کا رخ کرتا تھا۔ اس کی ماں، بہن اور اس کا بھائی چھٹی کے دن اس انتظار میں رہتے تھے کہ ڈاکٹر خالد ضرور ان کے پاس آئیں گے لیکن وہ کبھی ایک مہینے تو کبھی دو تین مہینے بعد ہی ان کی خبر گیری کرتا تھا۔۔۔۔۔۔

ایک دن ڈاکٹر خالد اپنے بیٹے اور بیوی کو کسی صحت افزاء مقام کی سیر پر لے جا رہا تھا تو رستے میں ہی فون کی گھنٹی بج گئی۔۔۔۔ " ہیلو ڈاکٹر صاحب! میں منیر آپ کے آبائی گاؤں میں آپ کا پڑوسی بات کر رہا ہوں۔۔۔جی فرمائے کیا بات ہے؟ ڈاکٹر صاحب آپ کی والدہ کا انتقال صبح سویرے ہی ہوا ہے لہذا آپ جلدی کیجیے تا کہ ماں کے جنازے میں شرکت کر سکو گے"۔۔۔۔

ڈاکٹر خالد کو سمجھ ہی نہیں آ رہا ہے کہ اب کیا کروں۔۔۔۔۔۔۔

نظمیں ______________ قاضی انصار

موبائل : 9340741985

تنہائی

بھولی بسری
داستانِ زندگی
یاد
پھر آنے لگی
پھر ادھوری
اس
کتاب زیست کے
سارے ورق
روشن ہوئے
اور
میں تنہا
مجھے تنہائی میں
چودہ طبق روشن ہوئے

گریز

مرتبہ
ملے کیسے
سر کٹا نہیں سکتا
سر نہیں
کٹا سکتا
انگلیاں
کٹا لیتا
جانتا ہوں
میں
یہ بھی
اور یہ عمل سرزد
مجھ سے ہو نہیں سکتا

شکستہ آرزو

کتنے
پیار کے نغمے
ہم نے
گنگنائے تھے
کتنے گیت گائے تھے
کتنے
خواب دیکھے تھے
تم کو یاد تو ہوگا
تیرہ راہگزاروں میں
ہم نے
دل جلائے تھے
اور پھر

اچانک تم

ایک روز چپکے سے

مجھ کو چھوڑ کر تنہا

مجھ کو چھوڑ جاتی ہو

مجھ کو بھول جاتی ہو

کاش

ابھی تو دور

بہت

دور تک اندھیرا ہے

ابھی تو رات

سیاہ

رات کا بسیرا ہے

دل و دماغ پہ

جیسے

جمود طاری ہے

خیال

ذہن میں

کوئی تو ایسا آ جائے

قدم قدم پہ

زمانے میں نور پھیلائیں

قلم کی نوک سے

فکر و شعور پھیلائیں

محرومی

کسی کسی

قدم

کامیابی چومے ہے

یہ ایک سوال

مری فکر پر مسلط ہے

کسی کسی کے

مگر

ہاتھ آئے محرومی

یہ ایک فرق

پرانا بہت پرانا ہے

نہ میں نے

چاند ستاروں کی

آرزو کی ہے

نہ میں نے دولت و ثروت کی جستجو کی ہے

بس ایک لفظ محبت کا

آسرا چاہا

بضد ہوں میں بھی

ادھر

بارہائے محرومی

تمام عمر مجھے آزمائے محرومی

پسِ سوال

جب دماغ ہیک کر لئے جائیں

تو سوچنا

ہم دھیرے دھیرے روبوٹ میں بدلتے جا رہے ہیں

پھراگتے سورج کی گلابی مائل اوڑھنی پر

جھمکتی سنہری کرنیں

ہواؤں کا کانپتا سرسراتا لمس

چٹانوں کے درمیاں

اٹکھیلیاں کرتی الھڑ آبشاری موجیں

پہاڑوں کے شانوں پر سر ٹکائے

خمار آلود جنگلوں کے سراپے

ہری دوب پہ ٹھہرے شبنمی قطرے

بارشوں کی تیز بوچھاروں سے سیراب

سبز مسکان بھرے لبادے میں لپٹی زمیں

سرمئی شام کی آنکھوں میں

شفق کی خواب آلود سرخی

چاند کا روپہلا غبار

رات کی بھید بھری تاریکی

کیا کلک کرتے ہی کھل پائے گی؟

اور پھر بدن کائنات میں روحوں کا دھمال؟

اگلی دنیا جب کبھی کسی پلیٹ پر وجود میں آئے

تو شاید ہم نئے اساطیری حوالوں میں نظر آئیں

یا پھر یہ دھرتی بلیک ہول کی آغوش میں سما جائے

تب تک آؤ

بانسری پر لب رکھ کر

مخملی بوسوں کی دھن بجائیں۔۔۔!

ہم زمیں زاد ہیں۔۔۔

ہم زمیں زاد ہیں

سانس بھر

جان و تن روح کو

اپنی مٹی سے جوڑے رہے

اپنے دریا پہاڑوں کی سیاحی کی

جنگلوں کی ہواؤں میں گھوما کئے

بار آور ہوئے

یا کبھی نذرِ فتنہ ہوئے

ہم کھڑے ہیں

درختوں کی مانند

اپنی جڑوں کو زمیں میں گڑائے ہوئے

اپنی دھرتی کو بازو میں تھامے ہوئے

چاند تاروں کی

سورج کی

ہر رہگزر جانچ لی

پرندوں کے ہمراہ پرواز کی
تتلیوں سنگ کرتے ہوئے شوخیاں
شبنمی پھول
موسم کے رنگوں کو اپنا لبادہ کیا
سوچ کو ہم نے جگنو ستارا کیا
اور اندھیری سیاہ رات میں
روح کو ماہتابی شرارہ کیا
ہم زمیں زاد ہیں
مر گئے
تو اسی خاک کو اوڑھ کر
سو گئے
اور تم
مشت بھر راکھ
دریا کی لہروں پہ بہتے ہوئے
توڑ کر رابطے ضابطے
اپنی دھرتی سے
رشتوں کے سب سلسلے
کس سمندر کی گہرائی میں جا گرے
جانتے تک نہیں
اور دعوہ تمہارا
کہ اصلاً
تم ہی بس یہاں پر زمیں زاد ہو۔۔۔۔!

اجنبی لمحوں کے درمیاں۔۔۔

یہ کن زمانوں کے ابجد ہوز
نصاب بن کر تنے کھڑے ہیں
ہمارے پرکھوں کے تو نہیں ہیں
حمورابی اور گلگمیشی
صفحے کھنگالے
کہیں نہیں ہیں
لغت بدلتا ہے کون پھر یہ
ہے اذن کس کا
کہ سب بدل دو
ہوائیں موسم پہاڑ دریا
ہے نیلی چنری سے سر کو ڈھانپے یہ سبز دھرتی
گلوں کے رخ پر تھرکتی تتلی
سریلی تانیں بھری بنسریا
یہ رنگ خوشبو
وہ شیریں لہجوں کی خنک شبنم
بدلتے جاتے ہیں
زندگی کے ہر اک نظارے
ہمارے دامن میں بس خسارے
یہ کن زمانوں میں آ گئے ہم۔۔۔!

نظمیں ـــــــــــــــــــ پرویز شہریار

موبائل : 9910782964

مرزا غالب: اُستادِ ریختہ

وہ دُرِ یتیم
وہ دُرِ ناسفتہ
کہ قدرت نے جسے
اپنے دستِ خاص سے پروان چڑھایا
امواجِ حوادث کے تھپیڑوں نے جسے ہر دم
متحرک اور سرگرم رہنا سکھایا
سمندر کی گہرائیوں میں جو غرقِ آب رہا برسوں
وہ سچا موتی جسے
صدف نے اپنی آغوش میں سنبھالا برسوں
وہ جب ساحل پر سمندر کی چٹانوں سے ٹکرایا
نامساعد حالات نے جب، اُسے خوب تراشا تراشایا
وہ دُرِ یتیم
کہ نہ تھا جس کے سر پر
چچا اور باپ کا سایہ
وہ اپنے آبا و اداد کی املاک پر
پلتا رہا برسوں
وہ سنگِ ناتراشیدہ
جو راہِ آب جو میں رُلتا رہا برسوں
تب جا کے کہیں منصۂ شہود پر وہ آیا

شہرت کی سونامی نے اسے بالآخر
بلند و بالا مقام پر اُچھالا
فارسی دانی پر جسے اپنی
بڑا ناز ہوا کرتا تھا کبھی
وہ تصحیح کار بنا بادشاہ کا، پھر نے لگا اِتراتا
قلعہ معلّی تک گیا
دیوانِ خاص کی مسند بھی سنبھالا
غزل اور قصائد میں بڑا نام کمایا
خلعت و خطاب و اسناد و انعام بھی پایا
یوں رفتہ رفتہ، وہ دُرِ ناسفتہ
وہ بختِ محسن کش، وہ طالع خفتہ

بن گیا بالآخر
رشکِ فارسی سے، اُستادِ ریختہ
ہاں! وہی اُستادِ ریختہ
جس کی بابت زبانِ خلق رہتی ہے
یوں ہر دم رطب اللسان
یارب!
دنیا میں سخنور تو ہیں بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں کچھ اور

کالی رات کے نفوس

یہ ایک ایسی کالی رات ہے
جس کی صبح نہیں
ہم کسی ایسے اساطیری سرنگ سے گزر رہے ہیں
جہاں دوٗر دوٗر تک روشنی آتی نہیں نظر
ہر طرف گھپ اندھیرا ہے
ہم ٹرین کی بوگیوں میں ڈرے سہمے بیٹھے ہوئے
ہیں
روشنی کی کوئی کرن باہر نہ جانے پائے
ہلکی سی روشنی کی چمک پر
اندھیرے کا کوئی غیر مرئی ہاتھ
اچانک آگے بڑھ کر ہم میں سے کسی کو بھی باہر کھینچ
لیتا ہے
اور وہ گھپ اندھیرے کا،
نیتانت اندھکار کا حصہ بن جاتا ہے
ہمارے کئی ساتھی
ادیب، شاعر اور صحافی
اس کا لقمہ بن چکے ہیں،
راہیِ ملکِ عدم ہو چکے ہیں
جو ایک بار
اس کے چنگل میں پھنس گیا
وہ پھر کبھی لوٹ کر واپس نہیں آیا
اندھیرا طوفانی رفتار سے ہماری طرف بڑھ رہا ہے
اس کی آسیب نما سونامی لہریں
اپنی گذشتہ لہروں سے زیادہ تیز تر ہوتی جا رہی ہیں
ہم جو کبھی آزاد پنچھی ہوا کرتے تھے
ہوا سے باتیں کیا کرتے تھے
اپنے اپنے قرنطینہ میں بند
گھر گویا چڑیوں کا پنجرہ ہو گیا ہے
اور ہم وہاں اسیر شدہ
سہمے ہوئے خوف کے سائے میں
اپنی باری کے انتظار میں
گھبرائے ہوئے
ہجوم سے کترائے ہوئے
نیم جاں و ناتواں
بیٹھے اپنوں کی موت کا نوحہ---- پڑھتے پڑھتے
تھک گئے ہیں
یہ اندھیرا، آکسیجن جس کی خوراک ہے
وہ انسانوں کے جسم سے
بادِ حیات کا ایک ایک بلبلہ نچوڑ لیتا ہے
آن کے آن میں آدمی کو
مردہ بنا کے چھوڑ دیتا ہے

صبح روشنی کی طلب میں نکلا، جیتا جاگتا انسان
شام ہوتے ہوتے
زندگی سے روٹھ جاتا ہے
زندگی سے منھ موڑ لیتا ہے
ہم ایک نیتانت اندھکار سے گزر رہے ہیں
یہ ایسی طویل رات ہے کہ ختم ہونے کا نام تک نہیں لے رہی ہے
ہم گھپ اندھیرے کا ایک ایک کر کے حصہ بنتے جا رہے ہیں
ہم کہ بے بس و لاچار
ہمارے پاس اس سے مقابلہ کرنے کے لیے
نہیں ہے کوئی ہتھیار
اقتدار پر قابض شاطر اور مکار
ہم معصوم عوام سے کر رہے ہیں بیوپار
سیاست
تجارت
مملکت
سبھی ہو گئیں یکلخت، رفتہ از کار
سبھی بغلیں جھانک رہی ہیں
ہم سب کسی ایسے اساطیری سرنگ سے گزر رہے ہیں
جہاں دوٗر دوٗر تک روشنی آتی نہیں نظر
یہ ایک ایسی کالی رات ہے / جس کی صبح نہیں

ارتعاش کی آواز

عشق ہے،
دو وجود کے یکجا ہونے کی
خواہش کا نام
دو وجود روحانی / یا پھر
دو وجود جسمانی
دوسرے کو خود میں سمانے کا نام
ذرّے کا بے پناہ وسعت میں
کھو جانے کا نام / عشق ہے۔
عشق ہے بندے کا معبود سے کلام
معبود نے ہی عبد میں یہ جذبہ
ودیعت کی ہے / انسان نے جو انسان سے
محبت کی ہے / عشقِ ارضی ہے،
زینۂ اوّل / منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے
عشق ہی سے دُنیا تابندہ ہے
عشق ہی سے ہر خواب / درخشندہ ہے
حتیٰ کہ مالکِ کونین کا / افسانہ بھی زندہ ہے
عشق دو وجودوں کو ملاتا ہے
عشق جسے ہو جائے / وہی خدا کو پاتا ہے
عشق بھی / عاشق بھی / معشوق بھی
خدا ہے!!
ذرہ ذرّہ ہے اسی سے وابستہ

ہر ذرّے میں ہے وہی پیوستہ
ہمہ اوست!
ہمہ اوست!!
محبوب،/ خود سپردگی چاہتا ہے
حبیب سے بندگی چاہتا ہے/ بندگی،
صوفی کا استغراق ہے
معرفت کا معراج ہے،/ تو
مسبب ِکائنات ہے عشق
اصل مقصدِ حیات ہے عشق
صورِ اسرافیل،/ بالِ جبرئیل،/ ضربِ کلیم،
عشق ہے یقینِ خلیل
عشق انساں کو ہمراز بنا لیتا ہے
عشق انساں کو ممتاز بنا دیتا ہے
باہم راز و نیاز
عالی مراتب سے سرفراز
جب دو وجود آپس میں ملتے ہیں
فلک پہ فرشتوں کے پر جلتے ہیں
الغرض،
عشق جسمانی محض ایک ساز ہے
عشق روحانی اس ساز کے ارتعاش سے
اُٹھتی ہوئی آواز ہے!!
نظمیں: ایس ایم حسینی/ شاہراہ۔۔۔!

وہ سارے فسانے جو ترے نام لکھے
وہ سارے سیاہی سے لبریز خط
جن میں تیرے ہونے کا رمز تھا
وہ سارے لفظ جو مرے لبوں سے
آزاد ہو کر تیرا پیرہن بنے
وہ ساری باتیں وہ ساری یادیں
جن سے تیرے ہونے کا احساس تھا
میرے ماتھے پہ اک بدنما داغ ہیں
بس اب ایک عذاب ہیں
جو عالمِ اندرونِ ذات
کنڈلی مارے ہوئے
مجھ کو ڈستے ہوئے
اے جاں گیر، جاں گسل
جاتے جاتے سنو کہ
الفت میں لپٹی، حیرت و حسرت
کی داستاں بکھر گئی ہے
اور محبت دفن ہو گئی ہے
ان میسجز کے ملبہ میں جن کا لہجہ
تلخی بھرا اور دھمکی آمیز تھا
شاہراہِ محبت پہ چلتے ہوئے
میں کب خود سے بچھڑ کر
تم بن ادھورا ہو گیا ہوتا گیا

نظمیں ــــــــــــــــــــ پرویز شہریار

سنو اے بخت کے لکھے ہوئے
اب سے میرے لکھے ہوئے
ہر ایک قصے اور کہانی میں
تم نہیں ہو گے
سنو!
مجھ کو لوٹا دو اب میری
وہ اداس شامیں
جس میں تم نہ ہو، تمہارا رمز نہ ہو
جس میں تم بن، مَیں جیا کروں، اکیلے
اور تن تنہا کسی ہمسفر کی تلاش میں
اک ایسا ہمسفر جو منزل سے نہ ہو بے خبر
جہاں ترا آسرا یکدم نہ ہو
اور اس آستاں میں
ہمسفر کی تلاش پوری ہو
جس کا ہونا ہے ممکن نہیں
کہ اس کا ہونا
میرے نہ ہونے سے وابستہ ہے
زندگی کے سفر کا اک آخری نکتہ ہے
کہ منزل موت ہے، اور موت سکتہ ہے۔
آخری کش۔۔۔!
چائے کی خالی پیالی میں

شبِ ہجر کی داستاں بھر کر
میں اکثر گم سم بیٹھا رہتا ہوں
پھر یوں ہوتا ہے کہ
خشک ہونٹوں کے نرم گوشوں پر
ایک مسکراہٹ جنم لیتی ہے اور
پیڑ کی ٹہنیوں سے ٹوٹ کر
گرتا ہوا حسن، زمیں پر
پھیلتی خزاں کی اداسی
خشک پتوں کی صورت میں
مجھے بے چین کرتی ہے
جیسے سگریٹ کا ہو آخری کش!
اور یہ اداسی اداسی نہیں
اس کے ہاتھوں سے بنی
ایک آخری پینٹنگ ہو!
دکھ۔۔۔!
جب بھی تم مجھ سے دور ہوتے ہو
سانسیں تھمنے لگتی ہیں
ایک اندھیرا چھا جاتا ہے چاروں اُور
تاریکی مجھے نگلنے لگتی ہے
تمہارے روٹھنے کا بس اتنا دکھ ہے
کہ تمہارے جانے سے
میری نظمیں سسکنے لگتی ہیں۔

نظمیں ______ احمد نثار

موبائل : 8409242211

سیم رنگ دھواں

اٹھا ہے شور

ہوا آج

رقص کرتی ہوئی

فصیلِ شہر میں ہر سو نقب لگائے گی

یہاں فضاؤں میں اک زہر گھل رہا ہے ہنوز

خلاء میں پھیلے ہیں

چاروں طرف جو طیارے

اور اک مقام کو ایسے تباہ کر کے تمام

لگا گئے ہیں یہ لاشوں کی ڈھیر چاروں طرف

مریں گے دیکھنا یہ عنکبوت بھی سارے

اور اس جہان کو جلتے الاؤ کی صورت

کریں گے شعلہ فشاں

اور دھوئیں سے بھر دیں گے

خودی سے جنگ کا انجام حشر جیسا ہے

کوئی بتائے تو

میرے اجارہ داروں کو

کرو یقیں کہ جہنم بنے گی یہ دنیا

یہ سیم رنگ دھنواں جو اٹھاتے جاتے ہیں

یہی تو امن کی میت پہ مسکراتے ہیں

نیل گائیں اُودھم پھر مچانے لگیں

نسل روندی گئی

فصل روندی گئی

کھیت میں دھان کی بالیاں

شہر کی سُرخیاں

کھیل شب بھر چلا

خواب کی کونپلیں

آنکھ کی پُتلیاں

پھول کھلنے کو تھے

خاک میں مل گئے

ریزہ ریزہ ہوئے خواب سب

خواب کے رتجگوں

کا بھی موسم نہیں

خوف سے جھڑتے چڑیوں کے پر

سہمے کس بات پر چارہ گر

اب طنابیں لگائے کوئی تو نہیں

نیل گائیں اُودھم پھر مچانے لگیں

رباعیات ______ نور محمد یاس (بھوپال)

مصدر کسے کہتے ہیں کہاں کا مشتق
ہوتے ہی چلے جاتے ہیں الفاظ ادق
مشکل نہ بنے مٹی ہے اردو مٹ جائے
اب یاد ہے سب کو یہی آسان سبق

یادوں کے سحاب اوڑھ کے سو جاتا ہوں
سپنوں کے سراب اوڑھ کے سو جاتا ہوں
نیند آنے لگے جب مجھے پڑھتے پڑھتے
آنکھوں پہ کتاب اوڑھ کے سو جاتا ہوں

فرمان پڑھے جاتے ہیں ایوانوں میں
اور معرکے سر ہوتے ہیں میدانوں میں
تاریخ صلیبوں پہ لکھی جاتی ہے
پلتا ہے انقلاب زندانوں میں

جب صبح کی منزل پہ زمیں آئی تھی
جب بانگِ جرس میرے قریں آئی تھی
جب وقتِ سفر تھا سبھی جاگ اٹھے تھے
تب تک تو مجھے نیند نہیں آئی تھی

دنیا کے لئے میرے مسائل تو نہیں
میرے لئے دنیا کے وسائل تو نہیں
سجادہ نشیں ہوں خانقاہِ دل کا
مانا کہ فقیر ہوں میں، سائل تو نہیں؟

اک نیل پری مجھ سے لپٹ جاتی ہے
پلکوں تلے آنکھوں میں سمٹ جاتی ہے
آگے کا سناؤں میں تمہیں قصہ کیا
آگے تو مری نیند اچٹ جاتی ہے

تم کہتے ہو۔ کچھ عید کے بارے میں لکھوں
کیا حسن روایت ہے نظارے میں لکھوں
میں سوچ رہا ہوں کہ سن و سال کا غم
کیوں چاند کے اس تازہ شمارے میں لکھوں

آغاز ہوا بحث کا تکرار چلی
احساسِ رفاقت پہ بھی تلوار چلی
اک فرد جو ٹوٹا تو صفِ یار چلی
اک اینٹ کھسکنا تھی کہ دیوار چلی

سپنوں کا حسیں گاؤں نظر آئے تو
پریوں کی سواری مرے گھر آئے تو
یہ شب یہ سلگتی ہوئی بیخواب آنکھیں
سو جاؤں مجھے نیند مگر آئے تو

سادہ ایسی نہ بن کے آئی ہوتی
اجلے رنگوں میں چھن کے آئی ہوتی
اس چمپئی خوشبو کو جو آنا تھا ادھر
اچھے کپڑے پہن کے آئی ہوتی

پرچھائیں سے قد گیان میں آسکتا ہے
پیکر بھی تو اذہان میں آسکتا ہے
پردے ہی میں نکلا ہو کوئی گھر سے تو کیا
پردہ بھی تو پہچان میں آسکتا ہے

ہے سبز ابھی زندہ ہے پتہ پتہ
غم نامۂ آئندہ ہے پتہ پتہ
کس وقت اکھڑ جائے ہوا موسم کی
اس خوف سے لرزندہ ہے پتہ پتہ

کس پردۂ منظر پہ عیاں دیکھا تھا؟
کب جادۂ شہرت پہ رواں دیکھا تھا؟
میں گوشہ نشیں کون سی تم سے پہچان
اچھا تو مجھے تم نے کہاں دیکھا تھا

چہرہ مری آنکھوں میں کسی کا تو ہے
پردے پہ نہیں ہے پس پردہ تو ہے
پیکر ہے نہ سایہ ہے نہ آہٹ لیکن
خوشبو سی ہے گھر میں کوئی آیا تو ہے

آنکھیں مستِ خمار بھی ہوتی ہیں
راتیں پلکوں پہ بار بھی ہوتی ہیں
خوابوں سے ملتی ہے خبر بھی یعنی
نیندیں شب زندہ دار بھی ہوتی ہیں

تھا سائے میں کل تو مری دیوار کے چاند
اور آج عقب ہی میں ہے کہسار کے چاند
ہر بار وہ مکھڑا ہے یہاں دیر نمود
ہر رات نکلتا ہے گھڑی مار کے چاند

موبائل : 9535646077

جس خواب میں تاثیر ہُوا کرتی ہے — اُس کی ہی تو تعبیر ہُوا کرتی ہے
اک عُمر مچلتی ہے جو حسرت دل میں — دھرتی پہ وہ تعمیر ہُوا کرتی ہے

جُھلساتی ہے سینے کی جلن سورج کی — جلتی ہوئی ہر ایک کرن سورج کی
وہ موڑ لیا کرتا ہے آنکھیں اپنی — دن ڈھلتے ہی بڑھتی ہے تھکن سورج کی

خوابوں کے خزانے لئے آتی ہے رات — جینے کے بہانے لئے آتی ہے رات
ہر صبح مرے لب پہ سجانے کے لئے — کچھ تازہ ترانے لئے آتی ہے رات

بیتا ہُوا ہر لمحہ پرایا نکلا ! — گڈ مُڈ جو تھا سایوں میں وہ سایا نکلا
ہم اُس کو گرفتار نہیں کر پائے — کوشش سے بھی ہاتھ اپنے نہ آیا نکلا

صحرا کے بگولے ہیں ہمارے جذبے — آکاش کے جُھولے ہیں ہمارے جذبے
بڑھتے ہیں تو بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں — کچھ اس طرح پُھولے ہیں ہمارے جذبے

اک عُمر کھنگالا کئے ویرانے ہم ! — بدلے میں پُکارے گئے دیوانے ہم !
کھولی نہ زباں اپنی کسی کے آگے — لکھتے رہے خاموشی سے افسانے ہم

جو لوگ نگاہوں سے گرفتار ہوئے — احساسِ محبت کے خطاکار ہوئے
اَنجام ہے یہ عشق کی نادانی کا ! — ہر دَور میں رُسوا سرِ بازار ہوئے

میں چپ جو رہوں میرا ہُنر بولتا ہے!
اسلوب یا اندازِ نظر بولتا ہے !
قرطاس کی دھرتی پہ قلم چل چل کر
بے خوف و خطر شام و سحر بولتا ہے

طوفانِ حوادث میں پلے ہیں ہم لوگ
رفتار سے آندھی کی چلے ہیں ہم لوگ
آرام کا جینا نہیں راس آیا ہمیں
آفات کے سانچے میں ڈھلے ہیں ہم لوگ

ہر آفت و مُشکل سے نکلنا سیکھو!
ہر شکل میں ہر سانچے میں ڈھلنا سیکھو
جس راہ پہ چل کر نہیں ملتی منزل
اُس راہ کو فی الفور بدلنا سیکھو !

سُورج نے سمندر سے پیا ہے پانی
بادل وہ بنا جو بھی بچا ہے پانی
ہر یالی بچھائی ہے زمیں پر اس نے
برسات میں ڈھل کر جو گرا ہے پانی

شکوہ نہ شکایت ہے ہمیں اپنوں سے
بے لوث محبت ہے ہمیں اپنوں سے
وہ اُن سے بچھڑنے نہیں دیتی ہم کو
جو قدرتی نسبت ہے ہمیں اپنوں سے

تقریر سے اُونچا ہے عمل کا درجہ !
واعظ نے نہ سمجھا ہے عمل کا درجہ
الفاظ، معانی سے جلا پاتے ہیں
خود اپنا خُلاصہ ہے عمل کا درجہ

☆☆☆☆

غزلیں ________ قاضی انصار

موبائل : 9340741985

نثر میں زندہ رہے غزلوں میں پائندہ رہے
اس طرح انصار اپنا نام تا بندہ رہے
تم پلٹ کر دیکھتے ہو اپنے ماضی کی طرف
حال و مستقبل کے یارو ہم نمائندہ رہے
آج بھی دل میں ہے میرے دوستوں کا احترام
دوستی کا ان کو بھی احسا س آئندہ رہے
بھیڑ میں اس شہر کی گم ہو گیا ان کا وجود
شہر کھنڈوہ کے نہیں جو لوگ باشندہ رہے
کرر ہا ہوں میں چند لوگوں سے گریز
عمر بھر انصار ان کا ظرف شرمندہ رہے

☆

اک مرحلے سے آج گذرنا پڑا ہمیں
جینا پڑا کبھی، کبھی مرنا پڑا ہمیں
دینا تھا دے دیئے ہیں تمہیں چند مشورے
یہ کام بھی ضروری تھا کرنا پڑا ہمیں
اس شہر میں پہنچ کے خدا جانے کیا ہوا
اپنے ہی سائے سے یہاں ڈرنا پڑا ہمیں
پھر بھی رہے ہیں سارے زمانے میں سر بلند
ہر چند پستیوں میں اترنا پڑا ہمیں
ہے ذہن و دل میں کشمکش انصار اس لئے
کچھ دیر سوچنے کو ٹھہرنا پڑا ہمیں

غزل ________ حلیم صابر

موبائل : 9748772983

جہاں میں جینا اب آسان کردیا گیا ہے
مگر ضمیر کو بے جان کردیا گیا ہے
ہوا جو فرقہ پرستی کی چل پڑی ہے یہاں
اُسے بھی چھیڑ کے طوفان کردیا گیا ہے
سزا ملے گی نہ انساں کے قاتلوں کو اب
بابانگِ دُہل یہ اعلان کردیا گیا ہے
امیرِ شہر کی جو جوتیاں اُٹھاتا تھا
اُسے وزیرِ قلمدان کردیا گیا ہے
تمام قلعۂ شاہی ہے اُس کے قبضے میں
ہمیں مزار کا دربان کردیا گیا ہے
کھدائی اور ابھی ہوگی سجدہ گاہوں کی
کہ جاری اِس کا بھی فرمان کردیا گیا ہے
قیام کرکے اقلیتی کمیشن کا
اقلیت پہ یہ احسان کردیا گیا ہے
گناہ ہم سے جو سرزد کبھی ہوا ہی نہیں
اُسی پہ ہم کو پشیمان کردیا گیا ہے
ہمارے حال پہ آتا نہیں ہے رحم جسے
اُسے ہمارا نگہبان کردیا گیا ہے
ہے آج خطرے میں تہذیب گنگا جمنی بھی
جسے مٹانے کا سامان کردیا گیا ہے
کہاں وہ صبحِ بنارس، کہاں وہ شامِ اودھ
اب اُس دیار کو ویران کردیا گیا ہے
سبھی کی پیاری چہیتی زبانِ اردو کو
بزورِ جبر مسلمان کردیا گیا ہے

غزلیں ______________________ راشد طراز

موبائل : 9304861140

یادوں میں تیری خود کو اجالا بنا کے ہم
پڑھتے فضائے شب کو صحیفہ بنا کے ہم

اے دردِ خامشی تری عظمت کو ہے سلام
تجھ کو کبھی ملینگے مداوا بنا کے ہم

زخموں سے چور جا بجا ملتا ہے آدمی
اے کاش خود کو رکھتے مسیحا بنا کے ہم

خود اپنی روح پیاس کی ماری ہے اس قدر
نادم ہیں کیوں نہ رہتے ہیں دریا بنا کے ہم

عرفانِ ذات کے لئے شامِ فراق کو
اتریں گے آئینے میں سراپا بنا کے ہم

بھٹکے ہوئے سفینے کی خاطر وجود کو
اب تک کھڑے ہوئے ہیں کنارہ بنا کے ہم

راشد طراؔز اتنی عبادت تو ہو کبھی
جلووں کا دل یہ دیکھیں اشارہ بنا کے ہم

شناخت کا پسِ منظر بھی معتبر ہوتا
میں سجدہ کرتا تو پتھر بھی معتبر ہوتا

خطوط کھینچتا خود سے جو میں ہتھیلی پر
تو پھر یقیں ہے مقدر بھی معتبر ہوتا

سکوت توڑ کے ہوتا جو دیدنی یہ صدا
مرے لہو کا سمندر بھی معتبر ہوتا

رواں جو ہوتا گلو پر برائے یاد حسینؑ
نشاطِ لمحہ وہ خنجر بھی معتبر ہوتا

تڑپتی رہتی ہیں تنہائیاں مری جس کو
وہ گوشہ ہوتا تو پھر گھر بھی معتبر ہوتا

میں ہر چراغ کو یادوں کا خون دیتا اگر
مرا چراغِ منور بھی معتبر ہوتا

طراؔز دامنِ صد چاک کو گریباں سے
ملا جو لیتے تو پیکر بھی معتبر ہوتا

غزلیں ______ راشد طراز

زمیں کا درد بتایا ہے آسماں نے مجھے
اس انتخاب پہ لایا ہے لامکاں نے مجھے

میں آج تک نہیں نکلا ہوں حسنِ سیرت سے
عجب خمار دیا تیری داستاں نے مجھے

سراغ ہے نہ اشارہ نہ بازگشتِ صدا
بس انتظار میں رکھا ہے کارواں نے مجھے

ملا نہیں ہے اگر چہ براہِ راست پیام
خبر بہاروں کی کچھ دی ہے گلستاں نے مجھے

سنو میں دیکھ کے آتا ہوں رات کی حد کو
بڑے جتن سے بلایا ہے کہکشاں نے مجھے

میں جس کو اپنا سمجھ کر ملا تھا بستی میں
دیا ہے زخم اسی ایک ہم زباں نے مجھے

ملا تھا ایک ہی تمثال قلب پر روشن
اسی کا خواب دکھایا ہے آستاں نے مجھے

طرآز اپنے سوا کوئی بھی نہیں سامع
یہ کیا مقام دیا درد کے بیاں نے مجھے

سب کے لئے میں امن کا پیغام لے گیا
پھر بھی عدو جواب میں الزام لے گیا

کیا خوب اجنبی نے کی تنہائیاں تباہ
باقی جو میرے نام تھی وہ شام لے گیا

مقصود حوصلوں کی بقا دیکھنی تھی بس
مجھ کو کہاں نہیں دلِ ناکام لے گیا

اک شخص چھایا یوں مرے ہوش و ہواس پر
مجھ سے مرا خزینۂ الہام لے گیا

اے دردِ آدمی تری عظمت کی ہے قسم
حق تک مجھے یہ سینۂ آلام لے گیا

آساں نہیں تخیّلِ یکتائی کا حصول
مجھ کو جہاں تصورِ انجام لے گیا

واقف اصولِ دشت نوردی سے تھا طرآز
صحرا گیا تو وہ یہی اقدام لے گیا

خبر نہیں مجھے کیوں حاشیے میں رکھا گیا
بجائے گھر کے راستے میں رکھا گیا

زمیں کو بھول کے پرواز کر رہا تھا میں
فلک کے حکم سے پھر دائرے میں رکھا گیا

چلا تھا عکسِ حقیقت تلاش کرنے کو
مجھے بطور سزا آئینے میں رکھا گیا

ذرا سی سرکشی ظاہر ہوئی تھی وحشت میں
مرے وجود کو پھر ضابطے میں رکھا گیا

نبھا دیا گیا مجھ کو رواج کے مصداق
کسی زیاں میں نہ ہی فائدے میں رکھا گیا

میں جانتا ہوں مقدر مرا وصال نہیں
تو خود سے بھی مجھے کیوں فاصلے میں رکھا گیا

نہیں ہے دخل مجھے سمت کے تعیّن میں
غبار جیسا مجھے قافلے میں رکھا گیا

چلا ہوں خود کو بھلا کر ملال سے آگے
سفر کو کر دیا ساری مثال سے آگے

یہ جانتا ہوں نہیں ممکن العمل ہے مگر
ہیئت گری کو رکھا ہے خیال سے آگے

زوال مجھ کو کبھی گھیر ہی نہیں سکتا
میں دیکھتا ہوں عروج و زوال سے آگے

میں جانتا ہوں کٹھن ہے تصوّرِ فردا
پہ کون دیکھے گا ماضی و حال سے آگے

کہاں پہ امن ہے حق کی پناہ میں روشن
دکھائی دے بھی تو کیسے قتال سے آگے

اسی کی منزلِ مقصود منتظر ہے جو یاں
نکل سکا نہیں فرضِ محال سے آگے

مجھے بھی علم ہے منزل ہے اس کی صفر طرازؔ
کہ یہ سفر ہے فراق و وصال سے آگے

غزلیں ______________________ اخلاق آہن

نئی تو ہے نہیں، یہ رسم بھی پرانی ہے
تری نمود میں ظالم کوئی کہانی ہے
ہماری آنکھوں نے کیا کیا نہیں یہاں دیکھا
چمن میں غنچوں کو یہ بات بھی بتانی ہے
رقیب نے سرِ محفل جو ہیں ستم ڈھائے
وہ داستاں سرِ محفل مجھے سنانی ہے
دیارِ جبر میں جب ہر طرف ہو خاموشی
ہمارا سر نہ سہی، انگلی تو کٹانی ہے
میں چشم دیدِ ستم ہوں، گواہِ اقبالی
یہ داستانِ تظلّم مِری زبانی ہے
حسینیت ہی بچا ہے جو میرا سرمایہ
میں مفتخر ہوں، مجھے کربلا سجانی ہے
یہ جانتا ہوں کہ مظلوم و بے گناہ ہو تم
وہ زعمِ جبر میں ہے، کچھ نہ کچھ رچانی ہے
سبھی نے دیکھا ہے جو کچھ ہوا ہے کل دن بھر
سلے ہیں ہونٹ مگر بات کچھ بنانی ہے
میں لکھ رہا ہوں تمھارے ستم کے افسانے
مگر جو پوچھو گے کہہ دوں گا یہ فُلانی ہے
تمھارے دیدہ میں ہیں گھومتے سبھی منظر
تمھارا شعر جہانی جو ہے، مکانی ہے
یہ دور آہنِ گم گشتہ سے سوالی ہے
کہ تیرے شعر کا مطلب بھی ذو معانی ہے

دل میں کچھ عشق نہیں، جذبۂ ایثار نہیں
پھر بھی کہتے ہو کہ ملّت مِری بیمار نہیں
کل ہی دیکھا تھا سلامت تھے سبھی دار و فصیل
آج گنبد نہیں، منبر نہیں، مینار نہیں
یہ ترے پشت میں اک خنجرِ کاری جو لگا
کارِ دشمن نہیں، کافر نہیں، اغیار نہیں
خوابِ غفلت جو ہر اک سُو جو یہاں طاری ہے
کیسی بستی کہ منادی نہیں، ہشیار نہیں
کہتے ہو تم جسے میخانہ، وہاں ہو آئے
کیسا میخانہ؟ جہاں ساقی و مئے خوار نہیں
رُود آنسو کے کہیں ہیں تو کہیں کوہِ محن
کیسی دنیا یہ بنائی کوئی غم خوار نہیں
ہندزادوں میں کبھی ایسی رَوِش نا دیکھی
کوئی ایسا نہ مِلا، صاحبِ زنّار نہیں
کیا کہوں؟ درد کے گرداب میں ڈوبا ہوا میں
کوئی گریہ نہیں، نالہ نہیں، اظہار نہیں
ایک صحرا ہے، سمندر نہیں، طوفانوں کا
بچ کے جائیں تو کہاں؟ حاجزِ دیوار نہیں
آہنِ دُردِ تہہِ جام کو دیکھو اب کے
نقشِ ماضی سے ہے وابستہ، گو بسیار نہیں

غزلیں ______________________ اخلاق آہن

موبائل :9911311417

زندگی نام ہے چلنے کا یونہی چلتے رہو
بیٹھ جاؤ گے تو پھر موت کی بالش ہوگی

دہر کہتے ہیں جسے رشتۂ فتنہ کا شکار
گر نہ توڑو گے اسے ہر گھڑی سازش ہوگی

جب تلک ہم ہیں اسیرِ دمِ رفت و در آ
زندگی ساتھ رہے گی کوئی خواہش ہوگی

رشتے ناطوں کی عجب ہے یہ کہانی ہر جا
جب تلک رشتوں میں ہیں، جا بجا نالش ہوگی

کچھ تو رکھو بھی بھرم اپنے دم و وجداں کا
رنگ ہوگا نہ کوئی اور نہ رامش ہوگی

تابِ ہمّت کو تو دیکھیں دمِ بے تابی میں
جانِ بسمل جو نہ ہو تو بھی کیا تابش ہوگی

کوئی بھی چشم تصور میں اب بسا ہی نہیں
چمن میں دل کے کوئی پھول اب کھلا ہی نہیں

یہ کیسی رت ہے کہ آثار کچھ نہیں ظاہر
تگرگِ ہجر میں کوئی کہیں گھٹا ہی نہیں

یہ وارداتِ محبت ہے یا کہ ویرانی
کوئی نہ آفتِ دل ہے جہاں بلا ہی نہیں

تڑپ نہ ہو جو کوئی دل کے کارخانے میں
شبیہِ زندہ جسد ہے کہ کچھ ہوا ہی نہیں

مریضِ عشق بھی ہو، عاشقی میں ہو مشہور
نہ دل میں شور ہے،آنکھوں میں کچھ نشہ ہی نہیں

محبتوں میں کئی شام و شب گذار آئے
خلش نہ کھنچتی رہے دل میں تو مزا ہی نہیں

نہ کوئی نقش ابھرتا، نہ ہی تڑپ کوئی
نگاہِ ناز اٹھی تو مگر ڈسا ہی نہیں

نڈھال ہوں میں جمود و سکونِ خاطر سے
نہ جستجو، نہ کوئی چاہ، دل فدا ہی نہیں

کہاں ہے آہنِ دل بستہ، بستگی تیری
نہ کوئی شور و شغب ہے، کوئی گلہ ہی نہیں

موبائل : 8709786440

یہ کس کا دور دورہ چل رہا ہے
کھرے بیٹھے ہیں کھوٹا چل رہا ہے
یہاں تو جشنِ گریہ چل رہا ہے
تمہارے شہر میں کیا چل رہا ہے
ہوئے جاتے ہیں میرے پاؤں پتھر
کہ مجھ سے تیز رستہ چل رہا ہے
ہماری سانس ایسے چل رہی ہے
گلے میں جیسے کانٹا چل رہا ہے
ابھی تک جی رہی ہے اک تسلّی
ابھی تک اک بھروسہ چل رہا ہے
طبیبوں کو ابھی زحمت نہیں دی
ابھی تعویذ، گنڈا چل رہا ہے
خوشامد میں لگے ہیں شاہ کی سب
قصیدے پر قصیدہ چل رہا ہے
تماشہ گاہِ عالم میں ابھی تک
وہی خونیں تماشہ چل رہا ہے
جہاں بحثیں چلا کرتی تھیں پہلے
وہاں اب لات جوتا چل رہا ہے
میں دنیا سے زرا سا مختلف ہوں
مرا دنیا سے جھگڑا چل رہا ہے
جسے دیکھو طلبؔ کاندھے پہ اپنے
لیے اپنا جنازہ چل رہا ہے

افتخار عارف کی نذر

کلام کرتا ہے خوشبو بسا کے لہجے میں
عجیب سحر ہے اس خوش نوا کے لہجے میں
بری خبر ہے اندھیروں کی سلطنت کے لیے
چراغ بول رہے ہیں ہوا کے لہجے میں
یہ کس کے سر پہ چڑھا ہے خمارِ نمرودی
''یہ کون بول رہا ہے خدا کے لہجے میں''
وہ میرا حق ہے مگر دیکھ بے بسی میری
میں اس کو مانگ رہا ہوں دعا کے لہجے میں
دعائیں دیتے ہوئے مجھ کو میرے بچّے کو
عجیب درد تھا خواجہ سرا کے لہجے میں
کسی پہ اس سے برا وقت اور کیا ہوگا
انا بھی گویا ہوئی التجا کے لہجے میں
طلبؔ جو بات ہے مخصوص تیرے لہجے سے
کہاں وہ بات ہما اور شا کے لہجے میں

غزل — معراج احمد معراج

موبائل : 8918960724

لے کر سلاحِ خامہ و قرطاس رن میں آ
جوشِ مقابلہ ہے تو میدانِ فن میں آ

اہلِ نظر کو اپنی طرف کھینچ اس طرح
اک رنگ لے کے منظرِ شعر و سخن میں آ

ہر پھول بے قرار ہے ، ہر خار مضطرب
بادِ بہارِ نو کبھی میرے چمن میں آ

جو تو نہیں تو بزم میں کچھ روشنی نہیں
بن کر چراغِ شام مری انجمن میں آ

اک وجہِ انقلاب کو ہے تیرا انتظار
لے کر جنوں علاقۂ دار و رسن میں آ

زندہ اگر ہے تیغ بکف آ محاذ پر
مردہ اگر ہے لاش کی صورت کفن میں آ

معراج کچھ تو چاند سا ہے میری ذات میں
کہتے ہیں کیوں ستارے مجھے آ ، گگن میں آ

تاج محل شہکار ابھی تک زندہ ہے
شاہ جہاں کا پیار ابھی تک زندہ ہے

تیری دید کو میری آنکھیں روشن ہیں
آ کہ ترا بیمار ابھی تک زندہ ہے

عمر رسیدہ ہے لیکن بے جان نہیں
تیغِ کہن کی دھار ابھی تک زندہ ہے

گاؤں کی غیرت کود پڑی اک دریا میں
بے غیرت بدکار ابھی تک زندہ ہے

گھر کو بانٹنے والے کب کے خاک ہوئے
اور اس کی دیوار ابھی تک زندہ ہے

جس کے سب کارندے مردوں جیسے ہیں
کیسے وہ سرکار ابھی تک زندہ ہے

گھر کو لوٹنے والے سہمے سہمے ہیں
گھر کا پہریدار ابھی تک زندہ ہے

ہم نے ہی معراؔج بڑھائی دار کی شان
ہم سے ہی ایثار ابھی تک زندہ ہے

غزلیں ________________________ خورشید ملک

موبائل : 9748582900

شکستہ ناؤ ہے میری، بھنور مقابل ہے
لہو کے دریا پہ پل باندھنا بھی مشکل ہے
ہم اس کے قتل کو ثابت بھی کر نہیں سکتے
لہو لہو کیا جس نے انوکھا قاتل ہے
ہے میرے ذہن میں ہلچل نظر بھی ہے بے چین
مجھے سمجھ نہیں آتا کہاں کہاں دل ہے
کہیں پہ بچوں کی مانند ضد پہ اڑ جائے
کہیں پہ لگتا ہے یہ دل بزرگ کامل ہے
اب ان کے آپسی رشتے خبر بنے ہوئے ہیں
وہاں پہ عدل نہیں ہے جہاں پہ عادل ہے
تماش بیں ہمیں حیرت سے دیکھنے لگے ہیں
جہاں بھنور ہے وہیں پہ ہمارا ساحل ہے
سکھا رہا ہوں میں آداب زندگی اس کو
مگر وہ سنتا نہیں ہے جو مجھ میں داخل ہے
بس ایک آن میں حاضر کرے خیال اس کا
مرا یہ دل نہیں خورشید، اک موکل ہے

کبھی خود پر بھروسہ کر رہا ہوں
کبھی پر چھائیوں سے ڈر رہا ہوں
دل و جاں سے مجھے وہ چاہتے ہیں
غموں کا میں شکم پرور رہا ہوں
تمہیں قاتل ہو دنیا جانتی ہے
مگر الزام خود پر دھر رہا ہوں
کہاں، کب، کس سے ملتا ہے، پتہ ہے
کبھی میں اس کا نامہ بر رہا ہوں
قلم کاغذ لئے بیٹا کھڑا ہے
اسے معلوم ہے میں مر رہا ہوں
وہی سولی پہ آئے ہیں چڑھانے
میں جن لوگوں کا پیغمبر رہا ہوں
مجھے آئینے کی خصلت پتہ ہے
زمانے تک میں شیشہ گر رہا ہوں
قدم بوسی مری فطرت نہیں ہے
بلندی کا کبھی ہمسر رہا ہوں
ملے تو تھے مجھے خودکار زینے
مگر میں راہ خود طے کررہا ہوں
ہے میری برق رفتاری مثالی
اگرچہ میں شکستہ پر رہا ہوں
بہت کچھ بک رہا ہے تو جنوں میں
ٹھہر پڑھ کر ابھی دم کر رہا ہوں
مزاجاً گرم ہوں خورشید پھر کیوں
غموں کی آنچ سے میں ڈر رہا ہوں

پس جہان خودی وصل یار کیسے کروں
ہوا کی اونچی فصیلوں کو پار کیسے کروں
نظر وہ دے کہ پس آئینہ نظر آئے
میں کم نظر ہوں نظر آر پار کیسے کروں
میں اپنے جسم کی دیوار سے گھرا ہوا ہوں
پکارا جاؤں تو اس حد کو پار کیسے کروں
ابھی تو آئی تھی اندر سے ٹوٹنے کی صدا
میں کتنے ٹکڑے ہوا ہوں شمار کیسے کروں
اک انتقام کا جذبہ پنپ رہا ہے مگر
جو سنگدل ہے اسے سنگسار کیسے کروں
مرے تو صبر کی میعاد ہوگئی پوری
مگر میں لہجہ ترا اختیار کیسے کروں
شکست دینی ہے خورشیدؔ اپنے دشمن کو
یہ فکر بھی ہے مجھے خود پہ وار کیسے کروں

ابھی جانا بھی ہوگا مجھ کو رن میں
لہو باقی ہے چلّو بھر بدن میں
جگہ ملتی نہیں آنکھوں میں جن کو
وہ چھپ جاتے ہیں ماتھے کی شکن میں
سفر سے دوستی کرلی ہے میں نے
عداوت ہے قدم میں اور تھکن میں
میں اپنے دل کو وسعت دے رہا ہوں
ترا غم رہ نہیں سکتا گھٹن میں
طبیعت ہے مری خاموش لیکن
بہت بیباک ہوں اپنے سخن میں
ہے جذب عشق اک خار مغیلاں
بہت لذت ہے لیکن اس چبھن میں
اندھیرے رقص کرنے لگ گئے ہیں
ذرا خورشیدؔ کیا آیا گہن میں

غزل — ظفر حیات ظفر (پاکستان)

میری ہر بات کا رَد ہے، حد ہے
تیری ہر بات سَنَد ہے، حد ہے
مَوت، اک طرزِ تَعَطُّل ہے بس!
زندگی، تا بہ ابد ہے، حد ہے
صحنِ جنّت سے نکل کر، دوزخ؟
محوِ حیرت یہ خِرَد ہے، حد ہے
یہ پری چہرہ ، خدا کا شہکار!
یہ بھی مٹّی کا جَسَد ہے، حد ہے
رُوح، بَرزَخ کی مکیں ہے، بے شک
کیا بدن رزقِ لَحَد ہے، حد ہے
زندگی! تُو یہ کہاں لے آئی؟
نَے کمک ہے نہ رَسَد ہے، حد ہے
تیرے دل پر ہے بتوں کا غلبہ
نام کا عبدالصّمد ہے، حد ہے
دل صنم خانہ بنا ہے، لب پر
قُل ھُوَ اللہُ اَحَد ہے، حد ہے
ڈر کے بھاگے ہو صدائے سگ سے
نام پوچھو تو اسد ہے، حد ہے
بانس باندھے ہوئے پھرتے ہو تم!
چار بالشت ہی قد ہے، حد ہے
بے تعلّق سے ہوئے بیٹھے ہو
نَے کہیں رَد ہے نہ کد ہے، حد ہے
اتنے اِعراب گُریزاں کیوں ہو؟
اب کہیں شَد ہے نہ مَد ہے، حد ہے
زندگی، زیر و زبر ہے اور بس
نَے کہیں شَد ہے نہ مَد ہے، حد ہے
بے وفاؤں سے وفا کی امّید
خوش گمانی کی بھی حد ہے ، حد ہے
تجھ کو معلوم کہ تیری آنکھیں
یہ تو پھر قتلِ عَمد ہے، حد ہے
ظاہراً خُلقِ حَسَن کی تصویر
باطناً نیّتِ بَد ہے ، حد ہے
رُخ پہ داڑھی تو سجا لی ہے ظفرؔ
پھر بھی سینے میں حَسَد ہے ، حد ہے

غزلیں ــــــــ ظفر حیات ظفر (پاکستان)

دل میں تیرا خیال ہے کب سے
آرزوئے وصال ہے کب سے

ایک مدّت سے مل نہیں پائے
یوں، تعلّق بحال ہے کب سے

مَیں کہ مضروبِ کن فکاں ٹھہرا
میرے دل میں ملال ہے کب سے

کل کی معدومیّت غنیمت تھی
آج ہونا وبال ہے کب سے

کب سے پاسِ الَست ہے مجھ کو
بھول کا احتمال ہے کب سے

چارہء کُن نہیں بجُز جُنّت
ورنہ ہونا وبال ہے کب سے

موت کی آرزو نہیں لیکن!
زندگانی وبال ہے کب سے

کب سے گردابِ خیر و شر میں ہوں
یہ عروج و زوال ہے کب سے

کوئی تو خیر کی خبر لاؤ!
کھوپڑی میں اُبال ہے کب سے

میں تو خاموش ہوں ظفر لیکن!
دل سراپا سوال ہے کب سے

آگہی، تقصیر ہو کے رہ گئی
بے خودی، تعزیر ہو کے رہ گئی

دل لگی میں، دل لگی سی ہو گئی
دل لگی، دلگیر ہو کے رہ گئی

پر تکلف زندگی، ہے زندگی
سادگی، تحقیر ہو کے رہ گئی

جھوٹ کا ہے بول بالا جا بجا
راستی، نخچیر ہو کے رہ گئی

بولیے! کچھ تو خدا را بولیے
خامشی، گمبھیر ہو کے رہ گئی

نا رسائی تک، رسائی ہو سکی
بے بسی، تقدیر ہو کے رہ گئی

غربت و افلاس کا ورثہ ملا
مفلسی، جاگیر ہو کے رہ گئی

عزم و ہمت کا جنازہ اٹھ گیا
کاہلی، تدبیر ہو کے رہ گئی

اندھی آنکھوں نے اندھیرے پی لیے
تیرگی، تنویر ہو کے رہ گئی

آج کے نازک زمانے میں ظفر
دوستی، زنجیر ہو کے رہ گئی

غزلیں ـــــــــــــــــــ یاسر رضا آصف (پاکستان)

کچھ اس قدر ہی بڑھ گیا سایا درخت کا
بیٹا جوان ہو نہیں پایا درخت کا

ہمراہ اس کے کتنے پرندوں کے غول تھے
لاشہ جو میں گھسیٹ کے لایا درخت کا

موسم کڑا ہے اور ہوائیں بھی تیز ہیں
قائم رہے وجود خدایا درخت کا

چھو کر بہار نے اسے ایسے ہرا کیا
نغمہ سبھی پرندوں نے گایا درخت کا

ہے میرے راستے میں کڑی دھوپ دور تک
دیوار نہ کہیں کوئی سایا درخت کا

سب کا خیال تھا کہ ہے برسات کا اثر
رونا کوئی بھی دیکھ نہ پایا درخت کا

میری جڑوں کو چاٹ رہا ہے کسی کا غم
میری طرف پیام یہ آیا درخت کا

آپ سے ہے کب ہمارا کوئی ذاتی اختلاف
گفتگو کا حُسن ہے یہ نظریاتی اختلاف

میں نے صلح کے لیے گھر پر بلایا تھا تمھیں
تم اُٹھا لائے ہو بھائی سو نکاتی اختلاف

طے نہ ہو پائے کبھی نزدیکیوں کے مرحلے
مر کے بھی قائم رہا کچھ نفسیاتی اختلاف

پھول سارے مختلف ہیں رنگ سارے مختلف
کب سمجھ آئے گا تم کو کائناتی اختلاف

تھے بڑی مدت سے دل میں نفرتوں کے سلسلے
لوگ جس کو کہہ رہے ہیں حادثاتی اختلاف

ایک دم تکمیل کا سارا سفر ممکن نہیں
رفتہ رفتہ ہی مٹے گا تجرباتی اختلاف

گھر کے بڑے بوڑھوں کو یہی کہتے سنا ہے
جُھک جُھک کے جو ملتا ہے وہی قد میں بڑا ہے

وہ شخص ہوا کے کسی جھونکے کی طرح تھا
اب حبس بڑھا ہے تو یہ احساس ہُوا ہے

لفظوں کے لبادے میں چھپی بات کو سمجھو
کب ہم نے تری ذات سے انکار کیا ہے

اِک باب کے کھلنے سے کئی باب ہیں کھلتے
یہ علم کا نکتہ مجھے اِک در سے ملا ہے

ہر بات کے پردے میں کوئی بات چھپی ہے
ہم نے ترے تیور سے یہ پہچان لیا ہے

شاید کہ کوئی ربط کی صورت نکل آئے
بے ربط عبارت کو کئی بار پڑھا ہے

اِک خوف مسلط ہے سبھی باغ پہ آصفؔ
پھولوں نے بھی خوشبو کو یہاں قید کیا ہے

ان کو جانا ہو جہاں، پل میں وہیں ہوتے ہیں
صوفیا اور جہانوں کے مکیں ہوتے ہیں

سب کے بدلے ہوئے تیور یہ سمجھ لیتے ہیں
لاکھ سادہ ہوں یہ نادان نہیں ہوتے ہیں

یہ بگولے کبھی طوفان نہیں ہو سکتے
آسماں خود کو جو کہتے ہیں، زمیں ہوتے ہیں

تیرے آنے سے سبھی رنگ نکھر جاتے ہیں
پھر تو بے رنگ سے منظر بھی حسیں ہوتے ہیں

اب تو یادیں ہی ملاقات کی صورت ٹھہریں
میں کہیں ہوتا ہوں اور یار کہیں ہوتے ہیں

ہم نے سینوں میں بھی دیکھے ہیں خزانے پنہاں
تم سمجھتے ہو کہ بس زیرِ زمیں ہوتے ہیں

یہ دمکتے ہوئے دریا کے کنارے آصفؔ
رات ہوتی ہے تو کچھ اور حسیں ہوتے ہیں

غزلیں ______________________ اشرف یعقوبی

موبائل : 9903511902

اک رات کی خوشی کا مزہ ہم سے پوچھئے
شبنم کی زندگی کا مزہ ہم سے پوچھئے
ملتا ہے غم خوشی سے گلے کس طرح جناب
بیٹی کی رخصتی کا مزہ ہم سے پوچھئے
بنجاروں کے لبوں پہ ہے یہ گیت آج بھی
دنیا کی زندگی کا مزہ ہم سے پوچھئے
پھولوں سے دوستی کا مزہ آپ جانئے
کانٹوں سے دوستی کا مزہ ہم سے پوچھئے
کالی گھٹا کی چھاؤں میں بھی لطف ہے نصیب
بارش میں بے گھری کا مزہ ہم سے پوچھئے
الزام لگ چکے ہیں کئی لو جہاد کے
محبوب کی گلی کا مزہ ہم سے پوچھئے
عکس جمیل بام سے اترا ہے جھیل میں
لہروں کی دلکشی کا مزہ ہم سے پوچھئے
غالب کی بات اور ہے سودا کی بات اور
اشرؔف کی شاعری کا مزہ ہم سے پوچھئے

گلوں کی وادی میں جتنا ستم بہار کا ہے
کچھ اس سے اور زیادہ ہی حسن یار کا ہے
یقین کیسے دلاؤں تمہاری آنکھوں کو
معاملہ یہ محبت میں اعتبار کا ہے
خزاں کی گود بھرائی میں اس کو مت دینا
یہ عشق پالا ہوا موسم بہار کا ہے
ستم سے اس کو بچانا ہے سنگزادوں کے
جوان پیڑ جو آنگن میں اک انار کا ہے
تمہارے من میں بھی اک چور ہے محبت کا
ہمارے دل میں بھی اک کرب انتظار کا ہے
جو ذکر تاج محل کا ہے میری غزلوں میں
یہ ذکر میرے لیئے تیری یاد گار کا ہے
نشہ انا کا تو سر سے اتر گیا لیکن
جو درد سر ہے میرے سر میں وہ خمار کا ہے
نہ پوچھ کون ہے اشرؔف کہاں کا ہے شاعر
فقیر مست قلندر اسی دیار کا ہے

غزلیں ________________ ابھئے کمار بیباک

موبائل : 9471002335

ان کی طرف سے اب بھی کہاں اذن یاس ہے
لیکن یہ دل انھیں کے لئے کیوں اداس ہے

بادِنسیم باغ سے کب کے گزر گئی
صحنِ چمن میں کس کی ابھی تک سباس ہے

آنکھوں کو آنسوؤں کا سمندر بنا لیا
پھر بھی ہمارے دل میں محبت کی پیاس ہے

نقشِ دوئی کا کھیل ازل سے ہے تا ابد
دنیا تو آدمی کا سراسر قیاس ہے

جاری نہیں ہے یوں ہی ہمارے جنوں کی جنگ
خود پر بھی اعتماد ہے تم سے بھی آس ہے

بیباکؔ زندگی کا انوکھا ہے یہ تضاد
حق بے حیا نہیں ہے مگر بے لباس ہے

ایک دن جب زندگی میں مبتلا ہو جائیں گے
رفتہ رفتہ درد سے بھی آشنا ہو جائیں گے

روٹھتے ہم سے تو آتے ہم منانے آپ کو
کیا خبر تھی آپ خود سے بھی خفا ہو جائیں گے

مانتا کب ہے کہ ہم نے دل کو سمجھایا بہت
مت کرو اتنی وفا وہ بے وفا ہو جائیں گے

رنگ بدلے گا زمانہ وقت چاہے جو لگے
آج پتھر ہیں وہی کل آئینہ ہو جائیں گے

کب ملے گی راہ ایسی کب ملیگا وہ سفر
جب ہمارے پاؤں بھی بے آبلہ ہو جائیں گے

کوئی دن بیباکؔ اپنا بھی تو آئے گا ضرور
اور جب آئے گا وہ دن، ہم فنا ہو جائیں گے

رنگوں میں ایسے رنگ ہیں تیرے شباب کے
پھولوں میں جیسے پھول ہوں تازہ گلاب کے

کہتے ہیں ہوش مند رہے بزم جب کہ وہ
نینوں میں بھر کے لائے ہیں پیالے شراب کے

تم کب وفا کروگے یہی تو سوال تھا
ہم اب بھی منتظر ہیں تمھارے جواب کے

ان کی طرف سے آج بھی قائم ہے بے رخی
دیکھے ہیں ہم نے غور سے تیور جناب کے

یوں کم نہیں حیات میں اک وقتِ مختصر
پانی میں ہم نے دیکھے ہیں جلوے حباب کے

ایسا نہیں کہ لمس کی قیمت نہیں رہی
آہستہ چل کہ نیند! یہ جھونکے ہیں خواب کے

اب تو جنوں میں بند ہیں فریاد و آہ بھی
معنی سمجھ میں آنے لگے ہیں عذاب کے

بیباکؔ سلسلے سے نمایاں ہے سادگی
اوراق دیکھ مرے دل کی کتاب کے

مکانِ دل ہے سادہ کوئی زیبائش نہیں ہے
محبت میں دکھاوے کی ہمیں خواہش نہیں ہے

نہ پوچھو کتنی من موجی ہیں ساون کی گھٹائیں
کہیں بارش میں سب ڈوبے کہیں بارش نہیں ہے

تم اپنے آشیانوں کے ذرا تنکے سنبھالو
شجر کی ٹہنیوں میں اب کہیں جنبش نہیں ہے

کہاں قائم ہوا ہے نیند کا محور و مرکز
شبستاں میں تو خوابوں کی ابھی گردش نہیں ہے

ازل ہی سے محبت کا محافظ بن چکا ہے
سو نفرت کی دلِ عاشق میں گنجائش نہیں ہے

یہ کوئی آگ ہے بیباکؔ جس کو عشق جانو
لگی تو بجھ بھی جائے گی یہ وہ آتش نہیں ہے

غزلیں _______________ راشد حسین راہی

موبائل : 7007091002

چارسو مشہور ہے جادو بیانی آپ کی
اپنا ہرغم سننا چاہوں میں زبانی آپ کی

آئینے کے سامنے بیٹھے ہیں کیوں گم صم جناب
بات شاید آپ کے دل نے نہ مانی آپ کی

آپ کی تصویر ہو رومال ہوں یا ہوں خطوط
آج تک محفوظ ہے ہر اک نشانی آپ کی

خود رہا گمنام لیکن آپ کو بخشا عروج
چار سو سب کی زباں پر ہے کہانی آپ کی

چھو نہ پائے کوئی بھی غم زندگی بھر آپ کو
ایک اک ساعت سدا گزرے سہانی آپ کی

مت لگائیں قہقہے بزم طرب میں سب کے ساتھ
دیکھ کر دشمن جلیں گے شادمانی آپ کی

آپ سچائی کے رستے پر اگر چلتے رہے
سب کے دل پر ہوگی راہی حکمرانی آپ کی

نگاہِ باغباں میں ان کی کب کچھ قدر و قیمت ہے
کہ جن کانٹوں کے ذمے غنچہ وگل کی حفاظت ہے

نہ اس کے قرب کی چاہت نہ کچھ اس سے شکایت ہے
جو پہلے تھی وہ رسماً آج بھی صاحب سلامت ہے

اسی صورت سے کارِ زندگی جاری ہے برسوں سے
اِسے میری ضرورت ہے مجھے اس کی ضرورت ہے

جونفرت کے پجاری ہیں،نہیں اِس راز سے واقف
'عبادت ہی محبت ہے، محبت ہی عبادت ہے'

یہ بے کاری یہ مہنگائی ستاتی ہے غریبوں کو
وہ اس بارے میں کیوں سوچیں کہ جن کے پاس دولت ہے

بہت نقصان پہنچاتے ہیں دونوں قربتیں پا کر
یہی ہے آگ کی فطرت یہی دشمن کی فطرت ہے

ہمارے ملک میں راہی ہیں ایسے گاؤں بھی جن میں
کہیں چھپر پرانا ہے کہیں ٹوٹی ہوئی چھت ہے

غزلیں ________________ رخشاں ہاشمی

موبائل : 9546315545

دل کے آڑے دماغ آیا ہے
ہاں! محبت پہ داغ آیا ہے
بولتا ہی نہیں ہوا کے خلاف
ہاتھ کیسا چراغ آیا ہے
کتنے صحرا کی خاک چھانی تب
راہ میں سبز باغ آیا ہے
جتنے پیاسے تھے اُن کے حصے میں
دیکھ! خالی ایاغ آیا ہے
آج دعوت ہے فاختہ کے گھر
اور دعوت میں زاغ آیا ہے
آنکھیں بینائی کھو چکی ہیں جب
میرے گھر کا چراغ آیا ہے
دِل پہ دَستک کِسی نے دی رخشاںؔ
زندگی میں فراغ آیا ہے

ماں باپ کی دعائیں مقدر میں آگئیں
خوشیاں سمٹ کے سب ہی میرے گھر میں آگئیں
دل چھن سے ٹوٹا کانچ کی مانند اور پھر
کل شب تمام کرچیاں بستر میں آگئیں
جس وقت ایک نعرۂ تکبیر لگایا
کتنی دراریں پھر درِ خیبر میں آگئیں
دیکھا جو میرا عزم سمندر بپھر گیا
موجیں بھی پھر سنامی کے تیور میں آگئیں
رخشاںؔ کو ایسا گوہرِ نایاب ملا کہ
سب زینتیں جہان کی زیور میں آگئیں

غزلیں ______ ڈاکٹر افروز عالم (کویت)

موبائل : 9810216852

گردش ہے میرے ساتھ پتا دے رہا ہوں میں
الفت سے ہر کسی کو صدا دے رہا ہوں میں

نشتر کی طرح ذہن میں چبھنے لگی ہے اب
سینے کی سوزشوں کو سزا دے رہا ہوں میں

میں رات کے چراغ میں زندہ ہوں بہر کیف
کمرے کو خامشی سے ضیا دے رہا ہوں میں

دشمن جو ہے میرا اسی کافر کی ہے طلب
یوں شعلۂ عدو کو ہوا دے رہا ہوں میں

یہ ڈھونڈ کے بتا کہ پس آرزو ہے کون
لفظوں میں اپنے اس کا پتا دے رہا ہوں میں

ابھرا تو ہے یوں لوح تصور پہ کوئی نام
لمحات کی ہوا میں مٹا دے رہا ہوں میں

عالمؔ بدل گیا ہوں زمانے کے ساتھ ساتھ
رنگت نئی خیال نیا دے رہا ہوں میں

دشمنوں کو مرے ہمراز کرو گے شاید
وقت تنہائی میں آواز کروگے شاید

تم بہت تیز ہو،شہ زور ہو،استاد بھی ہو
تم بنا پر کے بھی پرواز کروگے شاید

یہ کھلا جسم،کھلے بال،یہ ہلکے ملبوس
تم نئی صبح کا آغاز کروگے شاید

تلخ انداز سے بدلو گے زمانے کا مزاج
اپنے اطراف کو نا ساز کروگے شاید

تم تو خاموش ہو، لو میں ہی ذرا لب کھولوں
بات سے بات کا آغاز کروگے شاید

انشائیہ

چودہ ہزار فٹ کی بلندی

ڈاکٹر قیصر شمیم

موبائل : 9811080177

میں نے حافظہ پر بہت زور ڈالا مگر مجھے نکاح نامہ میں ایسی کوئی شرط یاد نہیں آئی۔ یوں بھی شادی کو کئی دہائی گذر جاتیو نکاح نامہ، کاغذات کے انبار میں گدھے کی سینگ کی طرح گم ہو جاتا ہے اور بچّے شادی کا ثبوت بن کر دندناتے پھرتے ہیں۔ میں نے ایک بار اسے ڈھونڈھنے کی کوشش کی کہ اپنے حافظہ کا امتحان لوں اور جان سکوں کہ کیا ایسی کوئی شرط درج کی گئی تھی جسے پڑھے بغیر، میں نے گھبراہٹ میں دستخط کر دیا تھا، مگر ناکام رہا۔ ممکن ہے نوکر پیشہ مہاجروں کی طرح بار بار مکان بدلنے میں گم ہو گیا ہو، یا بزرگوں کی بعض نشانیوں کی طرح اسے بھی دیمک نے چاٹ لیا ہو، اور پھر دیگر دیمک زدہ کاغذات کے ساتھ اسے بھی جلا دیا گیا ہو۔

ایک بار نکاح ہو جائے تو نکاح نامہ کو پڑھنے کی فرصت بھلا کسے ہوتی ہے۔ نکاح نامہ، کاغذات کی الماری میں رکھ کر انسان بے فکر ہو جاتا ہے؛ سوائے ان لوگوں کے جو بدیس کو اپنا دیس بناتے ہیں۔ لگتا ہے ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ نکاح کے وقت ہی مولوی صاحب کی بھویں سفید تھیں اور گردن ہل رہی تھی، سو ان کے زندہ ہونے کا بھی امکان نہیں۔ ان کے بچّوں نے اس پیشہ کو چھوڑ کر کوئی اور ہی راہ اپنائی ہے۔ اس لیے ان کے رجسٹر کو ڈھونڈھنا بھی دقّت طلب کام تھا۔ نوکری سے سبکدوش ہونیکے بعد وہ فائل بھی نہ معلوم کہاں ہوگی جس میں ہر طرح کے اسناد جمع تھے۔ سو، مسئلہ اپنی جگہ بنا رہا۔

تمام ہوشیار بیویوں کی طرح میری بیوی بھی اس باب میں خاموش رہیں۔ انہوں نے اس پر کبھی کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ مگر ہوتا وہی رہا جس کے بارے میں مجھے شبہ تھا کہ ایسی کوئی شرط نہیں تھی۔ شادی سے قبل ان سے جو مختصر سی گفتگو ہوئی اس سے یہی اندازہ ہوا کہ وہ گرچہ شملہ میں پیدا ہوئیں اور ابتدائی تعلیم سولن کے سینٹ لوئیک میں ہوئی مگر مرٹھوارہ یونیورسیٹی اور گوا کے نیشنل انٹی ٹیوٹ آف اوشنوگرافی میں عرصہ تک تعلیم حاصل کر کے ان کا مزاج بھی میدانی علاقے کے لوگوں جیسا ہو گیا ہے۔ بار بار سمندر اور جہاز، خاص طور سے ''ساگر سمپدا'' نامی جہاز کی کہانی سن کر ایسا گمان ہوا کہ ان کی دلچسپی کا مرکز سمندر ہے، جہاں خواہ مخواہ، تفریحاً کوئی نہیں جاتا۔ اس لیے اس مسئلہ پر

غور کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ مگر شادی کے اگلے دن جب باہر جانے کا منصوبہ بنا تو انہوں نے شملہ جانے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے سوچا ہر شخص کو اپنی جائے پیدائش سے محبّت ہوتی ہے اور پھر میں نے سن رکھا تھا کہ وہاں تک قومی شاہراہ بہت عمدہ ہیا وران سب سے بڑی بات یہ کہ شملہ تک ٹرین بھی جاتی ہے۔ میں فوراً آمادہ ہوگیا۔ ویسے بھی وہ زمانہ کسی بات میں نہ کہنے کا نہیں ہوتا ہے۔ ... میرے بزرگ ساتھی آر بی بنرجی، جو میرے نوکری میں آنے کے پانچ سال بعد سبکدوش ہوگئے تھے، اکثر کہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب! جب تک لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کی خوشامدانہ تعریف کرتے رہتے ہیں کہ تم چاند کا ٹکڑا ہو اور تم بڑے خوبرو بانکے ہو تب تک سب ٹھیک رہتا ہے۔ جس دن ایسی تعریف بند ہوتی ہے اسی دن پہلی لڑائی ہوتی ہے۔ ... یہ سب بہت بعد میں ہوتا ہے۔ شادی کے اگلے دن تو ماو؟ نٹ ایورسٹ پر جانے میں بھی عذر نہیں ہوسکتا تھا۔ ایک بزرگ خاتون کہا کرتی تھیں کہ شادی کے بعد لڑکے کو ایسا لگتا ہے کہ اس کی اصل ہمدرد ساتھی، جو اس کی بات سمجھ سکے، اب ملی ہے؛ اس سے پہلے وہ کن احمقوں میں پھنسا تھا۔ میں حافظہ پر زور دیتا ہوں تو ایسی بہت سی باتیں بیوی کی پہلی فرمائش پر صاد کرنے میں نظر آتی ہیں؛ لیکن تب کسے معلوم تھا کہ جو شخص ایک بار پہاڑ پر جاتا ہے وہ ساری زندگی پہاڑوں کو ہی چھلانگتا رہتا ہے۔

میں جب بھی پہاڑ پر جاتا ہوں تو مجھے گنگا برہمپتر کے اس عظیم الشان میدان کی یاد آتی ہے جس کے ایک چھوٹے سے شہر میں میری پیدائش ہوئی اور جس کے تا حد نظر پھیلے ہرے بھرے کھیتوں اور ہر چند میل پر استقبال کرتی ندیوں کے درمیان میرا بچپن گذرا تھا۔ اس وسیع و عریض میدانی علاقے میں پہاڑ تو کیا کوئی ٹیلہ بھی نہیں تھا جو نظر کو محدود کردے۔ ریلوے اسٹیشن پر لکھا ہوتا تھا کہ سطح سمندر سے اس شہر کی اونچائی ڈیڑھ سو فٹ ہے۔ پتھر یا تو ریلوے لائن پر ہوتا تھا یا مندر میں۔ ہم فلموں میں پہاڑ دیکھ کر خوش ہوتے جہاں ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ دوڑ کر گانا گاتے اور ذرا بھی نہیں ہانپتے تھے۔ تب ہم یہ سمجھتے تھے کہ کرۂ ارض کا زیادہ تر حصّہ ہمارے علاقے کی طرح سرسبز میدان اور کھیتوں والا ہوگا جہاں گرمی کے دنوں میں بھی ذرا سا کریدنے پر نم مٹّی نکل آتی ہوگی۔ کہیں کہیں تفریح کے لیے قدرت نے اونچے نیچے پہاڑ بنا دئے ہوں گے جہاں سیلانی جایا کریں اور فلم کی شوٹنگ ہوسکے۔ البتہ ہر وقت اسلامی واقعات سننے کی وجہ سے ریگستان کے بارے میں ہماری معلومات یقیناً پہاڑ سے زیادہ تھی اور بغیر دیکھے ہلکی سی انسیت بھی تھی۔ سمندر کو بھی ہم، سند باد جہازی کے قصّوں کی بدولت ہی جانتے تھے جس کا جہاز اکثر حادثہ کا شکار ہوتا تھا، اور وہ عجیب الخلقت جانوروں اور انسانوں سے ملنے اور دو ایک شادی کرنے کے بعد اس کام کو مزید دہرانے کے لیے کسی اور علاقے کا رُخ کرتا تھا۔ جب تعلیم ہوئی تو پتہ چلا کہ دراصل

گنگا برہمپتر کا میدان ہی قدرت کا انوکھا تحفہ ہے، ورنہ کرہ؟ ارض کا تین چوتھائی تو آبی ہے اور بقیہ میں پہاڑ اور پٹھار ہیں؛ یعنی جہاں دیکھیے اونچی نیچی زمین اونٹ کی طرح کوہان نکالے ہوئی ہیں۔

سطح مرتفع سے ہماری پہلی ملاقات ہائی اسکول کرنے کے بعد ہوئی، جب مجھے چھوٹا ناگپور کی پہاڑیوں میں واقع رانچی اور چکردھر پور کی سیر کے لیے بھیجا گیا۔ تب رانچی میں پنکھے کا رواج نہیں تھا۔ جون کے مہینے میں چادر اوڑھ کر سونا پڑا۔ عجیب تجربہ تھا۔ گزشتہ سال وہاں بعض گھروں میں ایرکنڈشنر نظر آئے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ رانچی سے چکردھر پور کے درمیان 32 میل کی گھاٹی اتنی چکردار ہے کہ اسے جلیبی گھاٹی کہا جاتا ہے۔ تب بادل کے ٹکڑے سڑک سے نیچے کھائی میں نظر آئے تو بڑی حیرت ہوئی تھی کہ بادل تو ہمیشہ سر سے اوپر، بہت اوپر، ہوتا ہے۔ آبشار اتنی اونچائی سے گرتے دیکھا کہ دم بخود رہ گئے۔ بعد میں سیانے لوگوں نے بتایا کہ بچو! وہ تو پہاڑ نہیں پٹھار ہے؛ پہاڑ تم نے ابھی دیکھا ہی کہاں ہے۔

بالآخر پہاڑ سے واسطہ پڑ ہی گیا۔ پی ایچ ڈی کے سلسلے میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن، نئی دہلی سے ایک کورس کر رہا تھا۔ اس ادارہ نے ہمیں پروجکٹ ورک کے لیے جن جگہوں پر بھیجا ان میں مسوری بھی شامل تھی۔ مسوری سے ذرا آگے، کامپٹی آبشار تک سیر کر کے لوٹا تو سوچا بہت ہوا؛ سچ مچ کا پہاڑ بھی دیکھ لیا۔ اب اپنا گنگا کنارے والا علاقہ ہی بھلا۔ لیکن انسان جو سوچتا ہے وہ ہمیشہ نہیں ہوتا۔ شادی کے وقت یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ میری بیوی کی پیدائش شملہ میں ہوئی اور ان کے پردادا کا بنوایا ہوا مکان، جسے وہ آبائی مکان کہتی ہیں، ہماچل کے پہاڑی شہر، ناہن میں واقع ہوا ہے۔ مگر میں نے سوچا پرواہ نہیں! اب تو وہ دہلی میں نوکری کرتی ہیں۔ لہٰذا یہاں سے کہیں جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس زمانہ میں ایسی خوش فہمی فطری طور پر پیدا ہوتی ہے۔ الجھن تب ہوئی جب شادی کے بعد شملہ پہنچنے پر ہمیں بتایا گیا کہ شملہ تک تو پہاڑ کی ابتدا ہوتی ہے۔ اصل پہاڑ تو اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے وہاں پہنچنے پر بھی یہی بتایا جائے گا کہ اصل پہاڑ اور آگے ہے؛ اور اس طرح عشق کا مارا آگے اور آگے بڑھتا جائے گا۔ بچپن میں ایک فلم دیکھی تھی جس میں ہیرو کو پریاں دریا کی تہ میں چھپے محل میں لے جاتی ہیں جہاں عیش و طرب کی محفل آراستہ ہوتی ہے۔ کئی دن کی عیاشی کے بعد جب ہیرو اپنے کو دریا کے کنارے لیٹا ہوا پاتا ہے تو بلبلا اٹھتا ہے اور دیوانہ وار نعرہ لگاتا پھرتا ہے، ''ایک بار دیکھا ہے، ایک بار اور دیکھنے کی تمنا ہے''۔ وہ خواہش تو کیا پوری ہونی تھی، البتہ ساری زندگی وہ اور اس جیسے لوگ اسی تمنا میں آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے اصل پہاڑ کا معاملہ بھی اسی سے ملتا جلتا ہے۔ جو ایک بار پہاڑ پر جاتا ہے وہ اصل پہاڑ کی تلاش میں ساری

عمر پہاڑوں کو پھلانگتا رہتا ہے۔اصل پہاڑ سائے کی طرح آگے بھاگتا جاتا ہے۔سوایک بار ہم، گرمی کی چھٹی میں، دارجلنگ کی سیر کرتے ہوئے سکّم میں واقع، چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر ناتھولا جا پہنچے جو ہندوستان اور چین کے درمیان ایک تجارتی چوکی ہے۔یوں تو میری بیوی ہر پہاڑی مقام پر پہنچتے ہی ہمیں احساس دلاتی ہیں کہ دیکھو پہاڑی لوگ صفائی اور حفظانِ صحت کا کتنا خیال رکھتے ہیں، مگر سکّم کی صفائی ستھرائی نے تو ہمیں بھی حیران کر دیا۔لگا ہم پہلی دنیا کے کسی شہر یا انگلستان کے کسی قصبے میں جا پہنچے ہیں۔ ہمارا ڈرائیور مونی، جو خود ایک پہاڑی تھا، باگ ڈوگرا کے ہوائی اڈے سے ہمارے ساتھ تھا اور دارجلنگ کی ہر جگہ دکھانے پر مصر تھا؛ بلکہ خواہشمند تھا کہ ہم لوگ اس کے ساتھ اونچے پہاڑی راستہ سے کاٹھمنڈو تک ہو آئیں۔اس کا کہنا تھا کہ محض ایک دن میں اوپر ہی اوپر کاٹھمنڈو جا کر اگلے دن واپس آسکتے ہیں۔غالباً وہ بھی اصل پہاڑ دکھانا چاہتا تھا۔ہم نے پہاڑیوں کی سادگی سے فائدہ اٹھایا اور اُسے ''اگلی بار'' کے وعدے پر ٹالا۔سکّم کی راجدھانی، گینگٹوک نامی شہر کے حاشیہ پر پہنچتے ہی اس نے ایک بین ریاستی بس اڈے پر گاڑی روک دی۔اس کی آنکھ ڈبڈبائی ہوئی تھی۔بولا اس شہر میں باہر کی گاڑی نہیں جاسکتی، آپ کو یہاں کی چھوٹی گاڑی میں شہر کے اندر جانا ہوگا۔مونی کو دلاسہ دے کر ہم روانہ ہوئے، راستہ میں ہمارے ہوٹل کا بورڈ نظر آیا مگر ڈرائیور صاحب آگے بڑھتے ہی چلے گئے تو ہمیں شبہ ہوا کہ یہاں بھی سیاحوں کو ٹھگنے یا لوٹنے کی روایت نہ ہو۔میری بیوی کی خوش فہمی نے فوراً فہمائش کی کہ پہاڑی لوگ ایسے نہیں ہوتے؛ لیکن میرا شبہ اور بھی پختہ ہوگیا جب ڈرائیور صاحب نے ہوٹل سے نصف کیلومیٹر آگے جا کر گاڑی ایک نسبتاً تنگ سڑک کی طرف موڑ دی۔ چند قدم بڑھ کر انہوں نے انگریزی والا ''یوٹرن'' لیا اور واپس اسی سڑک پر چلے جس سے ہم آئے تھے۔اب یہ تو یقین ہوگیا کہ وہ ہمیں ہمارے ہوٹل کے علاوہ کہیں اور نہیں لے جارہے ہیں؛ سوچا لمبا چکر لگا کر شاید یہ زیادہ کرایہ وصول کرنے کی ترکیب ہو۔میں نے مسکرا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا کہ لو یہ بھی ہمارے میدانی ڈرائیوروں جیسے ہی نکلے۔آخر ہیں تو اسی ملک کے انسان! نصف کیلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے جب ہم ہوٹل پہنچے تو میں نے از راہِ تمسخر ڈرائیور سے آگے جا کر واپس لوٹنے کی وجہ پوچھی۔اس نے بتایا کہ سڑک کے بیچ چوڑی پیلی پٹی بنی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم وہاں سے گھوم کر دوسری طرف نہیں جاسکتے۔ٹریفک کا یہ نشان دہلی میں ہر بڑی سڑک پر ہوتا ہے جس کی پابندی صرف تب کی جاتی ہے جب ٹرافک پولس کا کوئی سپاہی وہاں موجود ہو۔چنانچہ ہم نے اسے مزید کریدا تو بولا، ٹرافک پولس کا سپاہی ہو یا نہ ہو، گینگٹوک میں کوئی قاعدہ قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتا؛ اگر کرے گا تو جرمانہ یقیناً ہوگا، یہاں تک کہ سڑک پر تھوکنے پر بھی جرمانہ ہوجاتا ہے۔میری بیوی کی مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی۔

صفائی اور نظم وضبط کی پابندی کا ہلکا سا اندازہ مجھے ہماچل میں بھی ہو چکا تھا۔ ایک بار نا ہن شہر کے چوگان پر میں اپنی سواری کا انتظار کر رہا تھا کہ مجھے استنجے کی حاجت محسوس ہوئی۔ سامنے چوگان کے دوسری طرف ہوٹل نظر آیا۔ میں نے ایک دکاندار سے کہا کہ میں ابھی دس منٹ میں واپس آتا ہوں تب تک وہ میرے سوٹ کیس کا خیال رکھے۔ دکاندار نے میری طرف غور سے دیکھا اور فخر سے بولا، یہ ہیم دیش ہے بابوجی! آپ ایک گھنٹہ بعد بھی آئیں گے تو سوٹ کیس وہیں سڑک کے کنارے رکھا ملے گا۔ ہماچل میں اب بھی ایسی جگہیں ہیں جہاں لوگ گھروں میں تالا نہیں لگاتے۔ اُن کی شکایت ہے کہ جب سے میدانی علاقے کے لوگوں کی آمد بڑھی ہیشہر میں چوری کے اکا دکا واقعات ہونے لگے ہیں۔ شملہ کی معیشت غریب کشمیری پٹھو پر بڑی حد تک منحصر ہے جو بار برداری کا کام کرتے ہیں۔ اسٹیشن پر سیاح اپنا سامان اُن کے حوالے کر کے ہوٹل کا پتہ بتا دیتے ہیں۔ کبھی سننے میں نہیں آیا کہ کسی کا سامان یا روپیہ گُم ہوا ہو۔ سو بیوی کی معنی خیز مسکراہٹ کو ٹال دینے میں ہی عافیت تھی۔ سکّم میں قانون کی پابندی ہماچل سے زیادہ ہی نظر آئی۔

ہوٹل سے تیار ہو کر باہر نکلے تو تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر ٹیکسی کو اس کی متعینہ جگہوں پر اس طرح سلیقہ سے کھڑی پایا کہ لندن کی یاد تازہ ہوگئی۔ ان میں دیسی آن بان کا فقدان تھا کہ گاڑی کو سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی کر کے دوسروں کو پہلے سواری لینے سے روک دیں۔ پھر یہ کہ کیرایہ بھی متعین تھا یعنی شہر میں کہیں جانا ہو سو روپے۔ سوچا ممکن ہے ڈرائیور حساب میں کمزور ہوتے ہوں، بعد میں پتہ چلا کہ اُن میں سے زیادہ تر گریجویٹ ہیں اور اپنی گاڑی خود چلاتے ہیں۔

ناتھولا، ہند چین کی سرحد ہے جہاں جانے کے لیے فوج پاس جاری کرتی ہے۔ پاسپورٹ سائز کا فوٹو درکار تھا۔ چنانچہ ایک دکان میں داخل ہوئے تو لہجہ سے اندازہ ہوا کہ دکاندار صاحب بہار کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے مطلع کیا کہ ہوٹل سمیت تمام کاروبار بہار، پنجاب اور راجستھان والوں کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے جاننا چاہا کہ کیا مقامی لوگ کاروبار میں دلچسپی نہیں لیتے تو دکاندار نے تمسخرانہ لہجہ میں کہا، ''یہاں کے لوگ بڑے بُربک (بمعنی سادہ لوح احمق) ہوتے ہیں۔ باہر کے لوگ ان کے ساتھ مل کر کام شروع کرتے ہیں، پھر رفتہ رفتہ مقامی انسان چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اِن بُربک لوگوں کی زیادہ دلچسپی گانے بجانے میں ہے''۔

ایسا ہی ایک بُربک ڈرائیور ہمیں ناتھولا لے گیا جو راستہ کے منظر سے خوش ہو کر گنگنانے لگتا اور ہم بار بار اسے سامنے دیکھنے کی تاکید کرتے جہاں بارش اور دھندھ کی وجہ سے سڑک بمشکل نظر آتی تھی۔ وہ بھی سیر کرانے کا

شوقین واقع ہوا تھا۔ دس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ کر اس نے گاڑی ایک شفاف جھیل کے کنارے روک دی اور بتایا کہ سردی میں پوری جھیل جم جاتی ہے جس پر بچے کھیلتے ہیں۔ ساتھ والا آبشار بھی اس طرح جم جاتا ہے جیسے کسی نے موتی پرو دی ہو۔ میں چشمِ تصور میں اس منظر کو سجانے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ میری بیوی نے اگلی بار سردی میں وہاں کی سیر کا اعلان کر دیا۔ مزید اوپر جاتے ہوئے میں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ سردی میں جب سیلانی نہیں آتے ہوں گے تو وہ کیا کام کرتا ہوگا، بولا ''آتے ہیں صاحب!'' میں نے قیاس لگا کر کہا کہ میدانی علاقہ کے لوگ تو شاید نہیں آتے ہوں گے، جواباً بولا ''آتے ہیں صاحب!'' میں نے حیرانی سے پوچھا، ''گاڑی کے اندر گرم کپڑوں میں بیٹھے رہنا تو ٹھیک ہے مگر اتنی سردی میں باہر کیسے جاتے ہوں گے؟'' کچھ دیر ہنستا رہا پھر بولا، ''باہر نکلتے ہی لوٹ جاتا ہے''۔ اُس کا مطلب تھا زمین پر گر جاتا ہے۔ واقعی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ اس لیے کہ ناتھولا میں گاڑی سے باہر نکلتے ہی بہت سے سیاح آکسیجن کی کمی سے ہانپ رہے تھے۔ ایک فوجی ان میں سے ہر ایک کو کشمش دے کر جلدی جلدی چبانے کو کہہ رہا تھا۔ اس نے ایک ایک مٹھی کشمش ہمیں بھی پکڑا دی اور میری بیوی کی طرف دیکھ کر بولا، ''ان کو پہلے سامنے والے ریستراں میں لے جا کر کافی پلا یئے''۔ سامنے دیکھا تو ایک سرے پر ''کیفے فورٹین تھاو؟ زنڈ فٹ'' (یعنی: کیفے چودہ ہزار فٹ) کا بورڈ لگا تھا، جس میں دروازہ کے پاس ایک فوجی کشمش سے بھرا کنستر لیے بیٹھا تھا اور زبردستی ہر ایک کو بانٹ رہا تھا۔ کشمش کی یہ خاصیت اور فوج کی یہ خدمت اُس سرحد پر ہی دیکھنے میں آئی۔ واگہ اور حسینی والا کی سرحدوں پر بھی قومی جذبہ جاگ اٹھتا ہے مگر ناتھولا ان سے الگ، ایک نئے تجربہ سے دو چار کرتا ہے۔

محض پندرہ فٹ اوپر سرحدی چوکی تھی۔ موسم بدستور خراب تھا اور مسلسل بارش ہو رہی تھی جس نے اس پندرہ فٹ کی چڑھائی کو مشکل بنا دیا تھا۔ بعض خواتین از راہِ فیشن، ساڑی پہن کر آئی تھیں اور اوپر چڑھنے کی کوشش میں اس طرح پھسلتی تھیں کہ نیچے کھائی میں گرنے کا خدشہ ہوتا۔ میری بیوی اس بات پر راضی ہوئیں کہ اگلی بار اگر موسم اچھا رہا تو وہ بقیہ پندرہ فٹ اوپر جا کر دیکھیں گی۔ واپسی پر ڈرائیور نے پھر دس ہزار فٹ کی بلندی والے اس جھیل کے پاس گاڑی روک دی جو سردی میں جم جاتی ہے۔ اس بار میری بیوی نے وہاں کی روئیدگی کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے ان کے نباتیاتی ناموں سے واقف کرانا شروع کیا اور بتایا کہ دس ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر درخت نہیں اُگتے؛ زمین پر صرف روئیدگی ہوتی ہے۔ بی ایس سی کے پہلے سال تک میں نے جو کچھ پڑھا تھا اسے بھلا دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، مگر میری بیوی بھولا ہوا سبق یاد دلانے پر مصر تھیں۔ انہوں نے یاد دلایا کہ دس ہزار فٹ سے نیچے دیودار اور چار ہزار فٹ سے نیچے چیڑ کے درخت پائے جاتے ہیں۔ اس سے بھی پہاڑ کے لوگ بلندی کا اندازہ

لگاتے ہیں۔ میری دلچسپی اس چھوٹی سی بستی اور اس کے بازار میں زیادہ تھی جو وہاں سے ذرا ہی نیچے تھی۔

بازار چینی سامان سے بھرا تھا۔ ایک چھوٹی سی دکان میں، ایک پیاری سی خوش مزاج لڑکی بئیر اور غیر ملکی شراب کے ساتھ خوردنی اشیا کے پیکٹ بھی بیچ رہی تھی۔ دکان کے اندر ایک معمر پہاڑی بار بار لڑکی سے شراب کے لیے خوشامد کر رہا تھا، مگر وہ انکار کر رہی تھی۔ وہ جیب سے روپیہ نکالتا مگر انکار پر واپس رکھ لیتا۔ تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ وہ کوئی شیر پا ہے جو تجارت کی غرض سے چین آتا جاتا رہتا ہے۔ اس نے بتایا کہ چین میں اس کی رشتہ داری بھی ہے۔ اس کی صحت کے پیش نظر لڑکی اسے مزید شراب پینے سے روک رہی تھی۔ واپسی پر وہ شیر پا صاحب ہمارا بل ادا کرنے پر مصر تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ان کو راضی کیا کہ اگلی بار جب ہم وہاں آئیں گے تو ان کی میزبانی کا لطف اٹھائیں گے۔

جون کی آمد ہو، اور یونیورسیٹی کی چھٹیاں شروع ہونے والی ہوں، تو میری بیوی کو میدانی علاقے کی دھول، گرمی اور آلودگی پر بڑا غصہ آتا ہے۔ کہتی ہیں تمہیں بسنے کے لیے دہلی سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ملی۔ گاڑی جیسے ہی انبالہ سے آگے بڑھتی ہے وہ پہاڑ کی خوشبو سے خود بھی محظوظ ہوتی ہیں اور مجھے بھی اس خوشبو کو محسوس کرنے دعوت دیتی ہیں۔ ایسا رُڑکی سے آگے نکلنے پر بھی ہوتا ہے۔ وہ کہتی ہیں وہ دیکھو! موہنڈ کے پہاڑ نظر آنے لگے، پہاڑ کی کیسی خوشبو پھیل رہی ہے۔ میں اپنی بصارت اور بصیرت پر شرمندہ ہونے کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں۔ ممکن ہے ان کو دہلی میں بھی ہمالیہ کی کوئی چوٹی دکھائی دے جاتی ہو۔ مگر اب تک انہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے ورنہ میرے پاس اپنی بینائی کی جانچ کرانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ ابتداء میں، میں نے یہ سمجھا کہ جو لڑکیاں کسی بھی شہر کی سڑکیں یاد نہیں رکھ پاتی ہیں وہ بھی میکے کا راستہ سونگھ کر بتا دیتی ہیں۔ سو میری بیوی کو انبالہ یا، رُڑکی سے نکلتے ہی محسوس ہونے والی پہاڑ کی خوشبو اسی عمل کے نتیجہ ہے۔ مرد، عام طور پر ایسی ہی خوش فہمیوں میں زندگی گزارتا ہے۔ چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ کر انہوں نے ایک اور جگہ کا پتہ بتایا جو سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہیا اور وہاں، بقول ان کے، انسان بھی آباد ہیں۔۔۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!

انشائیہ

ریٹائرمنٹ

محمد اسد اللہ (ناگپور)

موبائل : 9579591149

یہ وہ دلخراش واقعہ ہے جس کا مزہ ہر اس شخص کو چکھنا ہے جس نے کبھی ملازمت کے شعبے میں قدم رکھا ہو۔ ریٹائرمنٹ کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ عورت دیکھتا ہے نہ مرد، بے جھجک انسانی عمر کی پول کھول کر رکھ دیتا ہے۔ دورِ حاضر میں بے شمار عورتوں نے پردہ کرنا بھلے ہی چھوڑ دیا ہو، اظہارِ عشق اور اظہارِ عمر کے معاملے میں خواتین کی اخفائے حال کی روایت بہر حال برقرار ہے۔ ترقی کے اس زمانے میں خواتین نے مردوں کو کئی میدانوں میں پیچھے چھوڑ دیا ہے گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب ان میں بھی مردانگی کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں ،البتہ عمر چھپانے کے معاملے میں اکثر مرد بھی عورتوں کے شانہ بشانہ چل رہے ہیں۔ اپنی عمر گھٹا کر بتانے میں مرد بھی اب اسی مہارت کا ثبوت پیش کرتے ہیں جو عورتوں کا خاصہ ہے۔ اس کا ایک سبب شاید یہ ہے کہ اکثر مردوں میں بھی عورتانگی (نسوانیت) پائی جاتی ہے۔

ملازمت حاصل کرنے کے لئے ان دنوں خواتین اس قدر بے چین نظر آتی ہیں کہ اس راہ پر آگے بڑھنے میں ریٹائرمنٹ کا یہ خطرہ بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، حالانکہ انھیں پختہ یقین ہوتا ہے کہ ریٹائرمنٹ وہ گھر کا بھیدی ہے جو ان کی عمر کا پردہ فاش کر کے رہے گا۔ اکثر مرد و زن آخری کوشش کے طور پر اپنے ریٹائرمنٹ پر یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ اسکول میں ان کی عمر دو تین سال بڑھا کر بتائی گئی تھی۔ ان کے اس بیان کا آسان اور سلیس ترجمہ کسی شاعر نے پہلے ہی ان الفاظ میں کر رکھا ہے: ابھی تو میں جوان ہوں

بچوں کو پولیو کے ڈوز پلانا اور بوڑھوں کو ریٹائرمنٹ کی کڑوی گولی کھلانا، دراصل دونوں کی عمر کا تقاضا ہے۔ ملازمت میں لاکھ جھمیلے ہوں، اپنے اعضاو جوارح جواب دینے لگے ہوں تب بھی کوئی ملازم ریٹائرمنٹ کو بخوشی قبول نہیں کرتا۔ اس میں ہتکِ عزت کا خدشہ ہے، ایک ایسا خسارہ جس کے لئے آپ عدالت کا دروازہ بھی نہیں کھٹکھٹا سکتے۔ اپنے گھر لوٹنے کو سوا چارۂ کار نہیں۔ ہماری نظر میں ریٹائرمنٹ سے بہتر لفظ وظیفہ یاب ہونا ہے جس میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ اب یہ آدمی سوائے عبادات اور اوراد و وظائف کے کسی کام کا نہیں رہا

۔ریٹائرمنٹ ایک قسم کا اعلانِ شکست ہے۔اس کا شکار ہونے والا اکثر یہ کہتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں

ستم ظریفی دیکھئے کہ تمام عمر، دنیا بھر کا علم اور تجربہ حاصل کرنے کے بعد جب آدمی کسی قابل ہوتا ہے تو اسے سبک دوش کر دیا جاتا ہے۔ریٹائرمنٹ کے دکھ میں یقیناً یہ صدمہ بھی شامل ہوتا ہے کہ آنجناب کو تجربے کی کنگھی اس وقت دستیاب ہوئی جب سر سے سرگرمیوں کے سارے بال رفو چکر ہو گئے۔

ریٹائرمنٹ ایک ایسا طلسمی آئینہ ہے جس میں ملازم کو عمرِ رفتہ کا سراغ ملے نہ ملے، حالاتِ حاضرہ کا بیان ضرور ملتا ہے، جو اکثر ناگفتہ بہ ہوتے ہیں۔اس آئینے میں وہ اہلِ دنیا کو ایک نئے زاویے سے دیکھتا ہے اور حیران رہ جاتا ہے، یہ سوچ کر کہ آپ تو ایسے نہ تھے۔دورانِ ملازمت بھلا آدمی اپنے فرائض منصبی میں غرق رہا، یہ سفینۂ روزگار جب کنارے پر آ لگا تو اس پر انکشاف ہوا کہ اب وہ اس کشتی کا ناخدا نہیں رہا؛ بندۂ بے دام ہو کر رہ گیا ہے۔سبک دوشی کا یہ آئینہ اسے اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کی ترغیب دیتا ہے۔اسے اپنے آس پاس موجود لوگوں کی محبت یا محبت کا سوانگ اس شیشے میں صاف نظر آتا ہے۔

مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے کہ جس شخص نے کسی بیماری یا حادثے کے نتیجے میں ناکارہ ہو جانے کا یا ریٹائرمنٹ کا مزہ نہیں چکھا اس نے صحیح معنوں میں دنیا کو دیکھا ہی نہیں بلکہ وہ خود اپنے آپ سے بھی کبھی نہیں ملا۔یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی میگزین میں یا ٹی وی پر شیر کی تصویر یا وڈیو دیکھ کر کوئی خوش ہو لے کہ میں نے شیر دیکھ لیا۔ ذرا اسے دوبدو دیکھو تو پتہ چلے۔

آدمی کے اندر کیا کیا چلنے لگتا ہے۔زندگی کے اتنے قریب جانا کہ جذبات میں تلاطم برپا ہو جائے اور سانس اوپر تلے ہونے لگے، ایک الگ تجربہ ہے۔اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ ہم نہ صرف اپنے اندر چھپے ایک مختلف آدمی سے شرفِ ملاقات حاصل کر رہے ہیں بلکہ ہمارے باہر گھومتے پھرتے لوگوں کے اندر تک اتر کر دیکھنے لگے ہیں۔دنیا میں حادثات اور غیر متوقع حالات اسی لیے پیش آتے ہیں تاکہ حسینۂ زیست کے چہرے سے چند لمحوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو، نقاب اترے تو سہی۔کوئی شخص اس جہانِ فانی کو اچھی طرح سمجھنا چاہتا ہے تو اسے زندگی میں کم از کم ایک بار ضرور ریٹائر ہونا چاہیے۔کوئی کہے کہ میں کوئی ملازم ہوں جو اس سے سبک دوش ہو جاؤں تو ہماری مشورہ ہے اس کارِ خیر کے لیے چند ٹکوں کی چاکری کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ اس صورت میں آپ نہ صرف اس دنیا کا حقیقی چہرہ دیکھ سکیں گے، بلکہ اہلِ دنیا کا وہ روپ بھی آپ کو نظر آ جائے گا جسے عام حالت میں

''ارنی'' کہہ کر بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ تازہ تازہ ریٹائر ہونے والے لوگ اپنے سبک دوش ہونے کی خبر کے ساتھ یہ اطلاع ضرور دیتے ہیں کہ وہ جلد ہی کسی اچھی سی مصروفیت میں مبتلا ہونے والے ہیں، یعنی جلد یا بدیر کوئی ملازمت یا کام اختیار کر کے تلافیِ مافات کرنے والے ہیں۔ کوئی دکان لگا لیتا ہے، کوئی کسی اسکول، مدرسہ یا ٹیوشن کلاس میں تدریسی خدمات انجام دینے لگتا ہے۔ کچھ لوگ قران فہمی کی کلاس جوائن کرتے ہیں یا کسی فلاحی ادارے میں اپنے خدمات پیش کر دیتے ہیں، بعض کسی کمپنی میں کوئی ملازمت جوائین کر لیتے ہیں اور چند ایک تو سبک دوش ہونے سے پہلے ہی ان میں سے کوئی مشغلہ اپنے کاندھے اور اعصاب پر سوار کر لیتے ہیں۔ یہ دراصل سماج کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے کہ ملازمت سے ان کی علاحدگی، مشین کے کسی ناکارہ پرزے کو نکال پھینکنے کا واقعہ نہیں ہے، وہ اب بھی اتنے ہی فٹ ہیں۔ ملازمت کے دوران وہ کسی مورچے پر زندگی کی ایک جنگ میں شریک تھے اور ایک جانباز سپاہی کی طرح لڑتے رہے۔ اب جنگ بندی کے بعد ناکارہ سپاہی بن کر نہیں رہیں گے بلکہ ان کے لئے ایک نیا مورچہ تیار ہے۔ ان معاملات میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو چند ماہ یا چند برسوں تک مشغول رکھتے ہیں، اس کے بعد خود فریبی کا یہ طلسم خود بخود ٹوٹنے لگتا ہے۔ وہ شخص اپنے آپ کو دھیرے دھیرے یہ سمجھا لیتا ہے یا حالات اسے باور کروا دیتے ہیں کہ اب وہ اس علاقے میں داخل ہو چکا ہے جسے جغرافیہ کی اصطلاح میں 'ڈیلٹا' کہا جاتا ہے، سبک دوشی کے بعد کئے جانے والے اس سارے اہتمام کو آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں: زور کا جھٹکا دھیرے سے لگے۔

ملازمت سے سبک دوش ہونے والا اس تلخ حقیقت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا کہ ایک دن وہ اچانک ایک فضول سی چیز بن گیا ہے۔ وہ اپنے فرائضِ منصبی بڑی تندہی سے انجام دیتا رہا، اب اسے وہاں سے صرف اس لیے ہٹا دیا گیا کہ کارِ جہاں نے اس کے تن بدن میں دوڑتی بجلیاں چرالی ہیں، ماہ و سال کی گردش نے اس کے بالوں میں چاندی بھر دی ہے اور زندگی کے کٹھن سفر نے اس کے چہرے پر تھکن کا غازہ مل دیا ہے، حالانکہ اس کا دل تو اب بھی اسی طرح جوان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ریٹائر منٹ ملازمت نامی ایک سہانے سفر کی منزلِ نامراد ہے، یہ چلتی ٹرین کا پٹری سے اتر جانا ہے، آنکھ کھل جانے پر کسی اچھے خواب کا ٹوٹ جانا ہے، محبوب کا بے وفائی کر جانا ہے۔ ملازمت سے جڑی ہوئی سبک دوشی کہہ مکرنی نہیں تو اور کیا ہے۔

ریٹائرمنٹ کو اردو میں سبک دوشی شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اپنی سبک دوشی کی اطلاع دینے والا ہر

شخص اسے اعترافِ شکست مان کر ہتک محسوس کرتا ہے۔اس موقع پر پروین شاکر کا یہ شعر بے اختیار یاد آتا ہے۔

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

ریٹائرمنٹ سے کچھ پہلے میری ایک طالبہ نے جو اسی ادارے میں برسرِ روزگار تھی، مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ اس نے اس سال اردو کے بعد اب عربی میں بھی ایم اے کا امتحان پاس کر لیا ہے تو میں نے فخر محسوس کیا لیکن اس کے اگلے جملے نے میری وہ ساری خوشی چھین لی: 'سر اگلے سال آپ ریٹائر ہو رہے ہیں نا؟' گویا ریٹائرمنٹ اس کرسی کو خالی کرنا ہے جس پر کئی لوگ نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ وہ لوگ جنھیں ملازمت کے آخری ایام میں کرسی کاٹنے لگتی ہے ریٹائر ہو کر خوش ہوتے ہیں کہ چلو بلا ٹلی اور جنھیں اس کرسی کی محبت نے اپنے دونوں ہتھے پھیلا کر جکڑ لیا ہو وہ سبک دوش ہو کر بھی اپنے دل میں گرانی محسوس کرتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ دنیا کی بے ثباتی کو انڈرلائن کرنے کے لئے بنایا گیا قدرت کا ایک قانون ہے، یہ سمجھانے کے لیے کہ دنیا کی نعمتیں اور اقتدار اس فنا پذیری کے ساتھ مشروط ہیں جن کا اطلاق ہر ذی روح پر کسی نہ کسی دن ضرور ہوگا۔

سندھی کہانی : زیب سندھی _______________ ترجمہ: ننگر چنا

انقلاب

وہ انقلابی رہنما کی تقریر سے بھی متاثر ہوا تو اس کے قول و فعل سے بھی۔ اسے وہ انقلابی رہنما ہر لحاظ سے مخلص نظر آیا۔ اسے اس انقلابی رہنما کی تقریروں اور تحریروں سے پختہ یقین ہو گیا کہ اب انقلاب کو کوئی بھی روک نہیں سکتا۔ تب اس نے بہت سوچ سمجھ کر اس انقلابی رہنما کی پیروی کرنے کا فیصلہ کیا۔

انقلاب کی جدوجہد کے لیے فنڈ کی ضرورت پڑی تو اس نے اپنی کل جمع پونجی، چار ایکڑ زمین فروخت کر کے حاصل شدہ رقم انقلاب فنڈ میں جمع کرا دی۔

وہ انقلابی رہنما کے پیچھے چلتا رہا۔

مسلسل چلتا رہا۔ چلتا رہا......

وہ چل چل کر تھک گیا تو اس نے انقلابی رہنما کے پیچھے چلتے چلتے کہا: ''مَیں تھک چکا ہوں۔''

انقلابی رہنما نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر آگے بڑھتے ہوئے کہا: ''انقلابی کبھی نہیں تھکتے۔''

انقلابی رہنما کے جذبے نے اسے نئی طاقت عطا کر دی، اس کا حوصلہ بڑھایا۔

وہ انقلابی رہنما کے پیچھے چلتا رہا۔

مسلسل چلتا رہا۔ چلتا رہا......

نہ ختم ہونے والی مسافت......

مسلسل گزرتا ہوا وقت......

اس نے اپنے بدن کو کم زور ہوتا پایا۔ اس نے انقلابی رہنما کے پیچھے چلتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا: ''اب تو مَیں بہت تھک چکا ہوں۔''

انقلابی رہنما نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھے بغیر مسلسل آگے بڑھتے ہوئے کہا: ''انقلاب جہدِ مسلسل کا نام ہے۔''

وہ انقلابی رہنما کے مسلسل جدوجہد کے فلسفے کے مطابق اس کے پیچھے چلتا رہا۔

لگاتار چلتا رہا۔ چلتا رہا......

نہ ختم ہونے والی مسافت...

مسلسل گزرتا وقت...

وہ برسوں تک انقلابی رہنما کے پیچھے چلتا رہا۔اس نے اپنے آگے پیش قدمی کرتے ہوئے رہنما سے پوچھا:'' انقلاب آخر کب آئے گا؟''

انقلابی رہنما نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھے بغیر کہا:'' مجھے تیرے لہجے سے مایوسی جھلکتی محسوس ہوتی ہے، لیکن یاد رکھو! انقلابی کبھی مایوس نہیں ہوتے۔''

اس کا بدن کم زور ہوتا رہا لیکن انقلاب کی اُمید اسے آگے بڑھنے کی تحریک دیتی رہی۔

کئی برس گزر گئے لیکن وہ انقلاب کی اُمید لگائے، انقلابی رہنما کی پیروی کرتا ہوا مسلسل چلتا رہا۔

اس کے سیاہ بال سفید ہو گئے، لیکن وہ چلتا ہی رہا۔

مسلسل چلتا ہی رہا۔ چلتا رہا......

لامتناہی مسافت...... مسلسل گزرتا وقت......

اس کی آنکھوں کے آگے تاریکی چھانے لگی، اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ اچانک اندھیرا کیوں چھانے لگا ہے! اسے اپنے آگے چلنے والا انقلابی رہنما بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔اس نے اس اچانک تاریکی کا سبب جاننے کے لیے اپنے رہنما کو چیخ کر پکارا، لیکن انقلابی رہنما کی طرف سے کوئی بھی جواب نہیں ملا۔ وہ مسلسل چیخ چیخ کر اپنے انقلابی رہنما کو پکارتا رہا، لیکن کسی بھی پکار اور فریاد کا کہیں سے بھی جواب نہیں آیا۔ آگے صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اسے لگا کہ وہ انقلاب کی راہ میں کہیں کھو گیا ہے۔

وہ سوچتا رہا...... سوچتا رہا......

اس نے سوچ سوچ کر گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔

پیچھے اندھیرا تو تھا لیکن اتنا نہیں، کسی حد تک ہی سہی روشنی ضرور تھی...... اس نے جب حسرت بھری ٹھنڈی سانس لی تو اپنے اندر سے درد کی ٹیس اُٹھتی محسوس کی۔

اس نے پیچھے پلٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ جوں جوں پیچھے لوٹا توں توں مناظر واضح ہوتے چلے گئے۔

پیچھے لوٹتے ہوئے اسے سب سے پہلے وہ چار ایکڑ کھیت نظر آئے، جو اس نے بیچ کر رقم انقلاب فنڈ میں جمع کرائی تھی۔ یہ وہی چار ایکڑ زمین تھی جو اس کی کل جمع پونجی تھی، جو اس کے بچوں کی روزی روٹی کا وسیلہ تھی لیکن اب وہ اس کی ملکیت نہ رہی تھی۔

وہ ذرا پیچھے لوٹا، اسے وہ ہزاروں ایکڑ سرکاری زمین نظر آئی، جو کبھی غیر آباد اور ویران تھی، لیکن اب وہاں پھلوں سے لدے پھندے باغ اور سرسبز کھیتیاں تھیں۔ اس کے پاس اب اپنی چار ایکڑ زمین تو رہی نہ تھی، لہٰذا اس نے گزربسر کی خاطر اسی کھیت میں مزدوری کرنے کا سوچا اور اس نے کھیت میں کام کرتے ہوئے کسان سے زمین دار کا پتا پوچھا۔

وہ جب کسان کے بتائے ہوئے پتے پر باغ میں بنی محل نما بیٹھک پر پہنچا تو وہاں انقلابی رہنما کو زمین دار کے روپ میں دیکھا، رہنما نے اسے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا!

وہ غم زدہ ہو کر اوطاق سے نکل گیا۔ اسے یوں لگا کہ انقلاب کے نام پر نہ فقط اس کی چار ایکڑ زمین بلکہ سونے ایسی جوانی بھی لٹ چکی تھی!

وہ اور بھی کچھ پیچھے لوٹا تو اسے وہ مل نظر آئی جہاں وہ پانی کی عدم دست یابی کے ایام میں مزدوری کر کے بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ وہ وہاں مزدوری حاصل کرنے کی خاطر چلا گیا۔ مل مالک کے دفتر پہنچا تو وہی انقلابی رہنما سیٹھ کی صورت بیٹھا دکھائی دیا اور وہ پیشانی پر سلوٹیں ڈالے اسے گھور رہا تھا۔

وہ غم کا مارا دفتر سے نکل آیا۔ اسے لگا کہ انقلاب کے نام پر نہ صرف اس کے چار ایکڑ زمین بلکہ سونے ایسی جوانی اور بچوں کے مستقبل پر بھی ڈاکا ڈالا گیا ہے۔

وہ اپنے گھر کی طرف واپس جانے لگا۔

وہ اپنے گھر والی گلی میں پہنچا تو اس کا گھر جو پہلے قدرے بہتر حالت میں تھا، وہ اب ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ اس کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔

وہ اپنے گھر میں داخل ہوا تو اس کی نظر اپنی بیوی پر پڑی، جو پہلے بڑی صحت مند ہوا کرتی تھی لیکن اب ہڈیوں کے پنجر کی صورت چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔

وہ احساسِ ندامت کے ساتھ آگے بڑھا اور سر جھکا کر چارپائی کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔

اس کی بیوی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت ہی نحیف آواز میں پوچھا: ''انقلاب آ گیا؟''

اس نے شدتِ غم سے بے بس ہو کر بیوی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے اور اس کی بیوی کے ہاتھ پر جا گرے۔ اس نے کہا: ''انقلاب بِک گیا!'' اور پھر وہ کسی ایسے چھوٹے بچے کی طرح سسکیاں بھر کر رو پڑا جیسے کسی نے اس کے تمام کھلونے چھین لیے ہوں۔

زندگی

تم سمجھتے ہو
تبسم کی چاندنی ہے زندگی
جو میں سمجھوں تو زندگی غموں کی تیرگی بھی نہیں ہے
زندگی تو ماورائے قیاس
اک انوکھا تجربہ ہے!!!

جوشِ حریت

زندگی کو
منصوبوں کے شکنجے میں کس کے
آدرشوں کی رسیوں سے باندھ کر
سفر طے کرتا ہوں میں......
پھر حیرت انگیز طور پر یوں ہو جاتا ہے
میں بار بار اپنے منصوبوں کے برعکس
ساری رسیاں کاٹ کر
نامانوس راستوں پر دوڑنے لگتا ہوں......!!

میرا منشور

مجھے پسند نہیں
علم وفضل کا دکھاوا کروں
مجھے رغبت نہیں
نئے تجربوں کی سرکس سے
سینکڑوں اہل قلم ہوں گے انہیں
ان کو اپنا راستہ مبارک ہو......!
جو ناانصافی پر احتجاج کرے
جو ظلم کے خلاف کرے بلند علم بغاوت
میں ایسے ہی شاعر کو کرتا ہوں سلام......!!
جو حرف وہنر کے چشِ ماق سے
کہکشاں تخلیق کرے
ایسے شاعر کا کرتا ہوں میں احترام......!!

"لوگ ہی رستہ ہو گے"

لوگ رستے پر حق جتانے لگے
کرنے لگے جھگڑا
اسی لیے وہ اترے رستے پر۔
ہر
دایاں رستہ، بایاں رستہ، درمیانی رستہ
موڑ موڑ کا رستہ
اگلے نے کیا رستہ جام
پچھلے ہیں دھکم دھکے میں
جنھیں نہیں ملا تھا اب تک رستہ
انھیں بھی مل گیا رستہ
وہ بھی ہیں رستے پر اب
چلتے ہوے رستہ
گر رہے ہیں، کرا رہے ہیں لوگ
دھول کے شعلے ہیں رستے پر
لوگ رستے پر ہیں۔
دل میں دکھی رستہ
تراشے ہوے اس کے
مٹ رہیہیں نقش پا عظیم لوگوں کے
ڈاب خون کے رستے پر ہیں۔

لوگ اب
نہیں جاتے دیکھ کر رستہ
نہیں ضرورت انھیں اب رستے کی
چلتے ہیں دیکھ کر لوگوں کی طرف
کیونکہ اب لوگ ہی رستہ ہو گے ہیں
اب لوگ ہی رستہ ہو گے ہیں۔

انتباہ

مکاں کے میرے دیواروں کو بھی اب تک کے
عظیم رہنماؤں کی تصویروں نے
لیا ہے گھیر۔/ جگہ تھوڑی سی جو تھی وہ
لے لی جیوتی با کی تصویر نے
اس انتباہ کے ذریعہ
آیندہ ہونے والے سبھی
عظیم رہنماؤں کو کیا جاتا ہے مطلع کہ
شروع کی ہے میں نے نیے مکان کی تعمیر
ہوں گی اس نیے مکان کی دیواروں میں وسعت اتنی کہ
اگلے پانچ ہزار برسوں میں ہونے والے عظیم
رہنماؤں کو ہوں گی کافی اتنی جگہ ہے اس میں
اس لے برائے مہربانی
تعمیر تک میرے نیے مکان کی
کوی رہنماء نہ بنے
کوی عظیم نہ بنے۔

مراٹھی نظمیں : لوک ناتھ یشونت _____________ مترجم : معین الدین عثمانی

ہو گیا فساد سکون سے

کشیدہ ہے ماحول پھر بھی پوری طرح قابو میں
ہے حالات/ ہوا حملہ
اور گروہ پر لاٹھی چارج بھی
نہ ہو سکا ممکن آنسو گیس تب کرنا پڑی فائرنگ
بے قابو ہونے پر حالات بلانا پڑا فوج کو
دیا گیا حکم دیکھتے ہی مارنے کا گولی
آخر کرفیو میں دی گئی تھوڑی ڈھیل۔
علاوہ کچھ اکا دکا غیر متوقع واردات کے
حالات ہیں پر سکون۔
نکالی امن کی ریلی مذہبی رہنماؤں نے
سرکار نے لٹائی خیرات فساد گزیدوں میں۔
حالات آ رہے ہیں اب معمول پر
اور سدھر رہی ہے حیات
شہر کے کچھ حصوں میں چاقو گھونپنے کے
ہوئے پچاسوں معاملات پھر بھی
پوری طرح قابو میں ہیں حالات
ہو گئے فرار موٹر گاڑیوں والے مقام پر محفوظ
اور ہوئے ہلاک گولی باری میں بھکاری و
ٹھیلہ بردار۔

نفیسہ

یہ سن کر اچھا لگا
نفیسہ! تم اس پرانے مذہبی و تہذیبی علاقے کو
چھوڑ کر جا رہی ہو
کہ اس عبادت گاہوں کے شہر میں تمہیں اور
تکلیف ہوئی ہوتی۔
چاہ کر بھی میں نہیں آ سکتا ساتھ تمہارے
کیا بتاؤں تمہیں تکلیف میری
کہانی وہی پرانی۔۔ وزیر نے بادشاہ کو لوٹا۔
اس لیے شہر میں حیران مت ہونا نفیسہ
کہتا ہوں تمہیں جو غور سے سننا
بھول جاؤ اگر رستہ شہر میں، تو نہیں گھبرانا
اس لیے کہ ملتا ہے وہاں کا ہر چھوٹا رستہ بڑی
شاہراہ سے۔
نہ کرنا یقین
وہاں کے انسانوں کے کہے کسی بھی فلسفے پر
کہ یہ فلسفے محض کہنے کے لیے ہیں'
ہر کوئی سہولت سے اپنی
فلسفہ اپنا اپنا بنا کر جیتا ہے۔

مراٹھی نظمیں : لوک ناتھ یشونت

مترجم : معین الدین عثمانی

تمہارے خوب صورت جسم، کجرای آنکھیں اور ہونٹوں پر نفیسہ
کریں گے جھک کر سلام مذہبی ٹھیکیدار وہاں کے
مگر رہنا خبردار نفیسہ
یہاں کی طرح وہاں بھی چلن ہے دوطرح کے دانتوں کا۔

شہر کے دروازے پر میناروں سے مؤذن کی
لمبی اونچی آواز جب آئے تو ہی بڑھنا آگے
مگر نہ ہونا شامل لوگوں میں وہاں کے
ورنہ تیری بھی حالت ہوگی اس شہر کی سی۔

کرنا آرام اگر تھک جاؤ تو اس عرفانی برگد تلے
کچھ عرصہ تک اس پتھر کے علاقے میں، میں نفیسہ
کر رہا ہوں کوشش گوشت پوست کی زندہ مورتیاں بنانے کی۔

ہندی نظمیں : رنجیت ورما

مترجم : حِنا زریں

عصری ہندی شاعری میں رنجیت ورما ایک معتبر نام ہے۔ ان کے اب تک تین شعری مجموعہ ''پیچھے نہ چھوڑتے نشان''''ایک چپ کے ساتھ'' اور'' لکیر کہیں ایک کھینچنی ہوگی آپ کو'' شائع ہوکر مقبول ہوئے ہیں۔ انہیں ہندی شاعری میں گراں قدر تعاون کے لئے کئی انعمات سے نوازا جاچکا ہے۔

خاموشی

خاموشی میں ایک طاقت ہے
اور قربت بھی
جیسے محبت میں ہے
جیسے رحم اور جذبے میں ہے
جیسے معافی میں ہے
خاموشی میں ڈوبے رہنا
چپ رہنا نہیں ہے
نہ یہ ذمہ داری سے بچنے کی
کوئی ترکیب ہے
یہ اپنا پتا نہ کھولنے جیسا
کوئی کھیل نہیں ہے
یہ اظہار خیال کے بعد کا
گہرا سناٹا ہے
کسی بھی کاروائی میں اترنے کے پہلے کا
یہ سب سے اہم لمحہ ہے

تبصرے

[تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں بھیجنا لازمی ہیں۔منتخب تفصیلات پر ہی تبصرے شائع کئے جائیں گے۔ادارہ]

نام کتاب : **سفیر انشائیہ محمد اسداللہ**

مرتب : آسیہ طلعت مبصر : **ڈاکٹر رؤف خیر**

صفحات : 432 قیمت : 256 روپئے

ناشر : الفاظ پبلی کیشنز۔ پھٹانا اولی۔کامٹی ناگپور 441001

انشائیہ کو سر دھڑ کی بازی لگا کر فروغ دینے والے ڈاکٹر وزیر آغا نے فرمایا کہ بھارت میں تین انشائیہ نگار ہیں احمد جمال پاشاہ۔ رام لعل نا بھوی اور محمد اسداللہ مذکورہ قلم کاروں میں سے دو حضرات اللہ کو پیارے ہوگئے۔ آسیہ طلعت نے تیسری اہم شخصیت اسداللہ کے فکر و فن کا بھر پور جائزہ لیتے ہوئے انھیں سفیر انشائیہ قرار دیا۔ ڈاکٹر اسداللہ نہ صرف خود انشائیے لکھتے ہیں بلکہ انشائیہ نگاروں کی انشائیہ نگاری پر دادِ تحقیق بھی دیتے ہیں۔ مشرق و مغرب میں اس صنف سے دل چسپی رکھنے والوں کی نگارشات کے حوالے سے محمد اسداللہ نے پی ایچ ڈی بھی کر رکھی ہے۔ان کا یہ تحقیقی مقالہ 2015 میں منظر عام پر آیا۔ آسیہ طلعت نے بھی ناگپور یونیورسٹی سے ایم۔ اے (اردو) کیا ہے اگر 432 صفحات پر پھیلا ہوا ''سفیر انشائیہ'' کسی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے موضوع کی رعایت سے جمع کروا دیا جاتا تو عین ممکن تھا کہ آسیہ طلعت بھی ڈاکٹریٹ کی مستحق قرار دی جاتیں۔ اسداللہ کے فکر و فن پر اس مقالے میں کافی دادِ تحقیق دی گئی ہے۔اس مقالے کے پہلے باب میں نہ صرف ڈاکٹر اسداللہ کے انشائیے اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے بلکہ ان کے بارے میں مختلف مشاہیر کے ارشاداتِ عالیہ بھی جمع کر دیے گئے ہیں۔اسداللہ سے لیے گئے دو انٹرویو بھی اس کتاب کی زینت ہیں۔

دوسرے باب میں اسد اللہ کے نمائندہ انشائیوں پر مشاہیر کی آراء بھی حاصل کی گئی ہیں۔ انشائیہ ''بوڑھے کے رول میں'' پر ڈاکٹر وزیر آغا، احمد جمال شاہ، جمیل آزر، رام لعل نا بھوی، تسلیم احمد تصور کے مضامین اسد اللہ کے لیے اعزاز سے کم نہیں۔ تیسرے باب میں انشائیہ ''پر پرزے'' پر مشہور قلم کار یوسف ناظم کی رائے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ اسداللہ کی کتاب ''پیکر اور پرچھائیاں'' پر ڈاکٹر یحییٰ نشیط نے پر مغز تجزیہ کیا ہے اور ''انشائیہ کی روایت'' کو ڈاکٹر انور سدید، مناظر عاشق ہرگانوی، سلیم آغا قزلباش، معین الدین عثمانی وغیرہ نے خوب سراہا ہے۔

اس کتاب کے چوتھے باب میں مرتبہ آسیہ طلعت نے ڈاکٹر اسداللہ کی تدوینی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اسداللہ نے ناگپور میں ڈرامے پر ورک شاپ بھی کیا اور اردو کے ساتھ ساتھ مرہٹی ڈراموں کو ترتیب دے کر دونوں زبانوں کے ڈرامائی ادب کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔

یہ ہے انشائیہ اور انشائیہ شناسی کے عنوانات سے ڈاکٹر اسداللہ نے ہندو پاک کے 105 ایک سو پانچ مشہور و معروف اردو میں انشائیہ نگاروں کی فہرست ترتیب دی اور اڑتیس انشائی مجموعوں کی تفصیل سنہ اشاعت کے ساتھ پیش کی اس کے علاوہ اسداللہ نے طلبہ و طالبات میں ادبی سائنسی و مذہبی جنرل معلومات پر مبنی کوئز Quiz کا سلسلہ بھی قائم کیا تا کہ نئی نسل کی بہتر تربیت ہو سکے اور وہ زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کے قابل ہو جائیں۔ کوئز کا یہ سلسلہ کافی مقبول ہوا۔ ادارۂ شمع دہلی سے شائع ہوئے والے بچوں کے مقبول عام رسالے ''کھلونا'' کا ایک انتخاب شائع کر کے ڈاکٹر اسداللہ نے کارنامہ انجام دیا۔ مشہور و معروف ادیب شاعر کھلونا میں بچوں کے لیے شوق سے لکھا کرتے تھے کیوں کہ کھلونا کے قلم کاروں کو ان کی کاوشوں کا معاوضہ بھی دیا جاتا تھا۔ ان تمام تخلیقات کا انتخاب ادب کا سرمایہ شمار ہوتا ہے کیوں کہ کھلونا رسالہ تو بند ہو گیا۔

اسداللہ کا ایک اور اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے مرہٹی میں لکھی ہوئی بعض کہانیاں اور مزاحیہ مضامین اور انشائیوں کا اردو میں جمالِ ہم نشیں کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ مرہٹی ڈراموں کو بھی ''دانت ہمارے ہونٹ تمھارے'' کے عنوان سے اردو میں منتقل کیا۔

مختصر یہ کہ آسیہ طلعت نے ڈاکٹر محمد اسداللہ کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔ اس طرح ''سفیر انشائیہ محمد سداللہ'' ہر اعتبار سے ایک بھرپور شاہ کار ہے۔ جس پر کسی بھی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند مرتبہ کو پیش کی جاسکتی ہے یہ کتاب ایک ایسا سکّہ ہے جس کی ایک جانب اسداللہ کی تصویر کندہ ہے تو دوسری جانب آسیہ طلعت جلوہ افروز ہے۔

نام کتاب : **انشائیہ ایک خوابِ پریشاں**

مصنف : محمد اسداللہ مبصر : **ڈاکٹر رؤف خیر**

صفحات : 224 قیمت : 141 روپئے

ملنے کا پتہ : اسداللہ۔ 30 گلستان کالونی جعفر نگر ناگپور 440013

ہمارے خیال میں کتاب کا عنوان ''انشائیہ۔ اک خوابِ پریشاں'' ہونا چاہیے ایک عددی تحدید کا غماز Specific ہے جب کہ (اک) میں زبان کی چاشنی ہے اس باریک فرق کو اگر کوئی سمجھ لے تو انشائیہ کی تعریف

سمجھنے میں اُسے آسانی ہو جائے گی۔ ایک اور اک کا امتیاز بہ جائے خود اک انشائیے کی بنیاد بن سکتا ہے۔

بے شمار تشریحات و تعریفات Definitions کے باوجود انشائیہ اک خیال گنجلک ہی محسوس ہوتا ہے۔ میرے قلم کی توانائی ایک اور اک کے مابین پردہ اٹھانے ہی میں صرف ہو جائے گی جس طرح ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے دوسو چوبیس صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مشرقی و مغربی ادب کے قلم کاروں کی صاحب نظری کے حوالے سے ایسے Define کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں بڑے دل چسپ انکشافات پائے جاتے ہیں۔ انگریزی میں انشائیہ کی کوئی حتمی تعریف موجود نہیں (صفحہ 26) اس کے سرورق Title پر ہی ایک بے برگ و بار شجر کے دامن میں لکھا ہے:

After Dinner Monologue جارج سینٹ بری کے انشائیہ کے تعلق سے اس قول کا سیدھی سادی اردو میں ترجمہ کیا جائے تو وہ ہوگا ''پیٹ بھری باتیں'' اس قسم کی گپ شپ کا نام انشائیہ دے دیا گیا ہے۔ سرورق ہی پر انشائیہ پر جانسن Johnson کی رائے A loose Sally of Mind درج ہے گویا انشائیہ بے ربط ذہنی ترنگ کا نام ہے عموماً۔ یہی تعریف مقبول خاص و عام ہے۔ ہمارے خیال میں طنزیہ و مزاحیہ مضمون کسی نظم کی طرح ایک عنوان کے تحت مربوط و منظم انداز میں لکھا جاتا ہے جب کہ آج کے انشائیے میں ذہنی ترنگ غیر طرحی غزل کے اشعار کی طرح غیر مرتب ہوتی ہے۔ جس کا ہر شعر ایک الگ صوفیانہ، فلسفیانہ یا رندانا انداز، رومانی طرز اظہار سے عبارت ہوتا ہے ورنہ سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، خواجہ حسن نظامی کے انشائیے بھی عنوان سے ذہنی مطابقت رکھتے ہیں اور ذہنی مصالحت کے طالب بھی ہوتے ہیں۔ سرسید بے جا بحث و تکرار نہیں کرتے، محمد حسین آزاد خواہ مخواہ نیرنگ خیال کے جلوے نہیں دکھاتے اور نہ خواجہ حسن نظامی دیا سلائی سے لالٹین روشن کر کے مچھر کا جائزہ لیتے۔

ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے مشرق و مغرب میں انشائیہ کی روایت ہی پر دادِ تحقیق دی ہے اس لیے انھوں نے اس کتاب میں بھی انشائیے کے تعلق سے کئی مشاہیر کی آراء درج کی ہیں جن سے قاری کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ ''مشہور تنقید نگار سید احتشام حسین انشائیے کی کسی قطعی تعریف ہی کے قائل نہیں ہیں''۔

جناب اختر اورینوی انشائیہ کو ایک ایسی صوفیت قرار دیتے ہیں جس میں مزاح کا نمک ملا دیا جائے۔ عبدالماجد دریا آبادی کے نزدیک عبارت آرائی اور حسن بیان انشا پردازی کا مطمحِ نظر رہا ہے۔ اس میں انشائیے کی تعریف بھلا کہاں پیدا ہوئی؟ کلیم الدین احمد فرماتے ہیں انشائیہ کوئی صنف ہی نہیں، یہ وہی صنف ہے جسے انگریزی میں ایسے Essay کہتے ہیں۔

مگر اسد اللہ انشائیہ کو ایسے ،طنزیہ و مزاحیہ مضامین سے الگ صنف مانتے ہیں اسی لیے انھوں نے اپنی کتاب ''ڈبل رول'' میں اپنے طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور انشائیے الگ الگ باب کے تحت بیان کیے ہیں۔

سر سید احمد خاں نے 1870 میں ''تہذیب الاخلاق'' رسالہ جاری کیا اس میں انھوں نے انگریزی ادب کے تتبع میں اردو ادب میں بڑے کامیاب ایسے لکھے جیسے بحث و تکرار وغیرہ محمد حسین آزاد نے نیرنگ خیال میں اعتراف کیا کہ انگریزی ادب سے متاثر ہوکر ہی انھوں نے ایسے لکھے اسی طرح ذکاء اللہ نے بھی ایسے لکھے۔ یہ ایسے Essays انشائیے سمجھے گئے۔ ملا وجہی کی سب رس میں شمع، زلف، رخسار وغیرہ پر جو خامہ فرسائی کی گئی اسے بھی انشائیوں کا نام دیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے غبارِ خاطر میں چائے، چڑا چڑیا پر جو فلسفیانہ موشگافیاں کی ہیں انھیں بھی انشائیے کی مثال سمجھا گیا مگر ڈاکٹر محمد اسد اللہ انھیں انشائیے نہیں قرار دیتے۔ وزیر آغا کے خیال میں انشائیہ وہ ہے جب انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں ہر چیز اپنے مدار پر گردش کرتی ہے۔ مدار سے قدم باہر نکال کر دوسرے کے مدار میں دخل اندازی ہنگامے کا سبب ہو جائے گی بہت ممکن ہے قیامت آ جائے۔

مغرب میں انشائیہ کی روایت کے سلسلے میں ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے کئی انشائیہ نگاروں کا ذکر کیا ہے جیسے مانتین ،بیکن ،ابراہام کاولے، رچرڈ سٹیل، جوزف آڈیسن، جوناتھن سوئفٹ، گولڈ سمتھ ،چارلس لیمب ،ولیم ہزلٹ، تھامس ڈی کوئنسی ، ہنری تھوریو، اسٹیونسن ، اے جی گارڈنر، لوکس، بیلاک، چسٹرٹن، بیر بھوم، رابرٹ لنڈ، ورجینا وولف۔ مذکورہ قلم کاروں کے ایسے Essays کو انشائیوں کا نام دے دیا گیا۔

اسی طرح سر سید اور ان کے رفقا محمد حسن آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک وغیرہ کے مضامین کا ذکر کرتے ہوئے کتاب میں عنوان لگایا گیا ہے: ''عہد سر سید میں انشائیہ نگاری'' حالاں کہ مذکورہ اکابرین کے ایسوں کو انشائیے ماننے میں اسد اللہ خاں کو تامل ہے۔ کرشن چندر کی شاعرانہ نثر کو بھی انشائیے سے کوئی علاقہ نہیں۔ وزیر آغا نے اپنے رسالے ''اوراق'' کے ذریعے انشایے کے فروغ کے لیے بہت زور لگایا۔ غلام جیلانی اصغر، انور سدید، جمیل آذر، وغیرہ نے وزیر آغا کی ہم نوائی کی۔

کتاب کے آخری حصے میں محمد اسد اللہ سے لیے گئے انٹرویوز شامل ہیں جن کی روشنی میں محمد اسد اللہ اور انشایے کو سمجھنے میں قاری کو مدد مل سکتی ہے۔ ڈاکٹر اسد اللہ کا خیال ہے کہ بھارت میں چوں کہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہی کو انشائیہ سمجھ لیا جاتا ہے، اس لیے یہاں انشائیہ کا مستقبل غیر یقینی ہے۔

انشائی مجموعے کے باب میں ایسے کئی مجموعوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جن میں بعض طنز و مزاح کے لکھنے والوں کی تخلیقات بھی انشائیہ کے نام سے شائع کی گئی ہیں۔ بہر حال کتاب اسم با مسمیٰ ہے۔

نام کتاب : **اقبال کے فکر وفن کا گراف**

مصنف : ڈاکٹر رؤف خیر مبصر : **سلیم انصاری** (جبلپور)

صفحات : 236 قیمت : 300 روپے

ملنے کا پتہ : ڈاکٹر رؤف خیر موتی محل، گولکنڈہ، حیدرآباد

مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔٦

ڈاکٹر رؤف خیر بیک وقت شاعر، محقق اور نقاد ہیں اور ایک عرصہ سے تصنیف و تخلیق کے کام میں مصروف ہیں۔ اب تک ان کی ڈیڑھ درجن کتابیں منظرِ عام پر آکر ناقدینِ شعرو ادب سے خراج وصول کر چکی ہیں، جن میں شعری مجموعوں کے علاوہ تنقیدی اور تحقیقی کتابیں شامل ہیں ۔انہوں نے اقبال کے فکر وفن اور شخصیت کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور ان کے یہاں شخصی اور فکری سطح پر موجود تضادات کی نشاندہی بھی کی ہے جس کے حوالے گزشتہ دنوں اقبال کے تعلق سے آنے والی ان کی کتابوں اور مضامین میں تلاش کئے جا سکتے ہیں اور جو ادب کے سنجیدہ قارئین کے لئے اہمیت اور افادیت کے حامل ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب ''اقبال کے فکر وفن کا گراف'' ڈاکٹر رؤف خیر کی تازہ تصنیف ہے جس میں انہوں نے اقبال کے فکر وفن اور شخصیت کے تعلق سے ڈیڑھ درجن سے زائد مضامین شامل کئے ہیں اور ان میں کچھ مضامین اپنی نوعیت اور انکشافات کے اعتبار سے نئے ہیں جو اقبال کے فکر وفن اور ان کی شخصیت کے حوالے سے از سرِ نو بحث کے دروازے کھول سکتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجھک نہیں کہ ڈاکٹر رؤف خیر نے اس کتاب میں شامل مضامین میں اقبال کا مطالعہ نہایت سنجیدگی اور غیر جانبداری سے کیا ہے اور اقبال کے بارے میں مشہور بہت ساری باتوں اور واقعات کو اپنے تجزیاتی مطالعے اور دلائل کی روشنی میں رد کیا ہے۔ مثال کے طور پر اپنی نظم ''رموزِ بے خودی'' میں اقبال نے اورنگ زیب عالم گیر کو صاحبِ کردار بنا کر پیش کیا، اقبال کے مطابق اورنگ زیب کی ذات سے اسلام کا پایہ بلند ہوا ہے اور جو شرعِ پیغمبر کے احترام میں پیش پیش رہا ہے، ان کے بعد تو کفر و نفاق کے لئے میدان ہی صاف ہو گیا۔ اسی طرح اپنے مضمون ''ٹیپو سلطان اور اقبال'' میں ڈاکٹر رؤف خیر نے بتایا ہے کہ اقبال کو ٹیپو سلطان سے بڑی عقیدت تھی۔ جنوری ١٩٢٩ میں میسور یونیورسٹی کی دعوت پر لیکچر دینے پہنچے اقبال نے اگلے روز ہی

ٹیپو سلطان کی قبر پر حاضری دی اور بہت دیر تک مزار پر مراقبہ اور گریہ زاری کرتے رہے، یہ واقعہ مصنف نے میسور کے سلیم تمنائی کی کتاب ''دانائے راز دیارِ دکن میں'' کے حوالے سے نقل کیا ہے، دراصل بتانا مقصود یہ ہے کہ اقبال مزاروں پر منت اور حاضری کے قائل تھے جس کا اعتراف علامہ اقبال نے خود بھی اپنے متعدد خطوط میں کیا ہے کہ ۱۹۳۴ میں اپنے بیٹے جاوید اقبال کو لے کر منت پوری کرنے کی غرض سے وہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے مزار پر حاضر ہوئے تھے۔

کتاب میں شامل اپنے مضمون ''جرمن خواتین کے محبوب اقبال'' میں مصنف نے اقبال کی بشری کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں ایما ویگے ناسٹ کا خصوصی ذکر ہے جو اقبال کی جرمن زبان کی معلّمہ بھی تھی اور ان سے اقبال کی قربت بھی ہو گئی تھی جس کا اندازہ اقبال کے ان خطوط سے ہوتا ہے جو ایما ویگے ناسٹ کے پاس محفوظ تھے، اس کے علاوہ بھی کئی خواتین کا ذکر ہے جن سے اقبال کی قربت رہی تھی ان میں انا میری '' شمل'' اور عطیہ بیگم خصوصی طور پہ قابلِ ذکر ہیں۔ اپنے مضمون ''علامہ اقبال کی ڈائری کے چند اندراجات'' میں ڈاکٹر رؤف خیر نے اقبال کی اس فکری نہج کی طرف اشارہ کیا ہے جس کے سبب اقبال نے مشرق و مغرب کے تمام مفکرین کی فراست کو مومن کا کھویا ہوا خزانہ سمجھ کر نہ صرف قبول کر لیا بلکہ بعض مفکرین کے نظریات کو اشعار کی صورت میں بھی پیش کیا ہے۔ ''علامہ اقبال کے کردار کے چند پہلو'' میں مصنف نے اقبال کی شخصیت کے کئی مثبت اور منفی پہلوؤں کا ذکر مستند حوالوں اور ثبوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر حاکمِ بھوپال نواب حمید اللہ خاں سے اقبال ماہانہ پانچ سو روپے کی پینشن تو قبول کر لیتے ہیں مگر ہز ہائی نس آغا خان کے ممکنہ اور مجوزہ وظیفے کی قبولیت سے انکار کر دیتے ہیں۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ڈاکٹر رؤف خیر کے یہاں اقبال کی شخصیت اور فکر میں تضادات کے مطالعے کا عمل مخلص ہے اس حوالے سے ان کے کئی مضامین میں واضح اشارے ملتے ہیں، ان کا ایک مضمون ''اقبال کے تضادات'' جھارکھنڈ کے ایک رسالے عالمی فلک میں شائع بھی ہوا ہے جس میں انہوں نے اقبال کے اس تضاد کا ذکر کیا ہے کہ ابتدا میں خواجہ حافظ شیرازی کے تعلق سے اچھی رائے نہیں رکھتے تھے اور حافظ کے فکر و فن سے قوم کو دور رکھنا چاہتے تھے مگر عطیہ فیضی سے اقبال فرماتے ہیں کہ جب میرا ذوق جوش پر آتا ہے تو حافظ کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں۔ جسٹس جاوید اقبال کی کتاب ''اپنا گریباں چاک'' کے حوالے سے ڈاکٹر رؤف خیر نے لکھا ہے کہ مولانا شبلی کی طرح اقبال بھی بنکوں کے منافع کو سود کے زمرے میں نہیں

لاتے تھے حالانکہ اللہ نے ہر قسم کے سود کو حرام قرار دیا ہے۔اسی طرح ایک اور تضاد کا ذکر ہے کہ اقبال کے خیال میں انسان موت کے بعد اگر چاہے تو حیات کا تسلسل ختم کر کے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو سکتا ہے،ایسی روحانی خودکشی کا اسے اختیار ہے، حالانکہ جس دین میں جسمانی خودکشی کی اجازت نہ ہو وہاں روحانی خودکشی کے فلسفے کا کیا جواز ہو سکتا ہے،اسی طرح کے اور بھی تضادات کی نشاندہی ڈاکٹر رؤف خیر نے منطقی بنیاد پر کی ہے جو اقبال کے عقیدت مندوں کے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔

اپنے مضمون ''غالب اور اقبال'' میں مصنف نے غالب اور اقبال کے درمیان مشترک قدروں کی نشاندہی کی ہے، مثال کے طور پر غالب اور اقبال دونوں کو تصوف سے شغف تھا، دونوں کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا، دونوں نے امرا اور نوابوں کی شان میں قصیدے لکھے۔یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اقبال کو غالب سے بڑی عقیدت تھی اور وہ ان کی بڑائی، عظمت اور انفرادیت کے قائل تھے،اور اپنی اس عقیدت کا اظہار بھی اقبال نے اپنی نظم ''مرزا غالب'' میں کیا ہے،اس کے علاوہ ''جاوید نامہ'' میں بھی غالب کی شمولیت خصوصی طور پر کی گئی ہے۔ غالب کی طرح قرۃ العین طاہرہ سے بھی اقبال کو عقیدت رہی ہے،جس کی نشاندہی ڈاکٹر رؤف خیر نے اپنے ایک مضمون میں کی ہے،ان کے مطابق اقبال کو قرۃ العین طاہرہ کی ذات میں شاہین جیسی صفات محسوس ہوتی تھیں ،اپنے فکر و فلسفہ اور منطق کے ذریعہ اس دور کے روایتی اور فرسودہ عقائد کے خلاف اس کے نبرد آزما ہونے کے جذبے نے اقبال کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔

ڈاکٹر رؤف خیر نے اپنی اس کتاب میں بڑی غیر جانبداری اور سنجیدگی سے اقبال کی شخصیت اور فکر و فن کا مطالعہ کیا ہے اور اس حوالے سے بہت ساری معلومات جمع کر دی ہیں جو یقینی طور پر نئی نسل کے قارئین اور اقبال پر ریسرچ کرنے والوں کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔اپنی اس کتاب میں مصنف نے عزیز احمد کی کتاب ''اقبال نئی تشکیل'' کے حوالے سے بھی گفتگو کی ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ عزیز احمد نے اقبال کی انقلابی شاعری ابتدا، حرکت و عمل کا فلسفہ، جبر و قدر کا نظریہ، نٹشے کا نظریۂ قوت اور برگساں کے نظریات پر تفصیل سے بڑے عالمانہ انداز میں گفتگو کی ہے اس کے علاوہ عزیز احمد نے اپنی کتاب میں خلافت کے تعلق سے بھی اقبال کے نقطۂ نظر پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔اسی کتاب میں شامل ایک مضمون ''علامہ اقبال کے ایک وکیل'' میں جہاں مصنف نے اپنی گفتگو محمد بدیع الزماں کی کتاب ''پیامِ اقبال'' پر مرکوز رکھی ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے اقبال پر اتنا کچھ لکھا ہے کہ وہ ماہرینِ اقبال میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔انہوں نے پیامِ اقبال کے مقدمے کے تعلق سے یہ بھی رقم

کیا ہے کہ محمد بدیع الزماں کے مطابق اقبال کی شاعری کو نظر انداز کر کے انہیں محض ایک مفکر، سیاست دان، تصورِ پاکستان کا خالق یا محض دانائے راز کہہ دینا مناسب نہیں۔

ڈاکٹر رؤف خیر کے مطابق پروفیسر جگن ناتھ آزاد علامہ اقبال کے معتقد ہیں اور ہندوستان میں اقبال کی سربلندی کا نعرہ اس وقت لگایا جب اقبال کا نام لینا بھی جرم سمجھا جاتا تھا۔ مصنف نے خلیل الرحمن اعظمی کے ذریعہ ن م راشد اور اقبال کے فکروفن میں مماثلت تلاش کرنے پر محمد بدیع الزماں کے مدلل جواب اور اقبال کی وکالت کا بھی ذکر خصوصی طور پر کیا ہے۔ اپنی کتاب میں ایک گمنام ماہرِ اقبالیات شیخ حبیب اللہ پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر رؤف خیر یہ بتایا ہے کہ شیخ حبیب اللہ نے ہندی مہا پرشوں سے اقبال کی عقیدت مندی کے تعلق سے تفصیل سے لکھ کر یہ بتایا کہ اقبال ایک کھلے ذہن کے شاعر تھے جنہیں ہندوستانیوں نے تنگ نظر سمجھا۔

زیرِ تبصرہ کتاب ''اقبال کے فکروفن کا گراف'' میں ڈاکٹر رؤف خیر نے اقبال کے ناقدین کی بھی خبر لی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے بڑی غیر جانبداری سے اقبال کے فکروفن کا مطالعہ کیا ہے اور تمام تر تضادات کے باوجود اقبال کی شاعرانہ اور مفکرانہ عظمتوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ مجموعی طور پر مصنف نے ایک بڑے کینوس پر اقبال کی ایک بڑی اور پروقار تصویر بنائی ہے جس کے لئے ڈاکٹر رؤف خیر یقینی طور پر قابلِ مبارک باد ہیں۔

کتاب : **مختارالدین آرزو**

مصنف وناشر: ڈاکٹر نسیم اختر مبصر : **ڈاکٹر سرور حسین**

سن اشاعت: ۲۰۲۰ء صفحات :۲۲۴

قیمت : ۳۰۰ روپئے

مطبع : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

مختارالدین آرزو کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کا شمار اردو کے مستند محققین اور نقادوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک مخلص و ہمدرد انسان، ایک خلیق دوست اور ایک با اصول شخص تھے جس کا اظہار ان کے ان خطوط سے ہوتا ہے جو وہ اپنے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کو قلمبند کرتے رہے تھے۔ ان مکتوبات میں سے بیشتر یا تو ضائع ہو گئے یا مکتوب الیہ کی لاپرواہی کی نظر ہو گئے۔ تاہم زمانے کے دست و بُرد سے جو محفوظ رہ سکے انہیں بہ ہزار دقت اور بسیار کاوش جمع کر کے نسیم اختر نے 'مکتوباتِ آرزو' کے عنوان سے منظرِ عام پر لانے کا قابلِ تحسین کام کیا ہے۔ ان

مکتوبات میں نسیم اختر کے والد محمد قمرالدین صاحب جن سے مختارالدین صاحب کے گہرے قلبی لگاؤ رہے تھے کو لکھے گئے خطوط کے علاوہ خود نسیم اختر اور ان کے بھائی محمد اشرف کو لکھے جانے والے خطوط بھی شامل ہیں۔

ان مکتوبات کے مطالعہ کے بعد زیرِ نظر مقالہ کا مصنف اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ نہ صرف مختار صاحب کے علمی، ادبی اور تحقیقی ذوق پر دال ہیں بلکہ ان سے ادب اور متعلقہ ادیب سے موصوف کی محبت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ مضمون نگار کا خیال ہے کہ ذاتی نوعیت کے حامل ہونے کے باوجود یہ خطوط گراں قدر معلومات کا وسیلہ ہیں۔ ان میں پائے جانے والے تحقیقی انکشافات ان مکتوبات کو ادبِ عالیہ بنا دیتے ہیں۔ ان مکتوبات کی ایک روایت یہ ہے کہ ان میں درج بعض واقعات کے حوالے سے حواشی کا اندراج بھی کیا گیا ہے جو محض اطلاعاتی ہی نہیں بلکہ تاریخی نوعیت کے حامل کہے جائیں گے اور جو مختارالدین صاحب کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتے۔ نسیم اختر نے ان خطوط کو منظرِ عام پر لا کر بلاشبہ ان کے اقدار و معیار کی اہمیت روشن کی ہے۔ ان مکتوبات کی اہمیت خود نسیم اختر کے ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے جو انھوں نے کتاب کے مقدمے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> ''مختارالدین احمد کے متعدد خطوط ان کے اعلیٰ اخلاقی اقدار و معیار کے جیتے جاگتے نمونے ہیں۔ انھوں نے اپنے بزرگوں، معاصرین، احباب کے علاوہ خردوں اور عزیزوں کو بھی جو خط لکھے وہ ان کے مکتوباتی سرمائے میں گراں قدر اضافے کے ساتھ لائقِ صد احترام اور قابلِ تقلید ہیں۔ 'مکتوباتِ آرزو' کے مشمولات سے بھی کئی ایسی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جو فرحت و انبساط بخشنے کے ساتھ نگاہوں کو خیرہ اور دلوں کو بصیرت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ ان کے ایک ایک جملے میں ان کی شخصیت کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔''
> (مقدمہ، مکتوباتِ آرزو، نسیم اختر، ص:۲۳)

زیرِ نظر مقالہ کئی مضامین پر مشتمل ہے جن سے نہ صرف مختارالدین احمد کی شخصیت کا تعارف سامنے آتا ہے بلکہ ان کی زندگی کے کچھ واقعات، ادبی کاوشات کے حوالے سے اُن کا نقطۂ نظر، نسیم صاحب کے والد کا تعارف نامہ و احوال، چند دہائیاں قبل عظیم آباد کی ادبی سرگرمیاں اور مختارالدین احمد کی اہم نگارشات کے حوالے سے تلاش و تحقیق کی سعی و انہماک پر روشنی پڑتی ہے جو یقیناً اہمیت کی حامل ہے۔ کتاب سے موصوف کی اس کاوش پر بھی روشنی پڑتی ہے جو 'کربل کتھا' کی تلاش کے سلسلے میں انھوں کی تھی اور جسے جرمنی کے ٹوبنگن لائبریری سے بالآخر ڈھونڈھ کر نکال لانے میں وہ کامیاب بھی ہوئے تھے۔ ان کا یہ عمل جوئے شیر لانے کے مترادف تھا لیکن جسے موصوف کے

جنون اور آہنی عزم نے پورا کر دکھایا تھا۔

نسیم احمد کے نام مختار الدین صاحب کے خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ نسیم احمد سے موصوف کے تعلقات خصوصی نوعیت کے تھے۔ایک تو نسیم اختر کے والد قمر الدین صاحب سے اُن کے تعلقات کے حوالے سے اور دوسری نسیم اختر کی علم و تحقیق میں وہ گہری دلچسپی تھی جسے موصوف اپنی رہنمائی میں جلا دینا چاہتے تھے۔خود نسیم اختر کو بھی مختار صاحب سے والہانہ عقیدت رہی تھی۔زیرِ نظر مقالے کی تخلیق و ترتیب اور متعلقہ مکتوبات کی اشاعت کے پسِ پردہ بھی اُن کی یہی محبت اور عقیدت محرک نظر آتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب کی تخلیق بلاشبہہ نسیم اختر کی قابلِ تعریف سعی کہی جائے گی جو مختار الدین آرزو جیسی اہم شخصیت کی زندگی اور فن کے مختلف گوشوں سے ہمیں متعارف کرانے میں معاون ہے۔خطوط کے مجموعے سے مختار الدین صاحب کی دلچسپی قابلِ ذکر رہی تھی۔ان کے ذاتی کتب خانے میں اردو، فارسی، انگریزی اور عربی کے خطوط کا ایک بڑا ذخیرہ بھرا پڑا تھا۔ان میں بعض خطوط کی قلمی تحریر بھی شامل تھی۔انھوں نے خود بھی لوگوں کو جو خطوط لکھے تھے وہ پچاس ہزار سے کم نہ ہوں گے۔ایسی صورت میں اگر نسیم اختر صاحب نے مزید تلاش و جستجو سے کام لے کر مختلف اہم شخصیتوں کو لکھے گئے خطوط بھی اپنی اس کتاب میں شامل کر لیتے اور انھیں اپنے مطالعہ کا حصہ بنا پاتے تو یہ کتاب مزید وقیع ہو سکتی تھی۔

میرا خیال ہے کہ موجودہ صورت میں بھی اردو کے عام قاری کے لیے یہ کتاب جس قدر معلوماتی ہو سکتی ہے وہیں ریسرچ اسکالر بھی اس سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

نامِ کتاب : **احمد یوسف کے افسانے :فکر سے فن تک**

مصنف و ناشر : ڈاکٹر آصف سلیم مبصر : **ڈاکٹر سرور حسین**

سنِ اشاعت: ۲۰۲۱ء

صفحات : ۲۴۰ قیمت :۳۰۰ روپے

مطبع : عرشیہ پبلیکیشنز، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۵

''احمد یوسف کے افسانے :فکر سے فن تک'' ڈاکٹر آصف سلیم کا تنقیدی مقالہ ہے۔احمد یوسف اردو کے معروف ترقی پسند افسانہ نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔اگر چہ انھوں نے رپورتاژ، خاکے اور ناولٹ بھی لکھے لیکن بنیادی طور پر وہ افسانہ نگاری سے ہی وابستہ رہے اور قریباً نصف صدی تک اس صنف کی خدمت اور توسیع میں

مصروف رہے۔ تاہم یہ افسوسناک ہی ہے کہ فنِ افسانہ نگاری میں احمد یوسف کی گراں قدر خدمات کا مبسوط اور بھر پور جائزہ آج تک ناقدینِ ادب کی توجہ سے محروم رہا ہے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے زیرِ نظر کتاب کے فلیپ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ:

> ''احمد یوسف نے ہم عصر اردو افسانہ نگاری کی توسیع میں جو خدمت انجام دی ہے اس کا غیر جانبدارانہ جائزہ اب تک نہیں ہو پایا ہے۔ اپنے عہد کے دوسرے افسانہ نگاروں مثلاً غیاث احمد گدی، کلام حیدری، الیاس احمد گدی اور دوسرے فن کاروں میں احمد یوسف کی درجہ بندی کیا ہونی چاہیے اور ان کے فکر و فن کے مطالعے کے لیے کن نکات پر توجہ دینی چاہیے ان سوالات کے جواب کے سلسلے میں ڈاکٹر آصف سلیم کی اس مخلصانہ کاوش کی اہمیت کو تسلیم کرنا چاہیے۔''

خود آصف سلیم کا خیال ہے کہ غیر منقسم ریاستِ بہار میں اردو افسانہ نگاروں کی جو تثلیث رہی ہے اس میں غیاث احمد گدی اور کلام حیدری کے ساتھ احمد یوسف کی شمولیت نمایاں رہی ہے۔ مقالہ نگار نے احمد یوسف کے حالاتِ زندگی سے اختصار میں متعارف کراتے ہوئے ان کی افسانہ نگاری کے آغاز، ان کے عصر کے سماجی و سیاسی حالات اور ان حالات کے شعر و ادب پر پڑنے والے اثرات کے نتیجے میں احمد یوسف کی فکری و فنی روش کے اختصاص کا عمدہ اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔

کتاب کا دوسرا باب احمد یوسف کے تقریباً اڑسٹھ افسانوں کے تجزیے پر مبنی ہے۔ اس حصے میں موصوف کے تینوں مجموعوں، 'روشنائی کی کشتیاں'، 'آگ کے سائے'، اور '۲۳ گھنٹے کا شہر' کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جب کہ چوتھے مجموعے 'رزم ہو کہ بزم ہو' میں شامل ۲۰ افسانوں میں سے صرف دس افسانوں پر ہی گفتگو کی گئی ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے مطالعہ سے گزرتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ آصف سلیم نے احمد یوسف کے مجموعوں کا نہایت سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے۔ ان مجموعوں میں شامل ہر افسانے کا عمدہ تجزیہ پیش کرتے ہوئے آصف سلیم احمد یوسف کو ایک باشعور افسانہ نگار بتاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ موصوف کا مطالعہ و مشاہدہ انتہائی وسیع تھا۔ انسانی سماج، اس کی ساخت، فرد اور سماج کے درمیان رشتوں کی ہم آہنگی و تضادات اور انسانی نفسیات کے پیچ و خم پر موصوف کی گہری نگاہ تھی۔ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یوسف صاحب کے افسانوں میں فکری وسعت اور گہری بصیرت دراصل ان کے قومی و بین الاقوامی ادب کے مطالعے کا ہی نتیجہ تھی۔ فکری طور پر ترقی پسند احمد یوسف نے

جدیدیت کے دور میں فن کے حوالے سے تجربے بھی کیے۔لیکن ان کی ترقی پسندی جس طرح گھن گرج اور نعرے بازی سے محفوظ رہی جدید فنی تجربے بھی مثبت فکر اور عصری معنویت سے عاری کبھی نہیں رہے۔ان کے اسلوب کا تجزیہ کرتے ہوئے آصف سلیم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جدیدیت کے ہیئتی تجربے سے استفادہ کرتے ہوئے جدیدیت کے عام رجحان کے برخلاف انھوں نے کہانی کو نظرانداز کبھی نہیں کیا۔ان کے افسانوں میں ابہام ضرور پایا جاتا ہے لیکن یہ ابہام اعتدال و توازن کا حامل ہے۔ان کی علامت نگاری بھی مغرب کی جدید علامت نگاری کی طرح مجرد نہیں ہوتی۔

فاضل مضمون نگار نے احمد یوسف کے افسانوں کے موضوعات اور اسلوب دونوں پر سنجیدہ نظر ڈالی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ موضوع کے اعتبار سے موصوف کی کہانیاں طبقاتی کشمکش، ہجرت کا کرب، جنگ کے خطرات اور کثرت میں وحدت جیسے موضوعات کے ضمن میں آنے والے مختلف النوع مسائل کا فنکارانہ اظہار ہیں۔جن کے مطالعے سے فکر و شعور کی نئی سمتیں روشن ہوتی ہیں۔یعنی بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ موضوع کے حوالے سے موصوف کی ترجیحات بھی بدلتی رہیں۔ابتدا میں روسی انقلاب سے متاثر مارکسی فکر کی طرف مائل افسانہ نگار تقسیم ملک کے نتیجے میں ظاہر ہونے والی فرقہ وارانہ زہرناکی، دوسری عالمی جنگ سے پیدا ہونے والے خطرات و اندیشے، پُرانی اور نئی قدروں کی کشمکش، ٹوٹتے ہوئے انسانی رشتوں کا درد اور آزادی کے بعد جمہوریت کے مسائل کی پیچیدگیاں جیسے موضوعات سے گریز نہیں کرسکا۔ بلکہ ان موضوعات کے فنکارانہ اظہار میں اس کے اسلوب کی انفرادیت بھی قابلِ ذکر کہی جائے گی جو اس کے معاصرین میں اسے ممتاز بناتی ہے۔آصف سلیم نے ان حقائق کے پیشِ نظر جس محبت، خلوص اور انہماک سے احمد یوسف کی شخصیت اور فن کا تجزیہ پیش کیا ہے وہ قابلِ مطالعہ بھی ہے اور لائقِ تحسین بھی۔زیرِ نظر کتاب کی پشت پر معروف افسانہ نگار عبدالصمد کی یہ رائے بھی اس مقالے کی اہمیت کو روشن کرتی ہے کہ:

> ''احمد یوسف جیسا انسان اب پیدا نہیں ہوتا۔اب اس کو کیا کہیے کہ احمد یوسف کے فن پر اس طور پر توجہ نہ دی گئی جس کا وہ متقاضی تھا۔ایسے عالم میں بھلا ہو آصف سلیم کا کہ انھوں نے اپنی کتاب میں ان کے افسانوں کے حوالوں سے سیرِ حاصل بحث کی ہے۔''

ابتدائی روغنی صفحہ پر احمد یوسف کی دلکش تصویر سے مزین، اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ ، بہار، پٹنہ کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہونے والی یہ کتاب آصف سلیم نے اپنے والد، والدہ، شریکِ حیات اور

دونوں بیٹوں کے نام معنون کیا ہے۔امید ہے کہ اہل فکر ونظر کے حلقے میں یہ کتاب خصوصی پذیرائی حاصل کرے گی۔

کتاب کا نام : **علی پور بستی**

ناول نگار : امتیاز غدر مبصر : **انور بھدرکی**

سنِ اشاعت: 2019

صفحات : 205 قیمت : 300 روپئے

مطبع : نیو پرنٹ سنٹر، دریا گنج، دہلی۔۶

اردو ایک زندہ زبان ہے جس کی کسی بھی عالمی زبان سے مقابلہ کی جا سکتی ہے۔ زندہ زبان لفظیات کے لحاظ سے جتنی فعال ہوتی ہیں، اصناف سخن اور اسلوبیت کے تعلق سے بھی اتنی ہی فعالیت رکھتی ہیں۔ اردو کی فعالیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں فارسی، عربی، ترکی، ہندی لفظیات کی اس قدر شمولیت ہے کہ اندازہ لگانا مشکل ہے۔ پھر اس نے نہ صرف سنسکرت، انگریزی اور دیگر کئی بین الاقوامی زبان کے لفظیات کو اپنایا بلکہ ہندوستان کے مختلف علاقائی زبان کے لفظیات سے بھی اردو مالا مال ہوئی ہے۔ اسی طرح اردو ادب کا دامن کئی قدیم جدید، ملکی اور غیر ملکی اصناف سخن سے بھی بھرا ہوا ہے۔ اب یہ اصناف کسی بھی صورت اردو زبان سے الگ نہیں لگتیں۔ اردو میں نہ صرف شاعری بلکہ نثری اصناف کی جہاں تک بات ہے، چونکہ اردو ادب کا بنیادی ڈھانچہ فارسی سے زیادہ قریب ہے یہی وجہ رہی کہ فارسی اور فارسی کے راستے عربی ادب کے سارے اصناف اردو میں در آئے ہیں۔ مغربی تعلیم کی وجہ سے اردو میں کئی مغربی ادب کی اصناف انگریزی ادب کے راستے اردو میں بھی اپنا مقام بناتی چلی گئیں۔ لیکن یہ الگ بات ہے کہ اردو نے جس صنف کو بھی اپنایا اسے اپنے رنگ میں رنگ لیا اور کسی زاویہ سے بھی وہ اب غیر ملکی اصناف نہیں لگتیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اصناف اردو کی ہی ہیں اور یہی اردو زبان کی خاصیت اور خصوصیت ہے۔

''ناول'' انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ فرانسیسی لفظ Novus، اطالوی لفظ Novella کو جب انگریزی زبان میں لیا گیا تو Nouele کہا گیا اور ان سارے لفظوں کا معنی نئے اور انوکھے کے ہیں جس سے مراد نئے اور انوکھے قصّے کے لیا جاتا ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں ''ناول'' کے لغوی معنی کی تعریف اس طرح ہوئی ہے:-''ناول ایک بیانیہ یا لمبی کہانی نما خیالی ادب پارہ ہے جس میں کردار اور عمل سچی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں

وہ چاہے ماضی کے ہوں یا حال کے یا کسی پلاٹ میں کم و بیش پیچیدگی کے ساتھ ان کی تصویر کشی کی گئی ہو (Vol.16- page.673-74)۔

پروفیسر محمد حسن ناول کے تعلق سے ایک عام مضمون ''ناول کی تنقید'' میں اپنی رائے رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''ناول زندگی کی تصویر ہی نہیں تفسیر بھی ہے۔اس میں زندگی کے عام حقیقتوں کی سچائیاں ایسے انداز میں واضح کی جاتی ہیں کہ پڑھنے والوں کو ان کا اور گہرا شعور ہو جائے۔اس کے کردار غور و فکر کے لئے زندگی کا ایسا قماش (Pattern) پیش کرتے ہیں جو زندگی کا مماثل نہیں بلکہ زندگی کے ایسے تصور کا اظہار ہے جس نے ان کی سچائیوں کا ترجمان ہے۔ناول زندگی کی کاربن کاپی نہیں بلکہ زندگی کے ایسے تصور کا اظہار ہے جس نے ان کی سچائیوں کی عمومیت کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔'' (شب خون-مارچ، ۱۹۶۷ء-ص:۵)

اس اقتباس کے آئینے میں جب ہم امتیاز غدر کا ناول ''علی پور بستی'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں نہ صرف یہ کہ ناول اپنے عہد کی زندگی، زندگی سے تعلق مسئلے نیز سماج کے اندر کی چھٹپٹاہٹ کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ ناول بڑی بے باکی، نہایت خوش اسلوبی سے سماج اور اس میں سانس لیتی ایک خاص طبقاتی معاشرہ کی آئینہ داری بھی کرتا ہے جس سے ناول نگار کی فن کارانہ ہنر مندی، خلاقانہ فنی وضع داری اور سلیقہ مندانہ جاویہ نگاہ کا بھی احساس ابھرتا ہے۔

ناول کا انتساب امتیاز علی نے مشہور و معروف فکشن نگار مشرف عالم ذوقی کے نام کیا ہے۔ناول میں جناب مشرف عالم ذوقی کا چھ صفحات پر مستعمل مضمون ''مردم شماری کے موضوع پر ایک ناول'' بھی شامل ہے۔بعد ازاں تقریباً دو صفحات پر سمٹا ہوا جناب سلیم انصاری کا مضمون ''علی پور بستی ایک سرسری تاثر'' ہے پھر امتیاز علی غدر کا ایک صفحہ پر لکھا گیا پیش لفظ ہے جس میں انہوں نے ''زندگی کے نچلے پائیدان میں رہ کر زندگی گزارنے والوں کے اندر خانوں میں جھانکنے کی بات کی ہے۔''

اصل ناول کی شروعات صفحہ 14 سے ہوتی ہے۔ناول کو 25 باب میں تقسیم کیا گیا ہے۔باب در باب دیکھا جائے تو ناول نگار نے پہلا باب کو 9 صفحات، باب 2 کو

8، 3 کو 8، 4 کو 10، 5 کو 12، 6 کو 6، 7 کو 8، 8 کو 7 صفحات دیے ہیں تو باب 9 کے لئے 18 صفحات، 10 کے لئے 5، 11 کے لئے 12، 12 کے لئے 5، 13 کے لئے 5 صفحات مختص کئے ہیں جبکہ باب 14 کو انہوں نے 10 صفحات، 15 کو 4، باب 16 کو 13، 17 کو 11، 18 کو 5، باب 20 کو 3، 21 کو 3، 22 کو 6، 23 کو 3 تو وہیں باب 24 کو 2 اور آخری یعنی پچیسواں باب کو 3 صفحات میں سمیٹ کر کل 205 صفحات کا ایک نہایت ہی نئے اور ان چھوئے موضوع پر لکھا ہوا ناول اپنے قاری کے سامنے رکھا ہے۔ ناول انوکھے پن کا جیتا جاگتا نمونہ ہے اس میں کوئی دورائے نہیں ہے۔

مشرف عالم ذوقی صاحب نے اپنے مضمون میں ناول کے تعلق سے بات ہی نہیں کی ہے اور پورے مضمون میں سوائے من کی بات کرنے کے کچھ نہیں کیا ہے۔ شکر ہے کہ انہوں نے آخر میں بنا کوئی خلاصہ کئے امتیاز غدر کی تعریف کی ہے۔ بڑی بات ہے۔ وہیں جناب سلیم انصاری کم ہی صحیح جامع مضمون تحریر کی ہے اور ناول کو ٹٹولنے کا کام بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اس طرح دیکھیں تو یہ ناول انسانوں کے ایک ایسے معاشرے کی حقیقی کہانی کو بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے جو موجودہ عہد میں سیاسی بے توجہی کا شکار ہے۔ سماجی بے یقینی کا شکار ہے۔ میرے خیال میں یہ کسی بھی ناول کا بنیادی وصف بھی ہے۔'' (علی پور بستی -ص:11)

امتیاز غدر نے اپنے تعلق سے کچھ بھی اپنے قاری کو بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔ یہ پردہ پوشی سمجھ سے پرے ہے۔ انہوں نے ناول کے تعلق سے اپنی نظریے کا انکشاف اس انداز میں کیا ہے:

''میں نے اپنے اس ناول میں زندگی کے نچلے پائیدان میں رہ کر زندگی گزارنے والوں کے اندرخانوں میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔'' (علی پور بستی -ص:۱۳)

فن کے رو سے ناول اس نثری قصّے کو کہتے ہیں جس میں کسی خاص نقطۂ نظر کے تحت زندگی کی حقیقی و واقعی عکاسی کی گئی ہو۔ اس کے لئے بناوٹ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ جہاں تک زیر مطالعہ ناول کی بناوٹ کا تعلق ہے: کہانی، پلاٹ، کردار، مکالمے، پس منظر، نظریۂ حیات اور اسلوب کے علاوہ ابتداء اور اختتام کا لحاظ جو ناول کے لئے ضروری ہوتے ہیں، ان کا تفصیلی جائزہ لینے کی میں نے کوشش کی ہے۔ اس نظریے سے دیکھیں تو امتیاز غدر نے روایتی انداز سے انحراف کرتے ہوئے اپنے لئے ایک نئی راہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ طے شدہ ڈگر سے ہٹ

کرانہوں نے ناول کی کہانی کا انتخاب ایک ایسے موضوع سے کیا ہے جو ناول نگاری کے لئے بالکل ہی انوکھا اور ان چھوا ہے۔آج کے روز بروز تبدیل ہوتے ہوئے سماج میں موضوع بھی بدلے ہیں اور امتیاز غدر نے ایسے ہی ایک موضوع ''مردم شماری'' کو کہانی کا روپ دیا ہے۔ جس سے ناول میں جو نیا پن ابھرا ہے اس کے لئے یقیناً موصوف مبارک باد کے حقدار ہے۔اس طرح انہوں نے پہلا مرحلہ بہ حسن وخوبی سے پار کرلیا ہے۔

ناول فنی اعتبار سے تب ہی مکمل سمجھا جاتا ہے جب اس کا پلاٹ منظم ہو۔کہانی کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہوا گر ناول کی مختلف کڑیوں میں ربط و تسلسل نہیں ہو تو ناول فنی اعتبار سے کامیاب قرار نہیں کہا جا سکتا ہے کسی ناول کا آغاز سے انجام تک توازن برقرار رکھنا بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور یہی ناول کا پلاٹ کہلاتا ہے۔ناول کی ہر کڑی آپس میں مربوط اور جڑی ہوئی ہونی چاہئے نیز ناول میں کہانی کا مربوط ہونا لازمی ہے۔

ناول کا پلاٹ جس کے ارد گرد کہانی گھومتی رہتی ہے، امتیاز غدر واقعات کو پلاٹ کے ساتھ اس خوبصورتی سے گوندھنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ کوئی گوشہ پر بھی ان کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی ہے۔انہوں نے مرکزی کہانی کو آگے بڑھانے کی غرض چھوٹے چھوٹے واقعوں کی مدد سے ایک خوبصورت محل تعمیر کرنے کا کام کر دکھایا ہے، کہانی میں باطنی ربط قائم رکھتے ہوئے ایک مربوط اکائی کی شکل دینے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں۔کسی بھی نہج پر وہ مرکزی کہانی سے ہٹتے ہوئے نہیں پائے گئے ہیں۔یہی ایک کامیاب کہانی کی دلالت کرتی ہے اور مصنف کی ہنر مندی کی بھی۔

ناول کا اگلا حصہ کردار نگاری ہے۔کردار نگاری کسی بھی ناول کا وہ فن ہے جس کو ناول کی روح کی مماثلت کہا جاتا ہے۔کہانی میں مرکزی کردار جون اور جولی ہیں۔دونوں جوان ہیں اور پڑھے لکھے بھی۔ان پر ایک پسماندہ بستی علی پور کی مردم شماری کا ذمہ عائد ہے۔حالانکہ دونوں میں اکثر انانیت کا سوال رہا ہے۔جس میں جون مرد اور جولی نسوانی انانیت کے symbol کے طور پر ناول میں پیش ہوئے ہیں۔ساتھ میں کام کرتے ہوئے دونوں میں اجنبیت، آہستہ آہستہ نزدیکیوں میں بدلتی جاتی ہے۔دونوں اپنے اپنے انداز میں ایک دوسرے کے تعلق سے سوچتے ہیں۔نہ صرف سوچتے ہیں بلکہ اپنے گھروں میں اس انداز میں ایک دوسرے کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں جس سے ان کے جہاں دیدہ ماتا پتا ان کے من کی بات سمجھ کر ان کی نزدیکیوں کو ازدواجی زندگی میں تبدیل کرنے کے لئے متفق ہو جاتے ہیں۔مرکزی کہانی علی پور بستی ہے جس میں ایک خاص طبقے کی اقتصادی اور تہذیبی طور پر نچلے طبقے کی زندگی کا لیکھا جوکھا پیش کیا گیا ہے۔مرکزی کردار کے ساتھ ناول کے دوسرے کردار جن

میں کیلو میاں کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے۔دوسرے کرداروں میں بستی کے حاجی ،بستی کے لوگ، ٹھاکر میاں، سرکل آفیسر، سپروائزر، نیومریٹر، رمضان، بی ڈی او صاحب، رام لال اور بھی کئی ان گنت کردار مختلف روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔کیلو میاں کا کردار قابلِ تقلید ہے۔

ناول نگاری میں مکالمہ نگاری ایک بہت ہی اہم فن کی حیثیت رکھتی ہے۔ مکالمے جتنے دلچسپ ہوں گے قاری کی دلچسپی اتنی بڑھتی ہے۔ ناول ''علی پور بستی'' میں امتیاز غدر کی بات کہنے کے انداز ذہن پر اثر چھوڑتے ہیں جس سے ان کی فنی دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔ چونکہ موصوف ایک کامیاب افسانہ نگار بھی ہیں، زبان پر قدرت اور انداز بیان کی اہمیت کا انہیں اندازہ ہے۔ناول کے مکالمے کرداروں سے مطابقت رکھے ہیں۔ مکالمے حالات اور نفسایات سے ڈوبے ہوئے ہونے کی وجہ قاری کے ذہن میں اپنا اثر چھوڑتے ہیں۔چھوٹے چھوٹے مکالمے آسان و عام فہم زبان میں ہیں۔ کیونکہ ناول ہمارے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔امتیاز غدر نے افسانے کے ذریعہ موجودہ معاشرے میں زندگی کی حقیقی ترجمانی کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس طرح ''علی پور بستی'' مکالمہ نگاری کے اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے۔

منظر نگاری بھی ناول کا ایک اہم جزو ہے۔ ناول نگار منظر نگاری کے ذریعہ قاری کو اسی ماحول میں لے جاتا ہے جہاں وہ لے جانا چاہتا ہے۔فنی نقطۂ نظر سے امتیاز غدر نے ناول میں منظر نگاری کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ بلاک آفس کے کیمپس کا نظارہ، بستی میں کیلو میاں کے دکان کا نظارہ، ٹھاکر میاں کے انتقال کے بعد کفن دفن کا وقت، نیومریٹر اور آپریٹروں سے بھرا ہوا آفس، مسجد کے سنگِ بنیاد رکھتے وقت کی منظر کشی، بی ڈی او کے بستی میں مردم شماری کی تفتیش کا نظارہ امتیاز غدر نے نہایت سلیقہ مندی سے ہر وقت کی منظر کشی کو ایسے بیان کیا ہے جیسے وہ سب کچھ ہمارے سامنے ہو رہے ہیں۔کیلو میاں کی جنازے کی بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''اسے (کیلو میاں) غسل دے کر کفن پہنا دیا گیا تھا اور آخری دیدار کے لئے جنازے کی چارپائی کو اس کے گھر کے دروازے کے باہر رکھ دیا گیا تھا۔ کفن میں لگائے گئے عطر اور چارپائی کے نیچے جل رہے اگربتی کی خوشبو فضا میں پھیل چکی تھی۔ پورا علی پور اس کے دروازے پر جمع تھا۔مرد، عورت، بچے بوڑھے سب کے سب کی کوشش یہی تھی کہ غسل کے بعد ایک بار اس کا آخری دیدار کرلیں۔ جون اور جولی بھی بڑی مشکل سے اس بھیڑ میں میت کا آخری دیدار کر پائے۔ باہر رہنے کی

وجہ سے ان کے بیٹوں میں سے کوئی بھی نہیں پہنچا تھا۔انہیں معلوا بھی تھا کہ نہیں کسی کو نہیں پتہ۔صرف اس کی بیٹی ایک کنارے بیٹھی سسک رہی تھی۔ جسے عورتوں نے گھیر لیا تھا۔''

(علی پور بستی-ص:204)

منظر نگاری کے ذریعہ نہ صرف امتیاز غدر نے ناول کو دلچسپ موڑ ادینے میں کامیاب ہوئے ہے بلکہ منظر نگاری کے ذریعہ انہوں نے کرداروں کی ذہنی کیفیات اور ان کی فطرت کی عکاسی کرنے کا بھی حق ادا کیا ہے۔ناول کے مکالمے بولتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور واقعات سے مطابقت کا احساس بھی ابھرتا ہے۔

ہر ناول نگار کا انسانی زندگی اور اس کائنات کو سمجھنے کا ایک اپنا نظریہ ہوتا ہے۔اسی نظریے سے وہ ہر چیز کو دیکھتا پرکھتا ہے اور یہی نظریہ اس کی تخلیقات میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ناول میں مردم شماری کی آڑ لے کر سماج میں رہ رہے اقلیتوں کی کراہتی ہوئی زندگی کی بات کرنے کی کوشش گئی ہے۔روزگار کا مسئلہ زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔معاشرے میں سب سے اہم مسئلہ بھوک ہے۔ایک چھوٹی بستی کے ذریعے ہندوستان میں اقلیوتوں میں نچلے طبقے کی زندگی کا احاطہ،حقیقت نگاری کا نہایت خوبصورت انداز ہے۔

''علی پور بستی'' کا موضوع انسانی جدو جہد اور کشمکش سے تعلق ہے۔معاشرے میں اقلیتوں کی موجودہ حالاتِ زندگی کی تصویر نہایت باریک بینی سے ابھاری گئی ہے۔مرکزی کردار جون اور جولی کے ساتھ ضمنی کرداروں کی شمولیت کے ذریعے امتیاز غدر نے کہانی کو آگے بڑھانے کا کام کیا ہے۔کرداروں کے چھوٹے چھوٹے مکالمے کے ذریعے کہانی کو رفتار دینے کا کام کیا ہے۔ناول کی منظر کشی سے کہانی کے اطراف و اکناف کے ماحول،رہن سہن کا ہو بہو اندازہ ابھرتا ہے۔انہوں نے ناول میں کرداروں کے ماحول اور حالات کے لحاظ سے زبان بھی استعمال کی ہے۔زیادہ تر مکالمے چھوٹے چھوٹے رکھے گئے ہیں۔ناول کا ہر حصہ واقعہ نگاری یا واقعات کی باز آفرینی کا مظہر ہوتا ہے۔زیرِ مطالعہ ناول کا ہر واقعہ حقیقی اور فطری بھی ہے۔واقعات میں شروع سے اختتام تک تسلسل کو برقرار رکھنے میں امتیاز غدر بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔کوئی بھی واقعہ غیر دلچسپ یا فضول نہیں ہے۔اس کے علاوہ کوئی بھی واقعہ ادھورے یا بے جان بھی نہیں ہیں۔جس سے قاری اکتاہٹ اور بیزاری محسوس نہیں کرتا۔اور ناول آخر تک دلچسپ بنا رہتا ہے۔

ناول میں کہانی یا پھر کردار نگاری کا بڑی حد تک جذبات نگاری پر منحصر رہتا ہے۔امتیاز غدر نے

کرداروں کے جذبات اور نفسیات کو جس انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ان کی ہنرمندی اور فنی سلیقہ مندی کا نمونہ ہے۔ ناول میں جذباتی اثرات گہرے اور موثر ہیں۔

امتیاز غدر کا فن کارانہ پیش کش زبان و بیان کی تازگی، کردار سازی کا منفرد انداز، موضوع کا تنوع، ناول کو نہ صرف اہم، دلچسپ اور لائق مطالعہ بناتا ہے بلکہ انہیں اپنے ہم عصروں میں قابل قدر مقام عطا کرتا ہے۔ ہارڈ بائنڈ گٹ اپ میں ناول کی خوبصورت چھپائی قابل دید ہے۔ میرے خیال سے براہِ راست ناول کو پڑھ کر جو لطف و انبساط اور بصیرت و بصارت حاصل ہوسکتی ہے وہ میری قلم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس لئے یہیں میں اپنی بات کو ختم کرتا ہوں اس یاددہانی کے ساتھ کہ قارئین اس ناول کو خود پڑھ کر لطف اندوز ہوں گے اور امتیاز غدر کے لئے اتنا کہوں گا کہ ''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ.........''

کتاب کا نام : **کتابوں کے شہر میں** (تبصراتی مضامین)

مصنف :سعید رحمانی مبصر : **انور بھدرکی**

سنِ اشاعت: 2021

صفحات : 128 قیمت : 150 روپئے

مطبع : ادبی محاذ پبلی کیشن، کٹک

زیر نظر کتاب '' کتابوں کے شہر میں''سعید رحمانی کی لکھی ہوئی تبصراتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ 128 صفحات کی یہ کتاب جس میں اپنی بات کے علاوہ 57 کتابوں پر تبصرے شامل کئے گئے ہیں۔ ان تبصروں میں سے زیادہ تر تبصرے سعید رحمانی کی ادارت میں اڈیشا سے شائع ہونے والا رسالہ ''ادبی محاذ'' میں شائع ہو چکے ہیں اور دو چار تبصرے اڈیشا اردو اکادمی سے نکلنے والا رسالہ ''فروغِ ادب'' میں شائع ہوئے ہیں۔ مصنف نے خود ''اپنی بات'' میں اس کا خلاصہ کیا ہے۔

جہاں تک سعید رحمانی کا تعلق ہے، ان کا اصل نام محمد سعید ہے۔ ان کی پیدائش 25 جون 1936 کو مٹیا برج (کولکاتا) میں ہوئی۔ درس و تدریس سے جڑے رہے۔ انہوں نے اپنی پہلی نظم بچوں کے لئے لکھی۔ نظم ناگپور سے نکلنے والا بچوں کے رسالہ ''چاند'' میں شائع ہوا۔ ان کی شعری اور نثری تخلیقات ملک کے موقر رسائل و جرائد کی زینت بن چکی ہیں۔ موصوف ایک زود گو شاعر ہی نہیں ایک زود گو نثر نگار بھی ہیں۔ بڑے عرصے سے اردو صحافت سے جڑے ہوئے ہیں۔ آج بھی وہ اڈیشا سے شائع ہونے والا رسالہ ''ادبی محاذ'' کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت

سے اردو صحافت میں فعال ہیں۔

سعید رحمانی کی کئی شعری و نثری کتابیں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔اس سے قبل موصوف کا مضامین کا مجموعہ ''نقطۂ نگاہ'' شائع ہو چکا ہے۔ان کے تبصراتی مضامین ''ادبی محاذ'' میں شائع ہو چکے ہیں جن کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔جن کا مجموعہ گاہے بہ گاہے ترتیب دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی کی ایک کڑی ہے جس کی اشاعت اڈیشا اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے ہوئی ہے۔

''تبصرہ'' عربی زبان کے لفظ ''بصر'' سے وجود میں آیا ہے۔ایک مدت تک اس کا استعمال تصریح، تفصیل اور توضیح نثر نگاری کے لئے ہوتا رہا لیکن عصرِ حاضر میں تبصرہ نگاری ایک خاص انداز کی تحریر کی حیثیت رکھتی ہے۔اردو ادب میں تبصرہ نگاری انگریزی ادب سے مستعار ہے۔اردو نثر میں کسی بھی کتاب، رسائل و جرائد کے متعلق اظہارِ تاثرات کو تبصرہ نویسی کا درجہ دیا جاتا ہے۔اصولاً کسی کتاب، رسائل و جرائد کے شائع ہونے کے بعد ان پر تحریر کی جانے والے منفی و مثبت تاثرات و نظریات کو تبصرہ نگاری کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔تبصرہ نگاری کے دوران مبصر تنقیدی اور تحقیقی نظریہ کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی تاثرات و نظریات کو سپردِ قلم کرتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں اردو ادب کی مختلف اصناف پر تبصرے شامل کئے گئے ہیں۔جس میں سے شعری مجموعوں پر 19 تبصرے، تنقیدی و تحقیقی مضامین کے مجموعوں پر 9 تبصرے، افسانوں کے مجموعوں پر 8، شخصیت پر لکھی گئی کتابوں پر 4 تبصرے، 2 ناولوں پر، 5 نعتیہ مجموعوں پر، طفلی نظموں پر 2، اردو تاریخ پر 2، افسانچوں پر 2، ایک ایک تبصرہ آپ بیتی، منقبتی مجموعہ ، ترجمہ اور طنز و مزاح پر، اس طرح کل 57 تبصرے کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔

کتاب میں ایک صفحہ کتاب کے ٹائٹل، پھر جملۂ حقوق کے بعد انتساب کے لئے ایک ایک صفحہ مخصوص ہے۔انتساب اڈیشا کے بزرگ اور کہنہ مشق شاعر، تنقید نگار، ترجمہ نگار جناب پروفیسر کرامتؔ علی کرامتؔ کے نام ہے۔دو صفحات پر فہرست ہے۔ایک تبصرہ چار صفحات پر، تین صفحات پر 12 تبصرے، دو دو صفحات پر 38 تبصرے اور ایک صفحہ پر چھ تبصرے کتاب میں شامل ہیں۔

درصل کتاب میں 57 مضامین شامل ہے جب کہ فہرست میں 55 درج ہیں۔فہرست میں نمبر کرتے وقت (۲) دو بار درج ہوا ہے جبکہ صفحہ (۵۶) میں شامل تبصرہ، ''مٹی کی مہک'' شاعر: احسان سیوانی، فہرست میں شامل ہی نہیں ہے۔صفحہ (۴۲) میں پروف ریڈنگ کی غلطی رہ گئی ہے۔

تبصرہ نگاری کے لئے تبصرہ نگار کی ذہنی وسعت وفکری صلابت کے علاوہ عمیق مطالعہ، عقابی نظر اور دانشورانہ دلیل لازمی ہے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جس میں دلیل وثبوت کے علاوہ فلسفہ اور منطق کے استدلال کی شمولیت معیاری تبصرہ نگاری کے لئے ضروری ہے۔ آج کے زمانے میں جس طرح پڑھنے سے لوگ گریز کرتے نظر آرہے ہیں خاص کر ضخیم کتابوں کے مطالعے سے لوگوں کا رجحان کم ہوتا جارہا ہے مبصر کو پوری کتاب کے نچوڑ کے ساتھ ساتھ کتاب میں موجود محاسن ومعائب کے تجزیہ بھی پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح تبصرہ نگاری ''ساگر کو گاگر میں سمیٹنے'' کا فن ہے۔ زیرنظر تبصروں کے مجموعہ میں شامل تبصرے پڑھتے وقت ایسا لگا کہ مبصر نے اعداد وشمار کی غرض تبصرے لکھے ہیں۔ لکھنے کے اسلوب پر شکایت نہیں ہے بلکہ جس طرح مواد کو کم کیا گیا ہے اس پر دکھ ہے۔ ایک ناول کو دو صفحات میں سمیٹ لینا واقعی کتاب کو غیر ذمہ دارانہ انداز میں پڑھنے پر سوالیہ نشان ہے۔ مبصر کی مجبوری سمجھ میں آتی ہے کہ کتاب جس تعداد میں رسالوں کے دفتر میں موصول ہورہے ہیں اور ہر کوئی چاہتا ہے کہ اس کی کتاب پر تبصرہ کیا جائے۔ ہر کسی کو خوش کرنے کی خاطر ''ادبی محاذ'' میں کبھی کبھی تو بارہ کتابوں پر تبصرے شامل کئے گئے ہیں۔ سوال رسالے کی ضخامت کا ہے۔ ایک مخصوص صفحات تبصرے کے لئے ہوتے ہیں۔ اس میں زیادہ تبصرہ فٹ کرنے کے چکر میں مواد کو کم ہونا ہی ہے۔ یہاں تک بات سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن ان منی تبصروں کو کتابی شکل دینا سمجھ سے پرے ہے۔

سعید رحمانی بڑے ہی مخلص اور ملنسار انسان ہیں۔ کئی ابھرتے ہوئے شعراء کے مضامین پر قلم چلا کر بھی غزل کو انہوں نے شائع کیا ہے۔ ان کی ژرف نگاہی اور دروں بینی کا میں خود بھی قائل ہوں اور تبصروں سے بھی صاف دکھتا ہے کہ انہوں نے بڑے ہی احتیاط کے ساتھ خود کو بچالے جانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ایک مدیر چاہ کر بھی لغزشوں اور کوتاہیوں کو نظر انداز کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کئی رسالوں میں کتابوں پر تبصرہ مدیر خود کرنے کے بجائے دوسروں سے کرواتے ہیں۔ اور کچھ رسالے تبصرہ ہی شامل نہیں کرتے۔ اچھا اور کھل کر حوالہ دیتے ہوئے لکھنے میں وقت تو لگتا ہے اور طویل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح بڑی مشکل سے چار سے زیادہ تبصرہ شامل کرنا مدیر کے لئے کٹھن ہوتا ہے۔ جس سے کتابوں پر تبصرے کے لئے مصنف کو انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ ''ادبی محاذ'' اس سے الگ ہے۔

سعید رحمانی صرف ایک شاعر ہی نہیں صاحب طرز انشا پرداز بھی ہیں جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہیں۔ اس کتاب کے تعلق سے خود سعید رحمانی یوں رقم طراز ہوئے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''راقم الحروف کا زیرِ نظر مجموعہ تنقید سے زیادہ تبصراتی ہے۔ چونکہ کسی بھی
کتاب پر تبصرہ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ افادیت
ظاہر ہو اس لئے اس میں اکثر و بیشتر خامیوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔
اس میں شامل بیشتر تبصرے ادبی محاذ میں شائع ہو چکے ہیں اور کچھ
تبصرے اڈیشا اردو اکادمی کے ترجمان ''فروغ ادب'' کی زینت بھی بن
چکے ہیں''

(کتابوں کے شہر میں-ص:6)

چونکہ سعید رحمانی خود ایک کہنہ مشق شاعر ہیں شعری مجموعوں پر ان کے تبصرے الگ انداز لئے ہوئے ہیں اور یہی بات انہیں ایک قابل تبصرہ نگار کے طور پر مستند کرتی ہے۔ کچھ اقتباس اس مجموعہ سے پیش ہیں۔ان مختلف النوع مضامین
میں انہوں نے جس تحقیقی بصیرت کا ثبوت پیش کیا ہے موصوف کی کاوش کا آئینہ دار ہیں ۔مثلاً
سعید رحمانی، پروفیسر کرامت علی کرامت کا شعری مجموعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس میں شامل غزلوں کا کینوس بے حد وسیع ہے۔ کہیں تمناؤں اور
خوابوں کی شکستگی ہے تو کہیں ماضی کی بازیافت میں سرگرم نظر آتے ہیں۔
غزلوں کا جمالیات کی شبنمی ٹھنڈک کا احساس بھی ہوتا ہے اور حالات کے
تپتے ہوئے صحرا کی تمازت بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔کہیں کہیں مذہبی ان
کی فکری طہارت سے ہمکنار کرتا ہے۔کہیں راست بیانیہ سے کام لیتے
ہیں تو کہیں استعاراتی پیرایہ سے اپنے اشعار کو لہرائی و گیرائی عطا کرتے
ہیں۔''

(کتابوں کے شہر میں-ص:8)

ڈاکٹر شاہد جمیل کا افسانوی مجموعہ ''ابابیل کی ہجرت'' کے تعلق سے فرماتے ہیں:

''بہر حال نقد و تحقیق اور ترجم نگاری کی راہ سے گزرتے ہوئے جب

مشاہدات وتجربات نے اکسایا تو انہوں نے اپنے خیالات، جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے فکشن نگاری کی طرف مراجعت کی تا کہ انسانی نفسیات کے ساتھ ساتھ معاشراتی ناہمواریوں کو منظرِ عام پر لا سکیں۔ فطرتاً ناقدانہ طبیعت پائی ہے۔ جو بھی لکھتے ہیں اس پر بار بار ناقدانہ نظر ڈالتے ہیں اور جب تک مطمئن نہیں ہو جاتے ان کا یہ عمل جاری رہتا ہے۔''

(کتابوں کے شہر میں-ص:35)

سعید رحمانی، ناول نگار قاضی مشتاق احمد کے ناول ''درد کا پیوند'' پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''کسی بھی فکشن نگار کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس ادراک مشاہدے کا ید بیضا ہو۔ ورنہ وہ اپنی تخلیق کا معجزہ دکھانے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ قاضی مشتاق احمد صاحب میں ایسی ہنر مندی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس لئے انہوں نے ناول کا تانا بانا اس طرح بنا ہے کہ قاری کا جذبۂ تجسس اسے ایک ہی نشست میں ناول ختم کرنے کی تحریک دیتا ہے۔ یہی وصف ناول کی کامیابی کا ضامن بھی ہے۔'' (کتابوں کے شہر میں-ص: 70)

شاعر مست حفیظ رحمانی کا حمد، مناجات نعتیہ مجموعہ ''عکس معرفت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے سعید رحمانی یوں رقم طراز ہوئے ہیں:

''نعتیہ کلام پر نظر دالتے ہیں تو لفظ لفظ سے خوشبو پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔ نعت کا فن جوش کے ساتھ ہوش کا متقاضی ہے۔ اس لئے اس راہ میں محتاط ہو کر قدم رکھنا لازمی ہے۔ چونکہ حضرت مست شریعت پر گہری نظر رکھتے ہیں اور قرآنی علم سے بھی بہرہ ور ہیں اس لئے اس راہ میں سرخرو گزرے ہیں۔ ان کے قدم کہیں بھی لڑکھڑاتے نظر نہیں آتے۔''

(کتابوں کے شہر میں-ص:119)

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل کی تصنیف کردہ کتاب ''موجوں کا اضطراب'' جو کہ موصوف کی آپ بیتی ہے، اس کے تعلق سے سعید رحمانی تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''موصوف (ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل) رزم گاہِ حیات میں مختلف تجربات سے گزرے چکے ہیں۔ دوستوں اور دشمنوں سے بار بار واسطہ پڑا ہے۔ رہبر کے بھیس میں رہزن کا سامنا بھی ہوا ہے۔ منافقوں سے بھی دوبدو ہوئے ہیں۔ دھوکے باز کاروباریوں سے بھی سامنا ہوا ہے۔ غرض کہ زندگی میں گزرنے والے کھٹے میٹھے تجربات کو انہوں نے بڑی سلاست سے اس طرح قلمبند کیا ہے کہ مختلف النوع حالات و تجربات آئینے کی طرح قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔''
>
> (کتابوں کے شہر میں-ص:125)

ایسا بھی نہیں کہ سعید رحمانی نے صرف اور صرف تبصرہ توصیفی انداز میں کیا ہے بلکہ خامیوں پر بھی اشارتاً ہی سہی لکھا بھی ہے جو کہ موصوف کی انفرادیت کی دلالت ہے جس میں نثری دانش مندی صاف جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان مضامین میں انہوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ ان کے مضامین کی متنوع وصف سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف سخن فہم ہی نہیں سخن شناش بھی ہے۔

کتاب کا گٹ اپ ٹھیک ٹھاک ہے۔ آج کے مہنگائی کے دور میں کتاب کی قیمت بھی واجب ہے۔ نئے تبصرہ نگار اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

کتاب کا نام : **پسِ غبار** (شعری مجموعہ)

شاعر : یاور وارثی مبصر : **انور بھدرکی**

سنِ اشاعت: 2015

صفحات : 232 قیمت : 250 روپے

مطبع : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶

غزل کے تعلق سے اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ شاید ہی کسی صنف سخن پر اس کے مماثل لکھا گیا ہو۔ غزل نہ صرف اردو زبان کی آن بان شان ہے بلکہ غزل ہی سہی معنوں میں اردو زبان کی عالمی سطح پر نمائندگی کرتی

ہے۔غزل، دکن کے ولی اورنگ آبادی کے ہاتھوں پلی بڑی ہوئی۔سن بلوغیت میں جب دلی دربار میں ولی نے غزل پیش کیا، فارسی پر اترانے والوں نے دانتوں تلے انگلی دبالی۔ پہلے تو ناک بھوں چڑھائے لیکن بعد میں انہیں اس کی اہمیت کو ماننا ہی پڑا۔سراج اورنگ آبادی، ناسخ جیسے سخن شناسوں نے تراش خراش سے اس کے حسن کو وہ انداز دیا جس پر آج بھی زمانہ مبہوت ہے۔

ہر اچھی چیز کو لوگوں نے کم کر کے دکھانے کی ہمیشہ سے کوشش کی ہے۔غزل بھی اس سے مبرا نہیں ہے۔ اس پر بھی کئی طرح کے الزام عائد کئے گئے۔کبھی اس پر تنگ دامانی، تو کبھی اس کو نیم وحشی صنف، کبھی اس کی گردن زدنی کے فتوے صادر کئے گئے، لیکن اس سخت جانی صنف کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔پھر غزل کے چاہنے والوں نے اس کو روپ میں ابھارا کہ اعتراض کرنے والوں کو بھی غزل کی وسعت، وقعت، ابدیت اور سرمدیت کا قائل ہونا پڑا۔چاہے وہ کوئی بھی صنف سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو اگر وہ اردو جانتا ہے تو غزل کو گنگنائے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔

یاور وارثی بھلے ہی کہیں کہ انہوں نے نعت سے پہلے غزل کہی لیکن انہیں اردو دنیا موقر نعت خواں کے بطور جانتی ہے، عزت دیتی ہے اور احترام کی نظر سے دیکھتی بھی ہے۔لیکن ان کی غزل ان کی دل کی تڑپ ہے، جسے انہوں نے بہ حسن و خوبی صفحہ قرطاس پر لفظوں کی صورت پیش کرنے کا کام کیا ہے۔اس کتاب سے ایسا کہیں بھی لگتا نہیں کہ انہوں نے ذائقہ بدلنے کے لئے غزل کی طرف رُخ کیا ہے بلکہ انہوں نے جس بلند معیاری کا مظاہرہ کیا ہے ان کی کہنہ مشقی کی دلیل ہے۔خود کے تعلق سے یاور وارثی اپنے مضمون ''منظر بے غبار'' لکھتے ہیں:

> ''پس غبار' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔یہ میرا پہلا بہاریہ مجموعہ کلام بھی ہے اور میری تیس سالہ ادبی جد و جہد کا نچوڑ بھی۔ پھر آگے فرماتے ہیں .....میری شاعری کی شروعات غزل گوئی سے تقریباً ۱۹۸۵ء میں ہوئی۔ نعت تو بہت بعد میں کہنی شروع کی لیکن جب شروع ہوئی تو اللہ اور اس کے رسول کا فضل ہوا اور بہت جلد اتنا مواد اکٹھا ہو گیا کہ ''برگ وثنا'' وجود میں آیا۔'' (پسِ غبار-ص:28)

زیر مطالعہ شعری مجموعہ ''پس غبار'' کی اشاعت ۲۰۱۵ء میں ہوئی۔ 232 صفحات کی شعری مجموعہ میں یاور وارثی کا مضمون ''منظر بے غبار کے علاوہ چار پُر مغز اور باوقار مضامین بھی شامل ہیں جس کے مصنف ہی اپنی

شناخت خود ہیں۔ مضمون ''حرف مسرت'' جناب سید نور الحسن نوابی ابوالعلائی کے نطق قلم کا اعزاز ہے تو مضمون ''سخن شجر پہ شاخ قندیل'' مایہ ناز نثر نگار جناب حقانی القاسمی کی عطر بیزی کا نمونہ ہے وہیں مضمون ''یاور وارثی کی غزل'' پروفیسر شہپر رسول کی علمی ثروت مندی کا نمونہ اور ''یاور وارثی کے شعری سروکار'' اردو ادب کے عظیم ناقد جناب ضیا فاروقی کا بیانیہ اظہار ہے۔

مجموعہ میں ایک بارہ اشعار پر مستمل حمد، آٹھ اشعار کی مناجات، تین (11، 19 اور 7) اشعار پر مستمل نعتیہ کلام شامل ہیں۔ کتاب میں 109 غزلیں ہیں اور 9 رباعی تبرک کے طور پر بھی شامل کی گئی ہیں۔ اس سے یاور وارثی کی فنی وابستگی کا خلاصہ ہوتا ہے۔ غزلیات کے شروع میں ''پسِ غبار'' کو قلبی انسیت سے جوڑ کر کہے گئے چار متفرق اشعار بھی شامل ہیں۔

109 غزلوں میں اشعار کے حساب سے دیکھا جائے تو تین اشعار کی ایک غزل، پانچ اشعار کی پانچ، چھ اشعار کی سات، سات اشعار کی اٹھارہ، آٹھ کی تیس، نو کی سترہ، دس کی سولہ، گیارہ اشعار کی گیارہ، بارہ کی چار غزل، تیرہ اور چودہ اشعار کی دو دو غزلیں شامل ہے۔ کچھ غزلو کے بعد جو جگہ بچ گئی تھیں انہیں پُر کرنے کے لئے کل ملا کر چھیالیس متفرق اشعار شامل کئے گئے ہیں جن میں سے دو دو اشعار کے دو متفرق اشعار اور باقی ماندہ ایک ایک اشعار کے متفرق اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ اب کل ملا کر متفرا اشعار کے باون اور غزل کے 916 اشعار کل جمع رباعی اور حمد، منقبت، نعت کے علاوہ کتاب میں 968 اشعار شامل ہیں۔

غزل کے مقطع میں تخلص استعمال کرنا ایک رواج ک طور پر مانا جاتا رہا ہے لیکن ایسی کوئی بندھن بھی نہیں ہے۔ مظفر حنفی کے سیکڑوں غزل بغیر تخلص کے ہیں۔ یاور وارثی نے تخلص ''یاور'' کا استعمال 99 غزلوں میں کی ہے جن میں سے 82 غزلوں کے مقطع کے مصرع اولیٰ میں اور 17 غزلوں کے مقطع کے مصرع ثانی میں تخلص استعمال کئے ہیں اور 10 غزلیں ایسی ہیں جن میں تخلص کا استعمال نہیں ہے۔ جہاں تک خالی جگہوں کے بخوبی استعمال کرتے ہوئے مصنف نے متفرق اشعار پیش کئے ہیں وہیں فلپ پر پروفیسر سید ابوالحسنات حقی، جناب عشرت ظفر، مولانا محمد قاسم حبیبی برکاتی، مولانا میکائیل ضیائی، جناب ناظر صدیقی اور جناب فاروق جائسی کی آراء بھی پیش ہیں۔

کہا یہ جاتا ہے کہ غزل اردو کی سہل ترین صنف سخن ہے اور یہ بھی کہ دشوار ترین فن۔ سہل اس لئے کہ روز سیکڑوں کی تعداد میں شعری مجموعہ شائع ہوتے ہیں جن میں غزلوں کی اہمیت رہتی ہے اور یہ بھی کہ ہزاروں شعراء

نے شاعری غزل کہنے سے شروع کرتے ہیں۔ دشوارترین اس لئے کہ ان میں سے بڑے ہی کم ایسی کتاب یا پھر ان میں شامل غزلیں ہوتی ہیں جنہیں معیاری کہا جاسکتا ہے۔ ورنہ بکواس۔

غزل ایمائیت اور اختصاریت کا فن ہے۔ تہہ داری اور معنی آفرینی اس کے زیور ہیں۔ صرف کافیہ پیائی، صنعت گری یا پھر محض ترکیب سازی نہیں۔ لفظوں کے استعمال پر خلاقانہ دسترس، استعارات وتشبیہات کا ہنرمندانہ استعمال سلیقہ مندانہ پیکرتراشی غزل کو سرمدیت عطا کرتی ہیں۔

اس نظریے سے دیکھا جائے تو یاورواثی کی غزل میں پیش روں سے استفادہ کرتے ہوئے غزل کی مثبت اقدار، مہذبانہ اور صحت مندانہ روایات کا نہ صرف احترام کیا ہے بلکہ اپنی مشق ومزاولت کا ثبوت دیتے ہوئے جس فنی وابستگی سے غزل کے اشعار کہے ہیں لازوال ہے۔ یہاں میں ان کے زیرنظر شعری مجموعہ کے تعلق سے لکھے گئے چند معتبر ناقدوں کا آراء پیش کرنے کی جسارت کررہا ہوں جس سے موصوف کی شعری ہنرمندی کا خلاصہ ہوتا ہے۔

''محترم یاورواثی ایک قادرالکلام، نغز گو اور حق گو شاعر وادیب ہیں جن کی طلعت فکر کا امتیاز واختصاص یہ ہے کہ وہ اپنے معاصرین میں نئے موسموں اور تازہ منظروں کے شاداب چہروں کی رونمائی تخلیقیت کے ہر بلند معیار کے مطابق کرتے رہتے ہیں۔''

(مولانا قاسم حبیبی برکاتی - بیک کور)

''یاورواثی کانپور کے وہ صاحب طرز شاعر ہیں جن کی مثال ملنی مشکل ہے۔ یہاں شاعر تو اور بھی ہیں مگر یاور صاحب کی شاعری کا انداز جداگانہ ہے۔ وہ نیا انداز فکر اور نئی لفظیات لے کر سامنے آتے ہیں اور صاحبان فن سے خراجِ تحسین حاصل کرتے ہیں۔''

(فاروق جائسی۔ فلپ)

''یاورواثی ابھی نوجوان ہیں۔ ان کو دنیا کے نشیب وفراز دیکھنے کے لئے عمر پڑی ہے لیکن ان کے جوہر جو سامنے آرہے ہیں ان سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ کچھ کرنے اور کرگزرنے کے موڈ میں ہمیشہ رہتے ہیں۔

جودت طبع کا ان کے یہاں کال نہیں۔ وہ ہر لحظہ اپنے قلم کو نئے نئے رنگوں، موسموں اور منظروں سے آشنا کرتے رہتے ہیں۔''

(ناظر صدیقی - فلیپ)

''تازہ پانی کے لمس سے ہی سخن چہرہ کو سادابی ملتی ہے اس لئے اچھی شاعری ہمیشہ احساس و اظہار کے نئے در کی تلاش میں رہتی ہے۔ یاور وارثی نے اپنے تخلیقی بہاؤ کے عمل میں تازہ کاری سے رشتہ جوڑے رکھا ہے مگر تازگی کی رو میں کلاسیکیت کی روح سے تعلق نہیں توڑا ہے کہ جدت اور روایت کے حسن امتزاج سے ہی تخلیقی اظہارات کو تمکنت و تمازت نصیب ہوتی ہے۔'' (حقانی القاسمی - مضمون : سخن شجر پہ شاخ قندیل - ص:11)

''یاور وارثی کی شاعری میں تخلیقی تجربات لہروں کی طرح پھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں تو ان کا لہجہ بہاؤ اور نشیب و فراز سے گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ایک حساس اور صاحبِ نظر شاعر ہیں۔ نئے مضامین کے ساتھ ساتھ بعض روایتی مضامین کو بھی ندرتِ ادا سے نکھار دیتے ہیں۔ ان کی غزلیات میں روایت کا احترام اور جدت کی کارفرمائی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ (پروفیسر شہپر رسول - مضمون: یاور وارثی کی غزل - ص:23)

''یاور وارثی نے درونِ ذات اور بیرونی واقعات اور حادثات کو نئی علامتوں اور جدید استعاروں کے حوالے سے ایک خوش رنگ پیکر عطا کیا ہے۔ ان کے سخن ساز ذہن نے یہاں جو چراغ روشن کئے ہیں وہ اپنی تب و تاب کے سبب عہدِ حاضر کا اگر مکمل شناخت نامہ نہیں ہے تو اس کا ایک مستحکم حوالہ ضرور ہیں۔''

(ضیا فاروقی - مضمون: یاور وارثی کے شعری سروکار

-ص:27)

ان اقتباس کی روشنی میں یاور وارثی کی شعری حیثیت خود بخود ہمارے سامنے ابھرتی چلی جاتی ہے۔ انھوں نے کلاسکیت کے ساتھ چلتے ہوئے جدید طرزِ عمل کا بخوبی اتباع کیا ہے جس سے ان کی شعری Vision کا منظر نامہ دوسروں سے مختلف تو ہے ہی انھیں اپنے ہم عصروں میں ممیز کرتا ہے۔ یاور وارثی نے اپنی غزلوں میں روایتی مضامین کو نئے رنگ و آہنگ سے روشناس ہی نہیں کیا ہے بلکہ موضوعات کو وسعت بھی دینے کی کوشش کی ہے اور کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً:

یاد آتے ہیں دھندلے دھندلے نقوش
زندگی اس کے ساتھ گزری تھی

شعر یاور وارثی کی جدت طرازی کا غماز ہے۔ یادوں سے گزرتے وقت ماضی کے دریچوں کے راستے خیالوں کے درآنے سے جو کیفیات پیدا ہوتے ہیں ان کی نشاط افروز ٹیس کا جو اپنا ایک احساس ہوتا ہے اس کا اظہار اس شعر کے ذریعےکیا تو ہے وہیں انھوں نے حزن اور انبساط کی امیجری کو نہایت فطری زاویہ فکر سے ابھارا ہے قابل تحسین ہے۔

رعب بلقیس نوا کے ہیں لبوں پر تالے
میں سلیماں ہوں مگر شہر سبا میں چپ ہوں
اب کہاں یوسف ہے بازار میں
اس قدر رونقیں کیوں دکانوں میں ہیں

تلمیحات روایتی شاعری کا خاص جزو ہے جس کا استعمال ہماری شعری روایت کا حصہ رہے ہیں۔ لیکن ان تلمیحات کے ذریعے نئی بات کہہ لینا فن شناسی سے ہی ممکن ہے۔ اس کا بخوبی اندازہ یاور وارثی کے زیر مطالعہ مجموعہ سے ہوتا ہے۔ انھوں نے وافر مقدار میں تلمیحات سے اپنے شعری گلشن کو گلزار کیا ہے۔

خوابیدہ منظروں کو جو بیدار کر گئے
وہ روز و شب کہاں ہیں وہ موسم کدھر گئے

یاور وارثی نے یادوں اور تصور کے کے سہارے اپنی بات میں جس انداز میں جدت پیدا کر لیتے ہیں یہ انہیں کا علاقہ ہے۔ اسی کو سرمایہ بناتے ہوئے انھوں نے الگ انداز میں پیکر تراشی کرنے میں کامیاب ہوئے

ہیں۔انہوں نے یادوں اور تصور کے سہارے جس خواب نما محل کا تعمیر کیا ہے اس پر ان کو ناز ہے۔

وہ سامنے آجائے تو ہے دیکھنا مشکل
اس پھول کی تصویر خیالی ہی رہے گی

یاوروارثی کی شعری خاصیت یہ ہے کہ وہ نہ صرف شدت سے گردپیش کے حالات کو سمجھتے ہیں بلکہ اسی شدت سے ان میں کھو جاتے ہیں پھر بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس احساس کو شعری پیکر میں ڈھال کر اپنی فنی وابستگی کا احساس بھی کراتے ہیں۔انہوں نے چلتی پھرتی تصور کی روح میں اتر کر اشعار کو پیکری سانچوں میں ڈھالنے کا کام کیا ہے۔

بنتے مٹتے دائروں اور گردشوں کو کیا خبر
ایک تنکے کی طرح گرداب میں رہتا ہوں میں

یاوروارثی کا غم ان کا اپنا ہے۔انفرادی بھی ہے۔لیکن اس انفرادیت میں پنہاں ہمہ گیریت کو انہوں نے بڑی خوبصورتی سے شعر کے قالب میں ڈھال کر ایک نیا آہنگ پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ان کے اشعار میں غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں دونوں کی تصویر کشی کا بہترین انداز ان کی شاعری کی خصوصیت اور خاصیت ہے۔ان کے اشعار میں صرف وہ نہیں سارا معاشرہ شریک معلوم پڑتا ہے۔

یاوروارثی زمانے کا نوحہ خواں ضرور ہیں لیکن زمانے کی ناقدری سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ان کے اندر کا فنکار وقت شناس تو ہے وقت کا نباض بھی ہے۔وقت کے ساتھ چلتے ہوئے وہ اپنی منزل تک پہونچ پانے کی صلاحیت سے واقف بھی ہے۔یہی ان کی فنکارانہ صلاحیت کی پہچان ہے۔یاوروارثی کی شاعری میں ان کا عہد بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ان کی شاعری خوبصورت شعری پیکریت سے آراستہ و پیراستہ ہے اور چلتی پھرتی زندگی اور زندگی سے وابستہ تصورات کو بحسن و خوبی پیکری ڈھانچوں میں ڈھال دیا ہے۔

یاوروارثی کے کلام میں جو بے ساختگی اور برجستگی پیش کیا ہے کہ ان کی شاعری کو شبنم کی آہٹ اور بادِ سموم کی سرسراہٹ کے امتزاج کی شاعری قرار دیا جاسکتا ہے۔ان کے اشعار میں لفظوں کا دروبست جو شعری لچک درآئی ہے اس سے فکر کی نئی جوت چمکتی جو نہ صرف زندگی آشنا ہے زندگی کے گوں ناگوں کا پتہ بھی دیتی اور زندگی سے قربت کا احساس بھی کراتی ہے۔انہوں نے اپنے اشعار میں سماجی قدروں اور اس کے مسائل کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔مثلاً:

قافلے نے مرے صدیوں کا سفر ختم کیا　　وقت کے پاؤں سے لپٹی رہی زنجیر تری

مرے وجود سے لپٹی ہے تسمہ پا کی طرح　کہ میری دشمن جاں ہے مری کہانی بھی

انا پسند تھے شاید مرے پرندے بھی　　بھری اڑان کچھ ایسی کہ لوٹ کر نہیں آئے

جگایا جس کی ٹھوکر نے مری خوابیدہ آنکھوں کو　　متاع کامرانی بھی اسی پتھر پہ رکھی تھی

جہانِ معنی کی تلاش یا وروارثی کا علاقہ ہے۔انہوں نے فکر و جذبہ کو ہم آہنگ کرنے ،ہم رشتہ رکھنے اور معنویت کو نئے زاویہ سے ہم کنار کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ شعری ابلاغ کی عمدہ مثال ہیں۔ان کا مشاہدہ بہت ہی وسیع اور گہرا ہے اسی کی پاسداری، ان کا راست احساس و طریق اسلوب ان کے اشعار میں جگہ جگہ موجود ہے۔جس سے ان کی ہنر مندی کا خاصہ ہے نیز تجربات و مشاہدات اور وسیع مطالعہ ان کی شاعری کو منفرد بنا دیا ہے۔انہوں نے فکری جاویہ کو اساس بنا کر کلاسیکیت اور جدیدیت کے امتزاج سے جو محل تعمیر کی ہے نہایت منفرد طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔

ہارڈ بائنڈ کی اس شعری مجموعہ کو جس نفاست سے اسمائل گرافکس، کانپور نے کمپوزنگ کی ہے اسی خوبصورتی سے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے طباعت کیا ہے۔ دبیز کاغذ میں شعری مجموعہ اپنی وقار کا ضامن ہے۔ خوبصورت اور دیدہ زیب پرنٹنگ ایجوکشنل والوں کی پہچان رہی ہے۔دل کی گہرائی میں اتر کر شعور کو نشاط و آگہی سے ہمکنار کرنے والے اشعار کے ساتھ ساتھ نفیس کاغذ، معیاری طباعت اور دیدہ زیب گٹ اپ شعری مجموعہ کو خاص بناتی ہیں اور پڑھنے کی دعوت دیتی ہیں۔

کتاب کا نام : **مظفر حنفی حیات وجہات**

مرتب　: انجینئر فیروز مظفر　　مبصر : **ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی**

سنہ اشاعت: ۲۰۲۱ء　صفحات :　　قیمت : ۳۵۰ روپیہ

ناشر　: انجینئر فیروز مظفر

رواں مقدس مہینے کے وسط میں بھائی فیروز مظفر کا تحفہ بشکل ''مظفر حنفی حیات و جہات'' بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ یہ عہد ساز شاعر و محقق کے ہونہار خلف اوّل اور والد کے ادبی اثاثے کا وارث انجینئر فیروز مظفر کی مرتب کردہ کتاب ہے جس میں کل ۴۵ مضامین مثل قطرہ قطرہ دجلہ کے مترادف ہیں جو قاری کے ذہن وفکر میں جب پیوست ہوتے ہیں تو جمالیاتی حس کے علاوہ قوت فکر کے ساگر میں طغیانی آتی ہے اور پھر سارا وجود جل تھل ہو جاتا ہے۔ ہر مضمون ایک باریک اور پارکھ نگاہی کا ترجمان ہے جس کو پڑھ کر مظفر کے رنگ میں قاری رنگ

جاتا ہے۔ پلکوں اور ذہن وفکر کے جھولے پر مظفر حنفی کے اشعار جھولنے لگتے ہیں جس کے باعث دل کی زمین پر بہار آتی ہے اور جب دل کی زمین پر بہار آتی ہے تو خارج اور باطن ہر جگہ جوہی، موگرا اور چمپا کے پھول کھل اٹھتے ہیں صرف کھل ہی نہیں اٹھتے ہیں بلکہ وجود کے چاروں طرف خوشبو کا بسیرا ڈال دیتے ہیں اور دل و ماغ اس کی خوشبو سے معطر ہو جاتا ہے۔

مظفر حنفی کی شاعری میں نہ درد کی رانی ہے نہ برہن کی برہہ نہ ہی دنیا کی بھیڑ میں کھو جانے کا غم ہے نہ دلبری کی باتیں ہیں۔ نہ ہی دل کی اداسیاں ہیں بلکہ زندگی کی دھوپ میں جلتی زندگی کے سچے واقعے ہیں جو لفظوں کا جامہ زیب تن کر کے قاری کے سامنے آتے ہیں۔ مظفر حنفی کی شاعری کا شعری مزاج منفرد لہجے اور آہنگ سے علاقہ رکھتا ہے جس میں نثریت کی بو بھی آتی ہے۔ بنی نوع آج جس دور سے گذر رہا ہے وہاں مادی اعتبار سے عصر ثروت مند ضرور ہو گیا ہے لیکن اس کے دوسرے رخ پر نظر مرکوز ہوتی ہے تو یہ اخلاقی سطح پر قلاش کے دائرے میں محصور نظر آتا ہے ایسے میں مظفر حنفی کی شاعری تاریکی میں جگنو ہے جو سراپا روشنی کا استعارہ ہے۔ اسی لیے ایسا کہا جاتا ہے کہ مظفر حنفی کی شاعری ان کے عہد کی فکری ابتری اور اخلاقی بے سروسامانی کا ایک ایسا منظر نامہ ہے جس میں انسانی زندگی کے اس انحطاطی پہلو کو بڑے آسانی کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔

مظفر حنفی کی پوری زندگی اردو ادب کی زلف گرہ گیر سنوارنے میں نہ صرف صرف ہوئی ہے بلکہ اس کے جملہ فروغ میں موصوف دم آخر تک سراپا ہمہ تن منہمک رہے۔ ان کی شاعری گجرا اور کجرا کی شاعری نہیں ہے اور نہ ہی حسن وعشق کی پرفریب وادیوں میں گلوں کی لچکتی ڈالیوں کا قصہ ہے بلکہ اس میں زندگی کے کانٹے چبھنے کا احساس جاگزیں ہے۔ مظفر حنفی کی شاعری کسی خارجی دستور العمل کے تابع نہیں بلکہ ان کی شخصیت کا تخلیقی اظہار بھی ہے۔ ایسی شعریات قاری کے ذہن وفکر کو نہ صرف ہیجان میں مبتلا کرتی ہے بلکہ زندگی سے نبرد آزمائی کا سبق بھی پڑھاتی ہے کیونکہ تناؤ اور بے اطمینانی کے ماحول میں ادب کے زینے آگے بڑھتے ہیں۔ مظفر حنفی روایت اور بغاوت دونوں کے اسباب سے خوب خوب واقف ہیں۔ بقول پروفیسر شمیم حنفی:

> ”مظفر صاحب کے اشعار میں تخلیقی اظہار کی اخلاقی قدر اور معنویت کا عنصر نہ صرف یہ کہ ایک حاوی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں خلوص اور سچائی کا تاثر بھی بہت طاقتور ہے۔ لہذا شعر گوئی ان کے لیے نہ تو برائے تفریح ہے، نہ صرف عادت کا جبر۔ ان کے یہاں اس سے ایک اخلاقی فریضے کی ادائیگی بھی ہوتی ہے اور اپنے ماحول میں، واقعات میں اشخاص میں، تجربوں

میں انہیں جہاں کہیں بھی ناہمواری، نقص اور بدہیئتی دکھائی دیتی ہے، وہ اس پر اپنے ردعمل کے اظہار سے باز نہیں رہتے۔" ص:۵۳

شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون "دیباچہ کلیات مظفر حنفی" چیز دیگرے ہے۔ تقابلی مطالعے و عرق ریزی کے بعد یہ مضمون سپرد قلم کیا گیا ہے جس میں مظفر حنفی کی شاعری میں پائے جانے والے دیگر خصوصیات کو اجاگر کیا گیا ہے جس سے مظفر حنفی کا قد ذرا اور اونچا ہو گیا ہے کیونکہ یہ اونچے قد والے نقاد کے قلم سے نکلی ہوئی وہ تحریر ہے جس کے لفظ لفظ سے صداقت کی بو آتی ہے۔ اس کی روشنی میں اس نکتے پر پہنچا جاسکتا ہے کہ تحقیق، تنقید، کالم نویسی، جائزے، فکشن، تبصرے، ترجمے، خاکہ نگاری سب میدان میں موصوف نے اپنی فکر کے گھوڑے دوڑائے، دوڑائے ہی نہیں بلکہ سرپٹ بھاگے لیکن ان کو مقبولیت شعر گوئی سے زیادہ ملی جو میدان ادب میں ان کی شناخت کا بنیادی حوالہ ہے۔

کتاب فخر والدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنو کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے جس کی قیمت ۳۵۰ روپے ہے۔ ڈیمائی سائز میں اس کتاب کے اوراق عمدہ، طباعت خوبصورت، اور سرورق وہ دیدہ زیب ہے جہاں شکیل اعجاز کی فنکاری مظفر حنفی کی تصویر کی شکل میں قاری سے دوبدو گفتگو کرتی ہے۔ فلپ پر جگن ناتھ آزاد، یوسف ناظم، اختر سعید خان عشرت قلیدی اور جوگیندر پال کی آرائیں مانند ستارے چمک رہے ہیں جس کے بطن سے دعاؤں کا ایک ایسا جمگلفیر ا اوپر اٹھتا ہے کہ انجینئر فیروز مظفر کی راہوں کے تمام کانٹے خود بخود ہٹ جاتے ہیں اور ایک قیمتی و تاریخی کتاب منظر عام پر آ کر قاری کے ہاتھوں تک پہنچتی ہے۔ المختصر جہاں ۴۵ قلم کے مجاہد اپنے جگر پاروں سے ایوان مظفر کو رنگ و روغن کرنے کے لیے یکجا ہو جائیں تو ان کی شاعری کی حویلی کو جگمگا اٹھنا لازمی ہے۔!!

میں شاعر ہوں مری پرچھائیں مستقبل پہ پڑتی ہے
مگر تاریخ کی ہر چوٹ میرے دل پہ پڑتی ہے

(مظفر حنفی)

مکتوبات

رسالہ کا خاصہ بڑا حصہ پہلے ہی پڑھ چکا تھا مگر اٹک اٹک کر، بے مزگی کے ساتھ۔ وجہ۔ اس بار پروف کی غلطیاں زیادہ تھیں۔ بہت زیادہ۔

اداریہ اس بار بھی متوجہ کرتا ہے۔ لیکن لکھنے والے متوجہ ہوتے ہیں کہ نہیں، یہ سوال میرے نزدیک اہم ہے۔ اردو ادب کی سماجیات کا جتنا مجھے علم ہے اس کے مطابق تو نہیں لگتا کہ ہم عصر سیاسی و سماجی مسائل ہمارے ادیبوں کی تخلیقات میں جگہ پاتے ہیں۔ مضامین میں اسیم کاویانی صاحب کا مضمون چشم کشا ہے۔ اسیم صاحب علم ہیں۔ وہ بڑی معروضیت کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اس لئے خود ان پر کسی کے لئے متعصب ہونے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی کی جو تصویر اس سے ابھرتی ہے وہ ان کا کل نہیں بس ایک جز ہے، لیکن ہے۔ فاطمی صاحب کا مضمون کتب موصولہ کی رسید جیسا ہے۔ ان سے بہتر کی توقع تھی۔

غزلوں کا حصہ زیادہ اچھا ہے۔ شاہین صاحب اب بھی تر و تازہ معلوم ہوتے ہیں۔ خالد عبادی کا کلام بہت دنوں بعد کسی رسالے میں نظر آیا۔ ان کا ایک خاص انداز ہے جو مجھے اچھا لگتا ہے۔ نظمیں بھی اچھی ہیں۔ خاص طور سے راشد جمال فاروقی کی نظم۔ کہانیوں کا حصہ بس ٹھیک ہے۔ اچھی کہانیاں کم لکھی جا رہی ہیں۔ شاید یہ افسانے کا زمانہ نہیں ہے۔ ناول نگاری کے رجحان نے اچھے لکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ اور خالی جگہ کو بھرنے کی صلاحیت رکھنے والے کم کم ہی نظر آ رہے ہیں۔

رسالہ آپ بہت محنت سے ترتیب دے رہے ہیں۔ براہ کرم کمپوزنگ اور پروف پر اتنی ہی توجہ دیں۔

خورشید اکرم (دہلی)

نصف صدی پر محیط قلمی سفر میں ہر مزاج کے مدیر سے میرا سابقہ رہا۔ محمود ایاز (سوغات) تخلیق کے معیار کو لیکر بہت سخت تھے۔ شمس الرحمٰن فاروقی (شب خون) بلا کے Perfactionalist افتخار امام (شاعر) ہر وقت اشاعت کو لیکر بہت Diciplined، ساجد رشید (نیا ورق) کمیٹڈ ترقی پسند، زبیر رضوی (ذہن جدید) فنون لطیفہ کے ماہر، ابرار رحمانی، خورشید اکرم اور راج نارائن راز (آجکل) ادارت کے جملہ امور سے واقف، کرشن کمار طور (سر سبز) انتہائی سنجیدہ، تقریباً ہر مدیر کو کسی نہ کسی Complex کا شکار دیکھا، سوائے احمد نثار (عالمی فلک) کے احمد نثار معصوم سادہ لوح سچے اور کھرے انسان ہیں جو اداریہ لکھ کر منظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کی مدیرانہ صلاحیت تخلیقات کے انتخاب میں ہی نظر آتی ہے۔ وہ کسی Complex کے شکار نہیں ہیں۔ یہ بڑی بات ہے۔

عالمی فلک شمارہ ۶ مرے سامنے ہے۔ زیب غوری اور مناظر عاشق ہرگانوی کی حمد اور نعت متاثر کرتی ہیں۔ اداریہ کا Gist آخری سطور میں دیکھیں "شاعر و ادیب کا سماج کے حساس ..... ممکن نہیں"، علی احمد فاطمی کا مضمون تمام مثبت پیغامات کے باوجود اس بات پر زور دیتا ہے کہ تخلیق کاروں کو ابھی مزید ریاضت کرنی ہوگی۔ رؤف خیر کا مضمون دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے راج موہن گاندھی کی وہ تحریر یاد آ گئی جس میں کہا گیا ہے کہ اقبال شیر اور شاہین کا ذکر کرتے ہیں لیکن خون دیکھنے سے ڈرتے ہیں۔ وہ عمل پیہم کا درس دیتے ہیں لیکن آنگن میں ٹہلنے سے زیادہ فعال نہیں ہیں۔ غضنفر کا خاکہ اس طرح کامیاب ہے کہ تجسس کی فضا آخر تک برقرار رہتی ہے۔ بالکل آخر کے سطور میں یہ راز کھلتا ہے کہ خاکہ ہے کس پر لکھا گیا ہے۔ اسیم کاویانی پرانے بُت شکن ہیں۔ ان کی درشت لیکن درست باتیں تحقیق کا حق ادا کرتی ہیں۔ گاڑھی تحقیق سے گزر کر انہوں نے مضمون تحریر کیا ہے۔ سید احمد شمیم کے شعری مجموعے کا بہترین تعارف عشرت ظہیر نے کرایا ہے۔ فخر الکریم کے مضمون کو پڑھ کر گاندھی نامہ کی معلومات فراہم ہوئی ورنہ میں اس شعری مجموعے سے ناواقف تھا۔ نور الحسنین اور نذیر فتح پوری کے افسانے تجرباتی نوعیت کے ہیں خوب ہیں۔ اسلم جمشید پوری نے کامیاب جزئیات نگاری کا حق ادا کر دیا۔ خاکسار کی نظم "امّی کی جائے نماز" کو آپ نے تقدیم کے ساتھ شائع کیا۔ ممنون ہوں۔

لال قلعہ کے مشاعرے میں سامعین نے میری مختصر سی تمہید کے بعد نظم کو سکون سے سنا اور ایک عالمی مشاعرے میں (غالب انسٹیوٹ کے) مرحوم زبیر رضوی نے اس نظم کو ذہن جدید کے لئے لی تھی۔ نظموں کے حصے میں عالمی فلک کا معیار قابلِ رشک ہے۔ آفاق فاخری، شارق عدیل، ڈاکٹر سرور حسین اور جاوید ندیم نے متاثر کیا۔ شاہین، ظفر اقبال ظفر، فاروق راہب، ذکی طارق، شارق عدیل، خالد عبادی، ساجد حمید کی غزلیں خوب ہیں۔ آپ کی رباعیات نے بھی متاثر کیا۔ سلیم انصاری کی نظمیں خوش ذائقہ ہیں۔ "سرہانے میر کے"، "عکس گم گشتہ" "دیکھ لی دنیا ہم نے"، "شگفتی اور برجستگی قلمکاروں کی"، "آئینہ در آئینہ"، "شوق ہر رنگ" جیسی معیاری کتب پر تبصرے پڑھ کر کتاب حاصل کرنے کو جی چاہتا ہے۔

راشد جمال فاروقی (دہلی)

"عالمی فلک" اپنی اشاعت کے دو برس مکمل کرنے جا رہا ہے۔ مبارکباد قبول فرمائیے۔ رسالے کی درازئی عمر کے لئے دعا گو ہوں۔ اس الکٹرانک اور وبا کی طرح پھیلتے ہوئے سوشل میڈیا کے دور میں جبکہ لوگ کتابوں اور رسالوں کے مطالعہ سے دور ہوتے جا رہے ہیں ایسے میں اردو زبان میں کتابوں کی اشاعت اور

رسالوں کا نکالنا فرہاد کی کوہکنی سے کم نہیں۔ یہ تو آپ جیسے مدیروں کا جنون ہے کہ فرہاد کی اس کوہکنی کے لئے تیشۂ تدبیر لے کر میدان عمل میں کود پڑے ہیں۔ گھاٹے کے اس سودا کو دیکھکر دل کانپ جاتا ہے۔ قلمکاروں کا کیا تحریریں شائع ہوگئیں اور واہ واہ کے ڈونگرے برسنے لگے۔ خاص طور پر فیس بُک کے اس چلن نے تو مجھے کوفت میں مبتلا کر دیا ہے۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو اور آپ کی مدیرانہ سنجیدگی کی داد دل سے دینے کو جی چاہ رہا ہے۔ میری یہ تحریر آپ کی مدیرانہ سنجیدہ طبیعتی کی گواہ ہے۔ اداریہ میں آپ نے اردو زبان و ادب کے حوالے سے جن فکرمندیوں کا اظہار کیا ہے وہ لمحہ فکریہ کی حیثیت رکھتی ہیں جناب زیب غوری کی حمد سے رسالے کا آغاز۔ آپ کے ذہنی میلان کا اشاریہ ہے۔ حمد کا ایک ایک شعر ایمان و ایقان کی سطح پر فکر و شعور کو برانگیخت کرتا ہے۔ مشمولات کا وہ حصہ قابل قدر اور قابل مطالعہ ہے جہاں آپ نے دوسری زبانوں کے ادب کے منتخب شہ پاروں کو شامل کیا ہے۔ شاید قاری کو دوسری زبانوں کی چیزیں پڑھنے کی عادت پڑ جائے۔ یہ کام مرحوم زبیر رضوی اپنے رسالے ذہن جدید میں تواتر کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ دیگر مشمولات بھی آپ کی مدیرانہ جانفشانیوں کا ثمرہ ہیں۔

اظہار خضر (پٹنہ)

تحقیقی اور تخلیقی ادب کا ترجمان ''سہ ماہی عالمی فلک کا کتابی سلسلہ-6'' نظر نواز ہوا۔ کچھ وقت سرِ ورق کو نہارتے رہنے میں نکل گیا۔ پرچہ کی خوبصورتی اور معیار آپ اور محترمہ آفرین فاطمہ کی کاوش کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ از حدِ تردد مشمولات پر نظر دوڑائی تو وہاں بھی آپ کی محنت کا اعتراف کرنا پڑا۔ جس انداز میں آپ نے نگینہ کاری کا ثبوت دیا ہے قابلِ تعریف تو ہے ہی قابلِ تحسین بھی ہے اور قابلِ مبارکباد بھی۔ آپ کا اداریہ تو خاص ہوتا ہی ہے اور پھر ایک بار اداریہ نے متاثر کیا۔ مضامین کے گوشے میں سارے مضامین اپنے آپ میں خوب ہیں اور استادانہ صلاحیت کے حامل بھی۔ کیوں نہ ہوں آپ جس عرق ریزی سے مضامین کا گوشہ سجاتے ہیں اس سے چاند اور تاروں کا فرق ہی نہیں رہتا۔ سارے مضامین درخشاں درخشاں نظر آتے ہیں۔ فکشن کے گوشے میں جناب نورالحسنین کا افسانہ ''پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا'' بہت پسند آیا۔ وہ میرے پسندیدہ افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ انہیں یہاں دیکھ کر دلی مسرت حاصل ہوئی۔ دوسرے افسانوں نے بھی اپنی چھاپ چھوڑے ہیں۔ گوشۂ منظومات میں معیاری غزلوں اور نظموں کا انتخاب بے حد مشکل ہے۔ انشائیہ اور طنز و مزاح میں جناب قیوم بدر اور ممتاز انور صاحب نے خود کو اپنے قلم سے منوایا ہے۔ اور زبانوں کے ادب میں آپ نے خاکسار کی اڑیا نظموں کا ترجمہ ،شامل کیا اس کے لئے تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔ جناب عظیم انصاری نے بنگلہ کہانی اور ہندی نظموں کے تراجم میں

دیانت داری سے کام لیا ہے۔لائق تحسین ہیں۔تبصرے کے گوشے میں آپ نے میرے دو تبصرے شامل کئے اس کے لئے آپکا مشکور و ممنون ہوں۔تبصرے کی روایت کو جس انداز میں آپ نے زندہ کیا ہے قابلِ تعریف ہے ایک ساتھ اتنے سارے تبصرے پڑھ کر اردو ادب میں تبصرے کی اہمیت کا اندازہ گزرتا ہے۔

صاف ستھری کتابت و طباعت کے ساتھ ساتھ خوبصورت تزئین و ترتیب،یقیناً آپ کی محنت کا ثمرہ ہے۔سارے قلمکاروں نے متاثر کیا۔تمام مشمولات ،اپنے افہام و تفہیم سے اپنی ادبی اہمیت و صلاحیت کو ثابت کرتے ہیں۔اتنی کڑی محنت آپکا حصہ ہے۔دعا گو ہوں کہ اللہ تبارک تعلیٰ اس رسالے کو نظر بد سے بچائے اور آپ کی محنت کو بھر پور صلہ سے نوازے۔آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی نصیب ہو۔ادبی کہکشاں کو سموئے ہوئے آپکا رسالہ،اردو ادب میں میل کا پتھر ثابت ہو۔اسی تمنا کے ساتھ.........

انور بھدرکی (بنگلور)

تحقیقی اور تخلیقی ادب کا ترجمان سہ ماہی "عالمی فلک" کا کتابی سلسلہ نمبر 6 بذریعہ ڈاک موصول ہوا. عمدہ کاغذ پر نفیس طباعت اور خوبصورت سرورق نے کتاب کو جاذب نظر بنا دیا ہے.اس کے مشمولات پابندء اشاعت اور ترتیب و تزئین پر یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں مدیر جناب احمد نثار اور معاون مدیر آفرین فاطمہ۔

احمد نثار کی تخلیقی صلاحیتوں کو میں نے ان کے کئی شعری مجموعوں میں محسوس کیا ہے اور اب محترم کی صحافتی قابلیت "عالمی فلک" کی صورت سیاپنا اعتراف کروا رہی ہے۔ابتدا زیب غوری کی مرصع حمد پاک سے ہوئی ہے۔بلاعنوان اداریئے میں مدیر نے جن امور پر غور کرنے کا اشارہ دیا ہے انھیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اردو اور اردو ماحول سے ان کے سوالات برجستہ ہیں۔"عصری مکالمے" کے عنوان کا سلسلہ امید ہے کہ کارآمد ثابت ہوگا۔مضامین کا حصہ خاصا معیاری ہے اور تمام مضامین ہی informative ہیں .افسانوں کا انتخاب خوب ہے،منظومات کا حصّہ بھی دلچسپ ہے،اور زبانوں کا ادب کالم کا سلسلہ بہترین کوشش ہے۔

"تبصرے" کے کالم میں جو تبصرے شامل کئے گئے ہیں وہ ادب کا مکمل حصہ ہیں.اور مبصرین نے معلومات فراہم کرنے کے انداز میں بے لاگ تبصرے کئے ہیں۔

مکتوبات میں اپنے اپنے نظریئے سے لوگوں نے اشارات دیئے ہیں۔کلی طور پر یہ ایک مکمل ادبی جریدہ ہے۔اردو کے فروغ کا ذریعہ ہے اس لئے حلقئے اردو کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اس حسین پیشکش کی سچی سرپرستی کی جائے۔

مختار احمد حسینی (گریڈیہہ)

حسین الحق کی زندگی کے چند یادگار لمحات